



اداره ترجمان القرآن لاہور

ابوالاعلیٰ

مکرم

حکمتِ تیلغ

حکمتِ تبلیغ

تفہیم القرآن اور دیگر نگارشات سید ابوالاعلیٰ
مودودیؒ سے اخذ کردہ اقتباسات پر مشتمل
مجموعہ مضامین

مرتبہ

سید اسعد گیلانی

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

ترتیب و تدوین زیر اہتمام - اسلامی اکادمی منصورہ - لاہور

نام کتاب:	_____	جملہ حقوق محفوظ ہیں
نگارشات:	_____	حکمت تبلیغ
مرتبہ:	_____	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ضخامت:	_____	سید اسعد گیلانیؒ
مطبع:	_____	۳۸۳ صفحات
ناشر:	_____	اے۔ این۔ اے پرنٹرز، لاہور
	_____	ادارہ ترجمان القرآن (پرائیوٹ) لمیٹڈ،
	_____	اردو بازار، لاہور۔

اشاعت:

طبع اول:

طبع دوم:

دسمبر ۱۹۹۵ء ۱۰۰۰

قیمت: - ۸۰ روپے

♦ دعوت دینے منزلت ہے تو حکمتِ تبلیغ تاج بیار منزلت ہے

فہرست مضامین

حرفِ اول

۱۱۳-۱۱۴

دعوتِ دین

- ۱۔ ابتدائیہ ۱۷
- ۲۔ انبیاء علیہم السلام کا مشن ۱۱
- ۳۔ اللہ اور رب کا مفہوم ۲۵
- ۴۔ راست دعویٰ دار ۲۷
- ۵۔ بالواسطہ دعویٰ دار ۲۹
- ۶۔ فتنہ کی اصل جڑ ۳۰
- ۷۔ انبیاء کا حقیقی اصلاحی کام ۲۱
- ۸۔ دعوتِ دین کی اہمیت ۲۵
- ۹۔ حق کی رفاقت ۲۵
- ۱۰۔ حق کی حفاظت ۳۶
- ۱۱۔ آزمائشِ حق ۲۶
- ۱۲۔ بندہ اور اللہ کی مدد ۳۷
- ۱۳۔ ترقی و درجات ۳۹

۴۱. ۱۴. دعوتِ حق اور اس کا مقدمہ
۴۲. ۱۵. تزکیہ، معنی و مفہوم
۴۳. ۱۶. دعوتِ حق، ۱۱۱، نصیحت
۴۵. ۱۷. حق کا مسافر
۴۶. ۱۸. حق کے منکر
۴۷. ۱۹. حق کی نصیحت
۴۸. ۲۰. دعوتِ حق کی کامیابی
۵۰. ۲۱. دعوتِ حق اور اللہ کی رفاقت
۵۳. ۲۲. آخری کامیابی، مومنین کا حق
۵۸. ۲۳. دعوتِ حق کے نازک مراحل
۶۱. ۲۴. حضرت موسیٰ کا خطاب
۶۱. ۲۵. صادق الایمان نوجوانوں کا جواب
۶۱. ۲۶. دعوتِ اسلامی کامیابی کی منزل تک
۶۵. ۲۷. اباب کی بجائے اللہ پر اعتماد
۶۶. ۲۸. اللہ کی غیبی امداد
۶۶. ۲۹. حق و باطل کی کشمکش
۶۸. ۳۰. دعوتِ حق اور آزمائش
۷۰. ۳۱. مسکماہ اخلاق کی پامالی
۷۶. ۳۲. مشکلات میں سکینت

آزمائش اور استقامت

- ۲۔ استقامت ۱۰۸
- ۳۔ آزمائشِ ہجرت ۱۱۳
- ۴۔ دعوتِ اسباق ۱۱۷
- ۵۔ اہل حق کا ایک تاریخی واقعہ ۱۱۸
- ۶۔ دعوتِ حق اور محبوبیتِ خلائق ۱۱۹
- ۷۔ باطل قومیں اور حق سے مقابلہ ۱۲۰
- ۸۔ باطل کا مقدر، پسپائی اور فنا ۱۲۲
- ۹۔ حق کے مقابل کفار کا کردار ۱۲۳
- ۱۰۔ مجرمین کی تباہی کا الہی اصول ۱۲۳
- ۱۱۔ گمراہ انسانی معاشرے اور حکمتِ ربانی ۱۲۴
- ۱۲۔ باطل مٹ کر رہے گا ۱۲۵
- ۱۳۔ خدا کا قطعی فیصلہ ۱۲۶
- ۱۴۔ سنتِ التذکیا ہے! ۱۲۷
- ۱۵۔ نصرتِ الہی کی آمد کا اصول ۱۲۷
- ۱۶۔ دعوتِ حق کا ازلک مقام ۱۲۸
- ۱۷۔ اہل حق اور استقامت ۱۲۹
- ۱۸۔ باطل کے منصوبے اور اللہ کی سنت ۱۲۹
- ۱۹۔ راہِ حق کے راستے کی رکاوٹیں ۱۳۴
- ۲۰۔ دعوتِ حق میں صبر کی اہمیت ۱۳۵
- ۲۱۔ مخالفینِ دعوتِ حق کا چھچھورا پن ۱۳۶
- ۲۲۔ دعوتِ حق، صبر و شکر کا راستہ ۱۳۷

۱۳۸. ۲۳. دعوتِ حق اور سکونِ قلب
۱۳۹. ۲۴. راہِ حق میں دل شکستگی گناہ ہے
۱۴۰. ۲۵. مجاہدین کی مہمت پر بے صبری نامناسب
۱۴۱. ۲۶. فیصلے کی گھڑی کا انتظار
۱۴۲. ۲۷. باطل کا غلبہ، غرضی دور
۱۴۳. ۲۸. حالات کی ناگواری پر صبر
۱۴۴. ۲۹. صبر کی اہمیت و ضرورت
۱۴۵. ۳۰. دعوتِ حق، دائمی اور ہمہ گیر صبر
۱۴۶. ۳۱. نعم المولیٰ ونعم النصیر
۱۴۷. ۳۲. دعوتِ حق، مفاہیم غلط
۱۴۸. ۳۳. راضی برضا رہیں
۱۴۹. ۳۴. دعوتِ حق میں سمجھ بوجھ کی اہمیت
۱۵۰. ۳۵. دعوتِ حق میں نماز کی اہمیت
۱۵۱. ۳۶. نماز، جماعت کی اہمیت
۱۵۲. ۳۷. حق سے مضبوط پیوستگی
۱۵۳. ۳۸. دعوتِ حق، مہارت و مصالحت سے بے نیاز
۱۵۴. ۳۹. عزیمت کا تاریخی پس منظر
۱۵۵. ۴۰. مومن کا کفر سے اعلانِ برأت
۱۵۶. ۴۱. بددلی، سلامتی کا راستہ
۱۵۷. ۴۲. ہجرت، ترقی و درجات کا ذریعہ

حکمتِ تبلیغ

- ۱۔ ابتدائیہ ۱۷۱
- ۲۔ اسلام ایک تحریک ۱۸۱
- ۳۔ واحد راستہ، اُسوۂ حسنہ ۱۸۱
- ۴۔ آغاز کار، دعوتِ توحید ۱۸۲
- ۵۔ اہم ترین مسئلہ توحید ۱۸۲
- ۶۔ بحرِ توحید، ہر مسئلے سے صرف نظر ۱۸۳
- ۷۔ توحید، تصوراتِ حیات ۱۸۵
- ۸۔ توحیدی کشمکش ۱۸۵
- ۹۔ آزمائشِ برائے تربیتِ کردار ۱۸۶
- ۱۰۔ ابتلاء، حق شناسی کا ذریعہ ۱۸۷
- ۱۱۔ قابلِ تحریک کا اختیار ۱۸۸
- ۱۲۔ تصورِ مساوات ۱۸۹
- ۱۳۔ فلاحِ انسانیت کی پکار ۱۸۹
- ۱۴۔ مسلکِ دیانتداری ۱۸۹
- ۱۵۔ اسلامی طرزِ حیات کا مظاہرہ ۱۹۰
- ۱۶۔ غیرِ خوئی انقلاب ۱۹۱
- ۱۷۔ نظریاتی انسان کی تشکیل ۱۹۱
- ۱۸۔ نظریاتی تبلیغی انقلاب ۱۹۳
- ۱۹۔ اسلامی نظامِ ایک طبعی واقعہ ۱۹۴

- ۱۹۵ ۲۰. طریق تبلیغ
- ۱۹۶ ۲۱. ہماری تبلیغی پالیسی
- ۲۰۲ ۲۲. ناقص علم و عمل کا فتنہ
- ۲۰۴ ۲۳. ہزاری کا مقابلہ، جلائی سے
- ۲۰۴ ۲۴. بدکلامی کا مقابلہ، خوش کلامی سے
- ۲۰۵ ۲۵. بدی کا نیکی سے ازالہ
- ۲۰۶ ۲۶. تبلیغ اور صبر لازم و ملزوم
- ۲۰۸ ۲۷. نریغ شیطانی سے پناہ کا اہتمام
- ۲۱۱ ۲۸. حکمت تبلیغ کے چار نکات
- ۲۱۲ ۲۹. تحمل، بردباری اور عالی ظرفی
- ۲۱۳ ۳۰. فلسفہ طراری کی بجائے راست گوئی
- ۲۱۴ ۳۱. جاموں سے اجتناب
- ۲۱۴ ۳۲. اشتعال میں صبر کا اہتمام
- ۲۱۵ ۳۳. دعوت میں استقامت
- ۲۱۶ ۳۴. حکمت تبلیغ اور حسن خلق
- ۲۱۷ ۳۵. ذکرِ خدا کا اہتمام
- ۲۱۷ ۳۶. حکمت اور عمدہ نصیحت
- ۲۱۸ ۳۷. طریق بحث کی عمدگی اور خوبی
- ۲۱۹ ۳۸. بحث مباحثہ میں جذباتیت سے پرہیز
- ۲۱۹ ۳۹. غصہ اور شیطان کی اکساہٹ سے اجتناب
- ۲۲۰ ۴۰. غلط زبان سے احتیاط

- ۲۲۰۔ فتویٰ بازی سے پرہیز
 ۲۲۱۔ تضحیک پر علیحدگی گردیہ
 ۲۲۲۔ حکمت کی عمدہ مثال
 ۲۲۳۔ حکمتِ تبلیغ کا ایک اعلیٰ نمونہ
 ۲۲۵۔ گفتگو میں ہمدردی کا اہتمام
 ۲۳۰۔ باطل کا انداز استدلال
 ۲۳۱۔ فہم دین کا حکیمانہ طریقہ
 ۲۳۲۔ غور و فکر کی دعوت
 ۲۳۵۔ غافل قوم کو چونکانے کی تدبیر
 ۲۳۶۔ اہل کتاب کے سامنے دعوتِ دین
 ۲۳۸۔ اشتغال سے شدید پرہیز
 ۲۵۰۔ اصولوں میں ثابت قدمی
 ۲۵۱۔ مواقعِ تبلیغ سے استفادہ
 ۲۵۲۔ حکمتِ تبلیغ کی ایک عمدہ مثال
 ۲۵۳۔ دعوتِ حق، باوقار انداز میں
 ۲۵۸۔ دعوتِ حق کا تسلسل
 ۲۵۹۔ قبا، اعراضِ لوگ
 ۲۶۳۔ قبولیتِ حق اور خدا ترس انسان
 ۲۶۱۔ قبولیتِ حق سے عاری لوگ
 ۲۶۲۔ ہٹ دھرم لوگوں سے اجتناب
 ۲۶۸۔ دعوتِ براہِ راست دی جائے
 ۲۷۰۔ مزاحمت پر تنگدلی سے اجتناب

۲۷۴. اصلاح سے بالوری سے اجتناب
 ۲۷۶. غیر اسلامی طریقوں کی ممانعت
 ۲۸۰. داعی حق پر عصبيت سے پاک
 ۲۸۱. ضدی مخالف طبع سے عدم التفات
 ۲۸۲. تبلیغ دین اور مہملہ
 ۲۸۶. اہل کتاب اور عقیدہ توحید
 ۲۸۶. تبلیغ میں قول بیغ کی اہمیت
 ۲۸۷. دعوت دین بذریعہ مکاتیب
 ۲۸۷. تبلیغ فریضہ منصفی ہے
 ۲۸۷. بحث میں اشتعال سے اجتناب
 ۲۸۸. فروعات سے پہلے اصول پر زور
 ۲۹۱. ہر کس کے حریف نہیں
 ۲۹۲. مخالفت میں طرز عمل

داعی حق اور اس کے اوصاف

۱۹۵. ۱۔ ابتدائیہ
 ۲۱۹. ۲۔ داعی حق کے اوصاف
 ۲۲۲. ۳۔ دعوت اسلامی کے کام کے لئے اوصاف
 ۲۲۲. ۴۔ شخصی اوصاف
 ۲۲۹. ۵۔ جماعتی اوصاف
 ۳۳۱. ۶۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے نزدیک اوصاف
 ۲۳۵. ۷۔ اہل باطل اہل حق کو ہٹکانہ پائیں
 ۳۳۸. ۸۔ اقربا کو اولیٰں دعوت

- ۹۔ مہانت سے پرہیز ۳۴۰
- ۱۰۔ دعوتِ حق کو بے جھجک اعلان ۳۴۲
- ۱۱۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے اجتناب ۳۴۴
- ۱۲۔ جاہلی قوانین کی پیروی سے اجتناب ۳۴۵
- ۱۳۔ دنیا پرستوں کی شان و شوکت سے بے نیاز ۳۴۶
- ۱۴۔ قدر و قیمت کے مستحق صرف طالبینِ حق ۳۴۷
- ۱۵۔ معاشرتی مرتبہ نہیں بلکہ قبولِ حق کا جذبہ ۳۴۸
- ۱۶۔ پیروی کے ساتھ غور و فکر ۳۵۲
- ۱۷۔ مخالفت سے بے خوف ۳۵۳
- ۱۸۔ مخالفین کی بے ہودگیوں سے بے نیاز ۳۵۴
- ۱۹۔ نیکی سے برائی کا انزالہ ۳۵۵
- ۲۰۔ مخالفین کے بارے میں رویہ ۳۵۵
- ۲۱۔ داعیِ حق کی قوت کے ذرائع ۳۵۶
- ۲۲۔ تلاوتِ قرآن کا اہتمام ۳۵۶
- ۲۳۔ اقامتِ صلوٰۃ ۳۵۶
- ۲۴۔ اللہ کا ذکر ۳۶۲
- ۲۵۔ عبادتِ ذریعہٴ قوت ۳۶۳
- ۲۶۔ قوت کا ذریعہ، ذکر اللہ ۳۶۴
- ۲۷۔ داعیِ حق کا جہادِ کبیر ۳۶۶
- ۲۸۔ مفادِ دنیوی سے بے نیازی ۳۶۷
- ۲۹۔ داعی کے منصب کی ذمہ داریاں ۳۶۷

۶۳. اصلاح سے مایوسی سے اجتناب ۲۷۴
 ۶۴. غیر اسلامی طریقوں کی ممانعت ۲۷۶
 ۶۵. داعی حق پر عصبيت سے پاک ۲۸۰
 ۶۶. شدی مخاطب سے عدم التفات ۲۸۱
 ۶۷. تبلیغ دین اور مہملہ ۲۸۳
 ۶۸. اہل کتاب اور عقیدہ توحید ۲۸۶
 ۶۹. تبلیغ میں قولِ بیغ کی اہمیت ۲۸۶
 ۷۰. دعوت دین بذریعہ مکاتیب ۲۸۷
 ۷۱. تبلیغ فریضہ منصبی ہے ۲۸۷
 ۷۲. کثرت میں اشتغال سے اجتناب ۲۸۷
 ۷۳. فروعات سے پہلے اصول پر زور ۲۸۸
 ۷۴. ہم کس کے حریف نہیں ۲۹۱
 ۷۵. مخالفت میں طرزِ عمل ۲۹۲

داعی حق اور اُس کے اوصاف

- ۱۔ ابتدائیہ ۲۹۵
 ۲۔ داعی حق کے اوصاف ۳۱۸
 ۳۔ دعوتِ اسلامی کے کام کے لئے اوصاف ۳۲۴
 ۴۔ شخصی اوصاف ۳۲۴
 ۵۔ جماعتی اوصاف ۳۲۹
 ۶۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے زوری اوصاف ۳۳۱
 ۷۔ اہل باطل اہل حق کو ہلکانہ پائیں ۳۳۰
 ۸۔ اقربا کو آرائیں دعوت ۳۳۸

- ۹۔ مہانت سے پرہیز ۳۲۰
- ۱۰۔ دعوتِ حق کا بے جھجک اعلان ۳۱۲
- ۱۱۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے اجتناب ۳۲۴
- ۱۲۔ جاہلی قوانین کی پیروی سے اجتناب ۳۲۵
- ۱۳۔ دنیا پرستوں کی شان و شوکت سے بے نیاز ۳۲۶
- ۱۴۔ قدر و قیمت کے مستحق صرف طالبینِ حق ۳۱۶
- ۱۵۔ مداخلتِ مرتبہ نہیں بلکہ قبولِ حق کا جذبہ ۳۲۸
- ۱۶۔ پیروی کے ساتھ غور و فکر ۳۵۲
- ۱۷۔ مخالفت سے بے خوف ۳۵۳
- ۱۸۔ مخالفین کی بے ہودگیوں سے بے نیاز ۳۵۴
- ۱۹۔ نیکی سے برائی کا ازالہ ۳۵۵
- ۲۰۔ مخالفین کے بارے میں رویہ ۳۵۵
- ۲۱۔ داعیِ حق کی قوت کے ذرائع ۳۵۶
- ۲۲۔ تلاوتِ قرآن کا اہتمام ۳۵۶
- ۲۳۔ اقامتِ صلوٰۃ ۳۵۶
- ۲۴۔ اللہ کا ذکر ۳۶۲
- ۲۵۔ عبادتِ ذریعہ قوت ۳۶۳
- ۲۶۔ قوت کا ذریعہ ذکر اللہ ۳۶۴
- ۲۷۔ داعیِ حق کا جہادِ کبیر ۳۶۶
- ۲۸۔ مفادِ دنیوی سے بے نیازی ۳۶۷
- ۲۹۔ داعی کے منصب کی ذمہ داریاں ۳۶۷

۶۳. اصلاح سے مایوسی سے اجتناب ۲۷۴
۶۴. غیر اسلامی طریقوں کی ممانعت ۲۷۶
۶۵. داعی حق ہر عصبیت سے پاک ۲۸۰
۶۶. شہری مخاطب سے عدم التفات ۲۸۱
۶۷. تبلیغ دین اور مہملہ ۲۸۴
۶۸. اہل کتاب اور عقیدہ توحید ۲۸۶
۶۹. تبلیغ میں قول تبلیغ کی اہمیت ۲۸۹
۷۰. دعوت دین بذریعہ مکاتیب ۲۹۷
۷۱. تبلیغ فریضہ منصبی ہے ۲۹۷
۷۲. بحث میں اشتغال سے اجتناب ۲۹۷
۷۳. فروعات سے پہلے اصول پر زور ۲۸۸
۷۴. ہم کس کے حریف نہیں ۲۹۱
۷۵. مخالفت میں طرز عمل ۲۹۲

داعی حق اور اس کے اوصاف

- ۱۔ ابتدائیہ ۲۹۵
- ۲۔ داعی حق کے اوصاف ۳۱۸
- ۳۔ دعوت اسلامی کے کام کے لئے اوصاف ۳۲۴
- ۴۔ شخصی اوصاف ۳۲۴
- ۵۔ جماعتی اوصاف ۳۲۹
- ۶۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے نزدیکی اوصاف ۳۳۱
- ۷۔ اہل باطل اہل حق کو ہلکانہ پائیں ۳۳۷
- ۸۔ اقربا کو اولیٰ دعوت ۳۳۸

- ۹۔ مہانت سے پرہیز ۳۴۰
- ۱۰۔ دعوتِ حق کو بے جھجک اعلان ۳۴۱
- ۱۱۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے اجتناب ۳۴۲
- ۱۲۔ جاہلی قوانین کی پیروی سے جتناب ۳۴۵
- ۱۳۔ دنیا پرستوں کی شان و شوکت سے بے نیاز ۳۴۶
- ۱۴۔ قدر و قیمت کے مستحق صرف طالبینِ حق ۳۴۷
- ۱۵۔ معاشرتی مرتبہ نہیں بلکہ قبولِ حق کا جذبہ ۳۴۸
- ۱۶۔ پیروی کے ساتھ غور و فکر ۳۵۲
- ۱۷۔ مخالفت سے بے خوف ۳۵۳
- ۱۸۔ مخالفین کی بے ہودگیوں سے بے نیاز ۳۵۴
- ۱۹۔ نیکی سے برائی کا ازالہ ۳۵۵
- ۲۰۔ مخالفین کے بارے میں رویہ ۳۵۵
- ۲۱۔ داعیِ حق کی قوت کے ذرائع ۳۵۶
- ۲۲۔ تلاوتِ قرآن کا اہتمام ۳۵۶
- ۲۳۔ اقامتِ صلوٰۃ ۳۵۶
- ۲۴۔ اللہ کا ذکر ۳۶۲
- ۲۵۔ عبادتِ ذریعہٴ قوت ۳۶۳
- ۲۶۔ قوت کا ذریعہ، ذکر اللہ ۳۶۴
- ۲۷۔ داعیِ حق کا جہادِ کبیر ۳۶۶
- ۲۸۔ مفادِ دنیوی سے بے نیازی ۳۶۷
- ۲۹۔ داعی کے منصب کی ذمہ داریاں ۳۶۷

- ۳۶۸ ۳۰۔ وسوسہ اندازی سے اللہ کی پناہ
- ۳۶۹ ۳۱۔ وسوسہ عمل شرکہ نقطہ آغاز
- ۳۷۱ ۳۲۔ شیطان نفس کے اغوا سے احتیاط
- ۳۷۱ ۳۳۔ اہل حق کی خستہ آزمائشیں
- ۳۷۶ ۳۴۔ کامیابیٰ خیر نہیں، شہرہ کا مقام



صرفِ اول

تبلیغ کا رابعدیہ ہے اور انسانی نفسیات اور فہم و شعور سے اس کا گہرا تعلق ہے انسانی فہم و شعور میں ایک بات کس پیرائے میں پیش کر کے بٹھائی جائے اور کس نفسیاتی طرزِ عمل کا لحاظ رکھا جائے تبلیغ کا یہی موضوع اور فن ہے۔ تبلیغ کا کام انسان سازی کا کام ہے اور اس کام میں اس کے علم اور حکمت و دلو کا استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو جنہیں اپنے بندگان کی اصلاح کے لئے مامور کیا انہیں حکمتِ تبلیغ کی کیسی کیسی عمدہ باتیں بتائیں اور کس کس نفسیاتی طریقے کا اہتمام و التزام کرنے کی تلقین کی، قرآن میں اس کی بے شمار آیات موجود ہیں اور رسول اکرمؐ کا اُسوۂ مبارک تو حکمتِ تبلیغ کا بہترین مثالی نمونہ ہے۔

ہم نے اس کتاب میں قرآن میں بیان کردہ ان طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بنیاد تفسیرِ القرآن کو بنایا ہے البتہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے اثر پر ہیں سے بھی بعض بعض اقتباسات اپنی تبلیغی اہمیت کے پیش نظر اخذ کئے گئے ہیں۔

کتاب کے چار حصے ہیں اور چاروں حصوں کے مضامین کا تعارف کرانے کے لئے ایک ایک ابتدائی تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ابتدائی اگرچہ طویل بھی ہیں اور مؤلف کے تحریر کردہ ہونے کے سبب کتاب کے اقتباسات میں بظاہر ایک بے اضافہ بھی ہیں، لیکن مضامین کی مزاحمت سے ان کی حیثیت تعارفِ مضمون کی بن گئی ہے اور یہ ابتدائی ہر مضمون کی خصوصیت کو اجاگر کرنے میں ایک قابلِ لحاظ خدمت، انجام دیتے ہیں۔

میں نے یہ کتاب مرتب کرنے کا نقشہ مولانا مودودی مرحوم کی زندگی میں ہی بنایا تھا اور انہوں نے اس خیال کو پسند کیا تھا کہ مبلغین کے لئے تفسیرِ القرآن کی مدرسے

حسنت تبلیغ پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی جائے۔ چنانچہ میں نے اس کام کا آغاز ان کی زندگی میں ہی کر دیا تھا۔ پھر یہ وہم بدرجہ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور بالآخر اس نے ایک کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

اس کتاب کی ترتیب میں سب سے زیادہ حصہ میرے محترم اور بزرگ دوست مولانا محمد عبداللہ غلوی، مہتمم مدرسہ قائم العلوم سرگودھا کا ہے۔ انہوں نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے خود بھی اور اپنے مدرسہ کے مہتممی طلبہ سے بھی ہم القرآن میں سے ایسی آیات چھانٹنے اور ان کی تشریحات نقل کرنے کا کٹھن کام سرانجام دیا۔ اگر وہ یہ مدد نہ کرتے تو اس کتاب کی تکمیل کا ابھی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس خدمت کا بہترین اجر آخرت میں عطا فرمائے اور وہ رکناں تحریک اسلامی کی تبلیغی سرگرمیوں کے اجر میں ان کا حصہ بھی شمار کیا جائے۔



یہ کتاب اپنی ترتیب کے ساتھ ہی کتابت کے مراحل میں داخل ہو گئی تھی اور جن خوشنویس حضرات نے اس اہم کتاب کی صورت بگاڑنے اور کتابت برباد کرنے کی خدمت سرانجام دی ہے اللہ تعالیٰ انہیں نیکی کی توفیق دے فی الحقیقت کاتب حضرات نے اس کتاب کو خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور جس قدر زور داری سے یہ کتاب تباہ کی گئی ہے اس سے بڑھ کر غیر ذمہ داری سے انہوں نے اس کی کتابت کی ہے۔ اگر کتابت کو دوبارہ کرانے کی سکت مالی اور اس کام کو التوا میں ڈالے جانے کی مزید گنجائش ہوتی تو میں یہ کام دوبارہ کر گزرتا۔ البتہ آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ اس کی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو کارکنان تحریک اسلامی اور تبلیغ اسلام کے لئے قابل قدر کائیڈ بک بنائے اور انہیں اس سے بہترین استفادے کی توفیق دے۔

اسعد گیلانی

منصورہ - اکتوبر ۱۹۸۷ء

دعوتِ دین

دعوتِ دین

ابتدائیہ

اولیٰ روز سے انسان کو اجتماعی زندگی کے بنیادی اصول اللہ کے فرستادہ قائدینِ انسانیت، انبیاء کرام کے ذریعے سکھائے جاتے رہے ہیں اور وہی انسانیت کے قافلے کے راست باز اور راست رو قائد تھے۔ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً انہیں اس کام پر مامور کرتا رہا تاکہ وہ نافرمانی انسانیت کو راہِ راست سے بچھٹنے نہ دیں، انبیاء کرام کا سکھایا ہوا راہِ راست ہی صراطِ مستقیم اور دینِ حق ہوتا ہے۔ اس سے ہٹا ہوا راستہ ہی باطل اور گمراہی کا راستہ ہوتا ہے۔ انسان کو دنیا میں نبائی سے آخرت میں نسران سے دوچار

انبیاء کرام اپنے اپنے معاشرہ میں ہمیشہ اپنا پیغام ایک عمومی دعوت اور تحریک کی صورت میں لے کر اٹھتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ معاشرے میں ہدایت اور راستی کی روچھلنے کی کوشش کی۔ انبیاء کی پرپاک کردہ تحریکیں ہر دور میں اسلامی تحریکیں تھیں اور وہ بھی اسلامی تحریکیں ہی تھیں جو انہیں خطوط پر انہیں مقاصد کے لئے انبیاء کے پیروکاروں کے ذریعے برپا کی جاتی رہی ہیں تاکہ انسانیت کو اس کے خالق کی طرف رہنمائی کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ انبیاء کرام کے مقاصد و مقاصد سے ہٹ کر انسانی معاشرے میں جو تحریکیں اٹھتی ہیں وہ باطل مقاصد کے لئے ہوتی ہیں۔

ابتدائیہ از اسید اسعد گیلانی

ان سے انسانیت کو جتنی طور پر بہت نقصان پہنچتا ہے، انبیاء کو کام اور ان کے پیروکاروں کو اس کی دعوت پر دو درجے کیساں رہی ہے۔ یہ دعوت تین نکات پر مشتمل رہی ہے۔
۱۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عام کیا جائے اور اس کے حکم سے سرِ تاجی نہ کی جائے وہی ساری کائنات کا حقیقی فرمان رہا ہے۔

۲۔ اپنی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے اور ان کے احکام کے خلاف جو کچھ بھی فرد کی انفرادی زندگی یا معاشرے کی اجتماعی زندگی میں پایا جائے اسے نکال کر زندگیوں کو خالص اطاعت الہی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔
۳۔ انسانوں کی زندگی میں جو ہستی بھی خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم اپنا اقتدار اور اختیار مستطع کرنا چاہے اسے بزور اس منصب سے ہٹا دیا جائے۔ اور اقتدار و اختیار صرف خدا کے نیک اور مطیع فرمان بندوں کے حوالے کیا جائے۔

ہر درجہ میں اسلامی تحریکوں کی یہی دعوت رہی ہے جسے دعوتِ اسلامی کہا جاتا ہے اسی دعوت میں توانائی اور تسخیرِ عالم کی قوت ہے اور اسی کا سکہ رواں کرنے کے لیے نبیاء آتے ہیں یہی دعوت مومن کا مقصدِ زیست ہے۔

مسلم معاشرہ اصولی طور پر دنیا کا رہنما معاشرہ ہے۔ اسے اسلام کو جو انسانیت کی بہتری کے لئے خالق کائنات کی طرف سے آخری پیغامِ ہدایت ہے، عملی صورت میں دینا کے سامنے پیش کر کے اس کی رحمت و برکت کا نمونہ انسانیت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور اسلام کی سب سے بڑی تبلیغ یہی ہے کہ اس کا عملی مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن دنیا کی یہ قسمتی اور مسکانون کی دشمنی قسمت سے اسلام دنیا کے سامنے ایک بارہ اپنی علیہ الشان داخلِ قرن و برکت کا مظاہرہ کر چکے۔ وجودِ اب دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور مسلمانوں کا عمل دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کی بجائے دنیا کو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو وہ سب سے پہلے بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے، اس کے نشاندار اصول اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں اور وہ ان اصولوں کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان بھی رہتی ہے لیکن ان پر عمل میرا ہونے کی سکت اس کے اجتماعی عمل میں سے خارج ہو جاتی ہے

یہ بے عملی اور بے حتی اس قوم کے اندر ایسے تضادات پیدا کر دیتی ہے جن تضادات سے ہم رابرا ہونا اس کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔

معاشرے کے اسی عملی تضاد کے نتیجے میں دعوئے توحید پرستی کے ساتھ بہت سی دوسری پرستشیں بھی جمع ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کے باوجود مسلمان پھر بھی فرزندِ توحید ہی رہتا ہے، ابتداء رسالت کے دعوئے کے ساتھ معروف کے تقاضوں کو توڑتی ہوئی بہت سی دوسری عقیدتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں، لیکن عشقِ رسولؐ پھر بھی اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، قرآن کے خدا کی آخری کتاب ہونے پر ایمان کے ساتھ ساتھ غیر الہی قوانین کی پیروی بھی بلا کراہت ہوتی رہتی ہے لیکن حقانیتِ قرآن کے دعوئے میں پھر بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ دراصل انسانی اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کا عمل ہوتا ہے، ایسی معاشرتی اور اخلاقی فضا میں قول اور فعل کا تضاد انسانی سیرت و کردار کو ناقابلِ انکسار بنا دیتا ہے، پھر کسی محبت، رفاقت، عہد و پیمان اور ربط و تعلق پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ یہ دُلق باقی رہتا ہے کہ جو شخص آج بڑی بلند آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لئے اپنے خلوص کا دعویٰ کر رہا ہے کل وہ اس مقصد کی راہ نہیں مارے گا، یہ زوالِ کردار کی ایسی المناک صورت حال ہوتی ہے جہاں کسی مصلح کے لئے اصلاح کا کام بہت کٹھن ہو جاتا ہے، قول و فعل کی مطابقت ہی تربیت و کردار سازی کا سب سے بڑا موضوع ہے، یہ چیز اگر پیدا ہو جائے تو زندگی کے بہت سے میدان بے معرکہ فتح کیے جاسکتے ہیں۔

تضادِ فکر و عمل کی یہ ساری فضا زوال و انحطاط کے عمل سے بنتی ہے اور اس کی موجودگی میں اعلیٰ مقاصد کے لئے کام کرنے والے ادارے بھی اپنا اثر کھو دیتے ہیں، جب انقلابی نعرے بے جان الفاظ بن جائیں اور انقلابی پروگرام و نعرہ کی رسم سے زیادہ وزن نہ رکھیں تو ایسے ہی حالات ہوتے ہیں، اب کسی معاشرے میں اسلامی دعوت کی تجدید ناگزیر ہو جاتی ہے۔

کسی نظامِ زندگی کو اپنانے کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اسے غائب کرنے کے لئے

ایک تحریک اٹھائی جائے اور وہ تحریک اس کے غلبے تک مسلسل اور پیہم حرکت میں رہے، وہ اپنے دامن میں افراد کو متنوع، اعلیٰ اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ سمیٹتی رہے، ان صلاحیتوں کو مطلوبہ نظام کے غلبے کے لئے استعمال کرتی رہے، منزل مقصود کے کلی حصول اور اس کے بقاء و تحفظ کے لئے انقلابی آئین و بھی نہ پڑنے دے، نئے افراد کا آنا کم ہو، نہ پرانے لوگوں میں غفلت و جمود در آئے، اس لئے کہ تحریک کے لئے نوبہ نو پروگرام بنانا، اس کا آگے ہی آگے پیش قدمی کرنا، اس میں نئے آنے والوں کی مناسب تربیت کر کے انہیں اخلاقی اور علمی سطح پر تحریک کے معیار کے مطابق بنانا اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لینا انتہائی ناگزیر عمل ہے، اگر یہ کام ہو رہا ہو اور مسلسل ہوتا رہے تو تحریک نہ صرف اس نظام کے غالب آنے تک مسلسل فعال، متحرک اور جاندار ہوتی رہتی ہے بلکہ اس نظام کے غالب ہونے کے بعد بھی اس نظام کو اس کی اصل صورت میں لانے، اس کی مخالفت قوتوں کو سرنگوں کرنے اور اس نظام کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کو رفع کرنے کا اہتمام جاری رہتا ہے جس سے ایک پائیدار نظام وجود میں آتا ہے۔

ہر داعی ایک مقصد لے کر اٹھتا ہے جو اپنے اندر گونا گوں اجتماعی تقاضے رکھتا ہے داعی کا خطاب پختہ و درختوں اور دیوانوں سے نہیں ہوتا جو سمجھ سکتے ہیں اور نہ حرکت کر سکتے ہیں بلکہ اس کا خطاب انسانوں ہی سے ہوتا ہے، خدا نے جنہیں فہم کے لئے دماغ، تاثیر کے لئے قلب اور حرکت و عمل کے لئے ہاتھ پاؤں دیے ہوتے ہیں، جن کی اس انقلابی تحریک کے ساتھ موافقت سے تعاون اور مخالفت سے مزاحمت ظہور میں آتی ہے۔ جس طرح ہر زندگی کا پوشیدہ تقاضا موت ہے اور ہر موت کا پوشیدہ تقاضا قیامت ہے، اسی طرح ہر دعوت کا پوشیدہ تقاضا تعاون و رفاقت ہوتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ تعاون کے ساتھ ہی مخالفت اور مزاحمت بھی اسے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ جن لوگوں کو داعی مخاطب کرتا ہے، وہ دعوت کا پیغام سن کر بغیر جانبداری نہیں رہ سکتے، انہیں داعی کی طرف یا تو دست تعاون بڑھانا پڑتا ہے

یا دستِ عداوت، اور یوں دعوتِ دوکشمکش میں داخل ہو جاتی ہے۔

دعوت کی حیثیت ایک ایسی مشین کی سی ہوتی ہے جو افادۂ عام کی خاطر شارسۂ عام پر نصب کی جا رہی ہو، واعلیٰ کا کام یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اس بات پر مطمئن کرے کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اس مشین کو برسرِ عام نصب کیا جائے، وہ اس کے فوائد گن کر بتائے، اس کے نصب کئے جانے کے خلاف جتنے ممکن اعتراضات ہوں ان کو رفع کرے، اس جگہ سے جو پرانی نعیمہ منہدم کرنا مقصود ہو اس کے انہدام کی اشد ضرورت اور اہمیت واضح کرے اور پرانی عمارت کی موجودگی کے نقصانات گناٹے بچھ ہر شخص کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کرے کہ خلقِ خدا کا فائدہ اسی میں ہے کہ پرانی عمارت ہٹا کر وہاں نئی مشین نصب کر دی جائے، دعوت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی، اور خلقِ خدا تک دعوت پہنچانے کے فطری کام سے پہلو ہتی کر کے کوئی تحریک انحطاط اور جمود سے نہیں بچ سکتی، جمود کی اس کیفیت کو توڑنے والی قوت بھی صرف دعوت ہی ہوتی ہے جس سے تحریک کی گاڑی متحرک رہتی ہے، اس لئے دعوتِ دین ہی حقیقی قوت اور توانائی کا سرچشمہ ہے، اور واعلیٰ کا کام یہ ہوتا ہے کہ دعوت کے لئے کو کبھی ٹھٹھک نہ پڑنے دے، دعوتِ دین ان مومن کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرتے رہنا مومن کے ایمان کی سلامتی کی ضمانت ہے۔

دعوتِ دین

اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقے کے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اور اور سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں۔ بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے، اس کے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قواعد اور ضابطے مقرر کئے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اولیہ ہی سے ماخوذ ہے، ان اصولِ اولیہ سے ہر رمی اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور پھولوں سے تنہا، اور تنہا سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پاسکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق دو باتیں قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن ہی نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کا یہی مشن تھا، دوسری یہ کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء بھی دنیا میں آئے ہیں ان

کی آمد کا مقصد و میدان خدا کے واحد کی خدائی منوانا اور صرف اسی ایک کی عبادت کرنا تھا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لئے بظاہر یہ دونوں باتیں بالکل پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں، ہر مسلمان ان کو سن کر کہے گا کہ یہ معلوم و معروف باتیں ہیں جنہیں ایک دیہاتی مسلمان بھی جانتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں، سب کچھ اسی پردہ کے پیچھے چھپا ہوا ہے، تجسس کی نگاہ ڈال کر ابھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا؟ صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مَلِكُكُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَيْرُہٗ کا اعلان کیا اور ساری طاقوتیں جھار کا کاٹنا بن کر اس کو چٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی، جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے، کہ مسجد میں خدائے واحد کے سامنے سجدہ کرو اور پھر باہر نکل کر حکومت وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی غیر منظم و فساداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا۔

آئیے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا دنیا کی دوسری طاقتوں سے اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں کثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے، ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے، کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُلْ لِّمَنْ اَلَارْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُولُوْنَ لِلّٰہِ ط
 قُلْ اَخْلَقْتَنّٰہُ ۝ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ
 سَيَقُولُوْنَ لِلّٰہِ ط قُلْ اَخْلَقْتَنّٰہُ ۝ قُلْ مَنْ اَبَدَ ۝ مَلٰٓئِكُوتِ كُلِّ شَیْءٍ

مے ترجمہ اس کے سوا کوئی تمہارا اللہ نہیں والا

وَهُوَ يَجِيرُ وَلَا يُجَادُّ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قَاتِلُ
خَاتِي تَعْرُونَ ۝ (المؤمنون - ۸۴ تا ۸۹)

ترجمہ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کا ہے۔ کہو، پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو، ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جلتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ، کہو، پھر تم کس دھوکے میں والے ہو گئے ہو؟

وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
لَيَقُولَنَّ اللّٰهُ خَاتِي يُوْخِكُوْنَ ۝ (غالبوت - ۶۱)
اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تالیع فرمان بنا رکھا ہے، وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں۔

وَلَوْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْبَاهِ بِهٖ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ
مَوْتِهَا لَيَقُولَنَّ اللّٰهُ ۝ (ملکوت : ۶۳)
اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔
وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولَنَّ اللّٰهُ خَاتِي يُوْخِكُوْنَ ۝
(الزخرف - ۸۷)

”اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے، وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟“

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے اور مالکِ ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا، لوگ ان باتوں کو خود

ہی ملتے تھے، لہذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کی آمد کس لئے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟۔

قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے، جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور اللہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو، مگر دنیا اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہ تھی۔

آئیے ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؟ اللہ کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو اللہ اور رب مانو۔ مگر دنیا کیوں اس بات پر لڑنے لگتی ہو جاتی تھی؟

اللہ اور رب کا مفہوم

اللہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف کیجئے گا معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں، معبود کا مادہ عباد ہے، عباد بندے اور غلام کو کہتے ہیں، عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراپر عبادت ہے، خدمت کے لئے کھڑا ہونا، احترام میں ماتھے باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، جذبہ وفاداری سے سرشار ہونا، فرمان برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اسے پیش کر دینا، اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر پڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سرتک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

اور ”رب“ کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اہلی معنی پرورش کرنے والے

کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرمان برداری کی جاتی ہے، لہذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے، چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں، آدمی جس کو اپنا نازق اور اپنا مہربانی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد نہ ہو جانے کا خوف کرے جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرمان برداری اور اطاعت کرنے وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھئے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں میری بندگی و عبادت کر، کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یا رہے کہ وہ انسان کے سامنے اگر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے، خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے، انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار یا خواہش انتفاع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے، ان سے اپنی بندگی کرانے، ان کے سر اپنے آگے جھکوانے ان پر اپنا حکم چلانے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے، یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذت چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائزہ دے آگے بڑھے، پھیل جائے اور اس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جما دے،

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

راست و ٹویدار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھکانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا، اَنَا رَبُّكُمْ لَا خَلْقَ (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِي میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی الٰہ ہے، جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہِ علیین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں، لہذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ کَیْنِ اتَّخَذَتِ الْمُجْرِمُونَ لِمُحَمَّدٍ مِنَ الْكَافِرِينَ (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا) اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا، جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی، قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھیے۔

اَلَمْ نَقُلْ اِلٰى الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ اَتَاکَ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِکَۃُ
اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمَ رَبِّیَ الَّذِیْ یُعٰجِیْ وَکَیْمٌ ط قَالَ اَنَا اُحْجِیْ وَکَیْمٌ ط
قَالَ اِبْرٰهٖمَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاقِیْ بِالشُّمْرِیْنَ مِنَ الْمَشْرِیْقِ فَاُتِ بِہَا مِنَ الْمَعْبُودِ
فَبَہَّتِ الَّذِیْ کَفَرَ ط

(لقمانہ - ۲۵۸)

ترجمہ: تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لئے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں میری زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور

کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرمان برداری کی جاتی ہے، لہذا رب کے معنی مالک اور آفاک کے بھی ہوئے، چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں، آدمی جس کو اپنا تراق اور اپنا مہر مہی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد ہو جانے کا خوف کرے جس کو اپنا آفا اور مالک قرار دے اور جس کی فرماں برداری اور اطاعت کرنے وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھئے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یا رہے کہ وہ انسان کے سامنے اگر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے، خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے، انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار یا خواہش انتفاع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے، ان سے اپنی بندگی کرانے، ان کے سر اپنے آگے بھولائے ان پر اپنا حکم چلائے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے، یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذت چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائزہ دے آگے بڑھے، بھیل جائے اور اس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جھادے،

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

راست و عویدار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھٹھا جمانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا، اَنَا رَبُّكُمْ لَا اتَّخِذُوا لِي مُتَابِعًا مِّنْ دُونِي (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنَ إِلَٰهٍ غَيْرِي میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی الٰہ ہے، جب حضرت موسیٰ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مقابلہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہِ سامعین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں، لہذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ كُنِ اِتَّخَذْتُ الْمَلَائِكَةَ لِيَخْدَعْتَنِي لَا تَخْدَعَنِي مِّنْ اَمْرِئِكَ (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا) اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا، جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی، قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھیے۔

اَلَمْ نَقْرَأْ اِلَى الَّذِي حَاجَّ اِبْرٰهِيْمَ فِي رَبِّهٖ اَنْ اَتَاكَ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط
اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّیْ الَّذِیْ یُعٰی وَکَیْمِیْ ط قَالَ اَنَا اَحْمَدُ اُمِیْتُ ط
قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۤئِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِیْقِ فَاتِّبِعْهَا مِنْ الْمَغْرِبِ
فَبَهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ط

(لقمۃ - ۲۵۸)

ترجمہ: تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لئے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں میری زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور

کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و قیام برداری کی جاتی ہے، لہذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے، چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحب خانہ کو رب الخاں کہتے ہیں، آدمی جس کو اپنا مذاق اور اپنا مرقی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد ہو جانے کا خوف کرے جس کو اپنا آفا اور مالک قرار دے اور جس کی قیام برداری اور اطاعت کرے وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھتے اور پھر غور سے دیکھئے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں میری بندگی و عبادت کر؟ کیا دینیت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سمورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یار ہے کہ وہ انسان کے سامنے اگر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے، خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے، انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار یا خواہش انتفاع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے، ان سے اپنی بندگی کرائے، ان کے سراپے آگے جھکوائے ان پر اپنا حکم چلائے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے، یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذت چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکي یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائزہ دے آگے بڑھے، پھیل جائے اور اس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جھادے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

راست و غویار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرات ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے مٹھاٹھ جمانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا، اَنَا رَبُّكُمْ لَا تُخَافُوا مَن دُونِيَ (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنَ إِلَٰهٍ غَيْرِي میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی الٰہ ہے، جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الاٰہیین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں، لہذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ لَئِنْ أَخَذْتُ الْمَغَارِبَ لَآتِيَنَّكَ مِنَ الْمَشْرِقِ (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں نہیں قید کردوں گا) اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا، جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی، قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں دراز سے پڑھیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِي حَاجَّ اِبْرٰهِيْمَ فِی رَبِّہٖ اَنْ اَتَاہُ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِکَ ط
اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمَ رَبِّی الَّذِیْ یُحٰی وَیُمِیْتُ ط قَالَ اَنَا اُحٰی وَرَآمِیْتُ ط
قَالَ اِبْرٰهِيْمَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاقِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِہَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبَہَّتَ الَّذِیْ کَفَرَ ط

(لہقہ ۷ - ۲۵۸)

ترجمہ: تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لئے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں میری زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور

موت میرے ماتھے میں ہے، ابراہیم نے کہا، اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف لٹاتا ہے، تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا، یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجئے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لئے کہ وہ اللہ کے وجود کا منکر نہ تھا، وہ اس بات سمجھتی تھی کہ کائنات کا قیام اللہ ہی ہے، سورج کو وہی نکالتا اور وہی سب کرتا ہے، جھگڑا اس بات میں تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے۔ بلا س بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً سرزمین عراق کے باشندوں کا مالک کون ہے، وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ سلطنت عراق کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا، کہ حکومت اس کے ماتھے میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جس کی چاہے جان بخشی کر دے، یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے، اس لئے حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تم مجھے تسلیم کر دو، میری بندگی اور عبادت کرو، مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں اس کو رب مانوں گا اور اسی کی عبادت و بندگی بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے اور بس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں۔

یہ خدائی جس کا دعویٰ فرعون اور فرعون نے کیا تھا، کچھ اتنی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی، دینا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے، ایران میں بادشاہ کے لئے خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم ہودیت بجا لائے جاتے تھے، حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدا یا سگان (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاصا نڈان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے

تھے۔ چنانچہ سورج نبی اور چند نبی آج تک مشہور ہیں۔
 راجہ کو ان واتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کئے جاتے
 تھے۔ حالانکہ پرمیشور اور پرما تھا ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پر جانی
 ایسا سمجھتی تھی، ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے مانائے کا بھی تھا اور آج بھی ہے
 بعض جگہ فرمانرواؤں کے لئے الہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے
 جاتے ہیں مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان انفالک کے
 مفہوم میں پوشیدہ ہے، اس نوع کے دعوائے خداوندی کے لئے یہ ضروری نہیں
 ہے کہ آدمی صاف الفاظ ہیں الہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں، وہ
 سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اس فرمانروائی و حکمرانی، اس کی آفتابی
 خداوندی کو قائم کرتے ہیں جسے فرعون اور غرود نے قائم کیا تھا، دراصل الہ اور
 رب کے معنی و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں اور
 وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہر حال ان کے الہ اور رب
 ہونے کو تسلیم کرتے ہیں چاہے زبان سے الفاظ نہ کہیں۔

یا الواسطہ و عویدار

عرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الہیت اور
 بوہیت کا دعویٰ کرتی ہے، دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں
 ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لے کر اٹھیں اور اسے منوا
 لیں، البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں، جن سے وہ عام
 انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں، سوان ذرائع سے کام لے کر وہ
 کسی روح، کسی دیوتا، کسی بت، کسی قبر، کسی سیارے یا کسی درخت کو الہ بنا
 دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ
 تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ اور مددگار ہیں۔

ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ نہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں، ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں، لہذا ہماری زرگی تسلیم کرو، جیسے خوش کرو اور ہمارے ماتھے میں اپنی جان و مال، آبرو سب، کچھ دے دو۔

بہت سے بے وقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور یوں بھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پر دہشتوں اور بیماریوں اور مجاوروں کی خلاوندی قائم ہوتی ہے اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے۔ اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی، کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکامات دنیا شروع کر دیتے ہیں، یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے۔ اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں، یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف طریقوں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ بٹھا رکھا ہے۔

فتنہ کی اصل جڑ

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ

اور خدا کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشتے چھوٹ رہے ہیں اللہ تعالیٰ تو خیر کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے، مگر آپ تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو اللہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گو یا کہ اس کی زندگی محال ہے، اگر کوئی اللہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے اللہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے اللہ اور ارباب اس کی گردن پر مستط ہو جائیں گے، آج بھی آپ جدھر لگا لگا ڈالیں گے یہی نظر آئے گا، کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہت کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہت کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے، یہیں قومی رباست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر ماحصلیت کا گرومن اللہ غیور کی فتادی کر رہا ہے، انسان کسی ایک جگہ بھی اللہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے، اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازگی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں، جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پناہ لی، انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر رہی رہی، انسانوں کے دل و دماغ پر، اُس کی پیدائشی قوتوں اور صداقت پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں، جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و نما کو روک دیا، کس قدر سچ فرمایا۔ اس صادق و مصدوق علیہ و علیٰ اہلہ الصلوٰۃ والسلام نے :-

قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي خَفَاءَ فَجَاءَ قَوْمٌ
الشَّيْطَانُ فَاجْتَالَهُمْ مِنْ دُبُرِهِمْ وَخَرَّمْتُ عَلَيْهِمْ مَا
أَحَلَلْتُ لَهُمْ - (حدیث قدسی)

”اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صبح فطرت پر
پیدا کیا تھا۔ پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، انہیں فطرت کی راہ
راست سے ہٹکا لے گئے، اور جو کچھ میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا
ان شیطانوں نے ان کو اس سے غروم کر کے رکھ دیا۔“

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی
ہم عمر و مہیوں کی اصل جڑ ہے، یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے، یہی وہ روگ
ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی عملی و فکری قوتوں کو
اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، اور
اس کے مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے، قدیم ترین زمانہ سے کھا
رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج، بجز اس کے کچھ ہے
یہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا
الہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس
کی نجات کے لئے نہیں ہے کیونکہ ملکہ اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الہوں اور ارباب
سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔

انبیاء کا حقیقی اصلاحی کام

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی،
وہ دراصل انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ آئے، ان کا اصلی مشن
یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے اس غیباں اور بیجا
استغناء سے نجات دلائیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان انسانیت کی حد سے آگے

بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے سیٹھکے
 دیئے گئے ہیں انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ
 نظام زندگی کا پابند بنادیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عید ہو
 نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں، ابتدا سے جتنے نبی دینا میں آئے
 ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا - يٰۤاَقُوْمُ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنَ الْبَغْيَةِ
 "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا اللہ نہیں ہے۔" یہی حضرت نوحؑ
 نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے
 کہا۔ اور یہی اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرُكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ
 السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا - (ص - ۶۵-۶۶)
 میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی الہ نہیں ہے بجز اس ایک
 اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے اور آسمانوں اور زمین
 کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
 وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ لِّاَمْرٍۭ ذَا لَکُمُ
 الْخَلْقِ وَالْاَمْرِ ط (اعراف - ۵۴)

”یقیناً تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین
 کو..... اور سورج اور چاند تاروں کو سب اس کے تابع ہیں بھر دار!
 خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی ہے۔“

ذٰلِكُمْ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ
 وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَکِیْلٌ ؕ (الانعام - ۱۵۲)

”وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، ہر چیز کا
 خالق، ہذا تم اسی کی بندگی کرو، اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔“

وَمَا أَمْرُو إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
خُنْفَاءً (البینۃ: ۵)

”لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا: بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو کسی کے لئے خاص کر کے، ایک سو بہ کر۔“

تَكُونُوا إِلَىٰ ظِلْمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ
إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ - (آل عمران: ۶۴)

”اے ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے
یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں، اور نہ کوئی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں
اور ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔“

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی
مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ بکڑے ہوئے تھے، یہ
انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے
کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا

”یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اُتاتا ہے جو ان پر لدے ہوئے
تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔“ (الاعراف: ۱۵۷)

غرض اگر ہم اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ہم خدا پر ایمان
لا لیں۔ اس کی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرما نہ دار رعیت کی طرح سپرد کر دیں اور اس یقین
کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کریں کہ ہمارے چھپے اور کھلے سب کاموں کو وہ جانتا ہے اور اہم دن
ہیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ اس تصور زندگی میں
انسان کی فلاح مضمر ہے۔

یہی وہ دین حق ہے جس کی دعوت دینے اور تبلیغ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو
دیا ہے۔ اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات ص ۱۰۰-۱۰۱

دعوتِ دین کی اہمیت

دعوتِ دین اللہ کا اپنا کام ہے، اس کام کو کرنے والا اللہ کا مددگار ہوتا ہے۔ فرمایا

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّونَ
فَخَرَجَ الْمَصْرَارُ لِلَّهِ ۖ آمَنَّا بِاللَّهِ ۖ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (ال عمران - ۵۲)
جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ نبی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو انہوں نے کہا ”کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟“ حواریوں نے جواب دیا ”ہم اللہ کے مددگار ہیں! ہم اللہ پر ایمان لائے گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر جھکا دینے والے) ہیں۔“

حق کی رفاقت

دین اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ”اللہ کی مدد کرنے“ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ ایک اہم مضمون ہے، زندگی کے جس دائرے میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے۔ اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا، اس کے بہانے وہ دیبل اور نصیحت سے انسان کو اس کا قائل نہ پاتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لئے حق بات اور نفع و نجات کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں، ان کو اللہ تعالیٰ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے اور یہ مقام بندے سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے، نماز روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہی ہوتا ہے مگر تبلیغ دین اور اقامت دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں

روحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

وَلْيَنْصُرُوا اللَّهَ مِمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ ۖ

حق کی حفاظت

”اللہ حضور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔“
 یہ حکم منظم اہل حق کو قتال فی سبیل اللہ کی اجازت دینے کے بعد اور اس بات کی نکتہ
 بیان کرنے کے بعد یہ قتال فی سبیل اللہ کیوں ضروری ہے؟ دیا گیا ہے، اس لئے
 کہ اگر ظالموں اور جابروں کو یوں ہی ہمت ملتی رہے تو زمین شر و فساد سے بھر جائے اور
 دنیا میں اللہ کے نام لینے کی جگہیں تک سلامت نہ رہیں۔ لہذا جو لوگ خلق خدا کو توحید
 کی طرف بلاتے ہیں اور شر کی جگہ خیر کو فروغ دینے کی سعی و جہد کرتے ہیں وہ دراصل اللہ
 کے مددگار ہیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا کام ہے جسے انجام دینے میں وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں
 اللہ کے مددگار بننے میں اس کے معیار اور مقام کو پرکھنا بھی
 مطلوب ہوتا ہے۔

آزمائش حق

ذٰلِكَ طَوْلٌ يَّشَاءُ اللّٰهُ لَا تَنْصَرِفْ مِنْهُمْ وَاَنْتُمْ لَيَّابُونَ
 بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ ط (محمد - ۴) ط

یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے منٹ لیتا
 مگر (یہ طریقہ اس نے اس لئے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے
 کے ذریعہ آزمائے۔

کرنے کے کام سے مراد وہ طریقے ہیں جو جہاد میں مسلمانوں کو تسلیم کئے گئے ہیں،
 اس میں مومنین کی آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر محض باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی
 ہوتی تو وہ مہارے کام کا محتاج نہ تھا، یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان بھی چشم
 زدن میں کر سکتا تھا مگر اس کے پیش نظر تو یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو حق پرست ہوں
 وہ باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلہ میں مجاہدہ کریں تاکہ جس کے اندر جو کچھ
 اوصاف ہیں وہ اس امتحان سے ٹکھڑ کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے

بتہ اور اللہ کی مدد

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَ
يُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝ (محمد - ۷)

”اے لوگوں جو ایمان لائے ہو۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد
کرنے کا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا۔“

اللہ کی مدد کرنے کا ایک سیدھا سادہ مفہوم تو یہ ہے کہ اس کا حکم بلند کرنے
کے لئے جان و مال سے جہاد کیا جائے لیکن اس کا پوشیدہ مفہوم بھی ہے جس کی تشریح
اس سے قبل حضرت عیسیٰ کی پکار من الصاری الی اللہ میں ہو چکی ہے، یعنی افہام و
تفہیم سے لوگوں کو کفر و بغاوت اور سرکشی سے اطاعت و فرمانبرداری پر قائل کرنا
یہ دعوت و تبلیغ کا کام جب آدمی کرنے لگتا ہے تو اللہ اسے بوجہی نہیں چھوڑ دیتا۔
کہ وہ خستہ حال اور پریشان حال ہو کر رہے، بلکہ اللہ اس کو نصرت فرماتا ہے،
اور اس کے لئے ایسا سبب مہیا کرتا ہے کہ اس کے قدم خوب جم جاتے ہیں اور
مخالف اسے کمزور نہیں پاتا۔ مزید فرمایا:

وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ط إِنَّ اللَّهَ
خَبِيرٌ عَزِيزٌ ۝ (الحديد - ۲۵)

یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی
مدد اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے، لَقِينَا اللہ بڑی قوت والا اور
زبردست ہے۔

یعنی اللہ کو اس مدد کی ضرورت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے، کہ وہ کمزور ہے اور

۱۔ تفہیم القرآن - سورہ محمد - ۷

۲۔ تفہیم القرآن - الحجید - ۳۵

اپنی طاقت سے یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ یہ طریق کار اس نے انسانوں کی آزمائش کے لئے اختیار فرمایا ہے، اور اسی آزمائش سے گزر کر انسان اپنی ترقی اور فلاح کی راہ پر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اللہ تو ہر وقت یہ قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے اپنے ایک اشارے سے تمام کافروں کو مغلوب کر دے اور اپنے رسولوں کو ان پر غلبہ و تسلط عطا فرما دے مگر اس میں پھر رسولوں پر ایمان لانے والوں کا کیا کمال ہوگا، جس کی بنیاد پر وہ کسی انعام کے مستحق ہوں؟ اسی لئے اللہ نے اس کام کو اپنی غالب قدرت سے انجام دینے کے بجائے طریق کار یہ اختیار فرمایا کہ اپنے رسولوں کو بینات اور کتاب اور میزان دے کر انسانوں کے درمیان مبعوث کر دیا، ان کو اس بات پر مامور فرما دیا کہ لوگوں کے سامنے عدل کا راستہ پیش کریں اور ظلم و جور اور بے انصافی سے باز آجائے کی ان کو دعوت دیں۔ انسانوں کو اس امر کا پورا اختیار دے دیا کہ ان میں سے جو چاہے رسولوں کی دعوت کو قبول کرے اور جو چاہے اسے رد کر دے، قبول کرنے والوں کو پکارا کہ آؤ، اس عدل کے نظام کو قائم کرنے میں میرا اور میرے رسولوں کا ساتھ دو اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جان توڑ جدوجہد کرو جو ظلم و جور کے نظام کو باقی رکھنے پر تلے، سوئے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون سے جو انصاف کی بات کرنا چاہتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو انصاف کے مقابلے میں بے انصافی قائم رکھنے کے لئے اپنی جان فی سبیل اللہ ضائع کرتے ہیں اور کون ہیں جو انصاف کی بات قبول کر لینے کے بعد اس بات کی حمایت اور اس کی خاطر جدوجہد کرنے سے جی چراتے ہیں، اور کون ہیں جو ان دیکھے خدا کی خاطر دینا میں اس حق کو غالب کرنے کے لئے جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں، اس امتحان سے جو لوگ کامیاب ہو کر نکلیں گے انہیں کے لئے اُسندہ ترقی قبول کے دروازے کھلیں گے۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَتْلًا مِنَ اللَّهِ
وَرِضْوَانًا وَيُصَدِّقُونَ اللَّهَ بِرَسُولِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

(الحشر - ۸)

جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں
یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور
اس کے رسول کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں، یہی راست باز
لوگ ہیں۔

ترقی درجات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا الصَّادِقِينَ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
لِلْحَوَارِيِّينَ مِنَ الصَّادِقِينَ إِلَى اللَّهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ الصَّادِقُونَ
اللَّهُ فَاغْنِنَّا ط لَقِيَ مَن بَنَى إِسْرَائِيلَ وَكَفَرْتُ ط لَقِيتُنَا حَاضِرًا
الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى عِدَّتِهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ۝

(الصف - ۱۴)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو جس طرح
عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: ”کون ہے اللہ کی
راہ میں میرا مددگار؟ اور حواریوں نے جواب دیا تھا: ہم ہیں اللہ
کے مددگار۔“ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور
دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے
دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے۔“
یہ آخری مقام ہے جہاں قرآن مجید میں ان لوگوں کو اللہ کا مددگار کہا گیا ہے
اے تفسیر القرآن - سورہ الحشر سے تفسیر القرآن - ۱۴ - الصف

تو خلق خدا کو دین کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کے دین کو کفر کے مقابلے میں غالب کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس سے پہلے سورہ آل عمران آیت ۵۲ - سورہ حج آیت ۴۰ سورہ طہ آیت ۸۱، سورہ حدید آیت ۲۵ - اور سورہ حشر آیت ۸ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ الجھن پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، تمام خلق سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں تو کوئی بندہ آخر اللہ کا مددگار کیسے ہو سکتا ہے اس الجھن کو رفع کرنے کے لئے ہم یہاں اس مسئلے کی مزید وضاحت کئے دیتے ہیں۔

در اصل ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار اس لئے نہیں کہا گیا کہ اللہ رب العالمین معاذ اللہ کسی کام کے لئے اپنی کسی مخلوق کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو کمزور ایمان اور لطافت و معصیت کی آزادی بخشی ہے اس میں وہ لوگوں کو اپنی قوت قاہرہ سے کام لے کر بجز مومن و مطیع نہیں بناتا بلکہ اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے ان کو راہ راست دکھانے کے لئے تذکیر و تعلیم اور تنہیم و تلقین کا طریقہ اختیار فرماتا ہے، اس تذکیر و تعلیم کو جو شخص یرضاد و بغیت قبول کرے وہ مومن ہے، جو عملاً مطیع فرمان بن جائے وہ مسلم و قانت اور عابد ہے جو خدا ترسی کا رویہ اختیار کرے وہ متقی ہے، جو نیکوں کی طرف سبقت کرنے لگے وہ عمن ہے، اور اس سے مزید ایک قدم آگے بڑھ کر جو اسی تذکیر و تعلیم کے ذریعہ بتہدگان خدا کی اصلاح کے لئے اور کفر و فسق کی جگہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کرنے کے لئے کام کرنے لگے، اسے اللہ تعالیٰ خود اپنا مددگار قرار دیتا ہے، جیسا کہ آیات مذکورہ بالا میں کئی جگہ بالفاظ صحیح ارشاد ہوا ہے، اگر اصل مقصود اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کے دین کا مددگار ہوتا تو الفاظ اللہ کے بجائے الْخُصَادِ دِیْنِ اللہ فرمایا جاتا یا یَنْصُرُوْنَ اللہ کے بجائے یَنْصُرُوْنَ دِیْنِ اللہ فرمایا جاتا اِنْ تَنْصُرُوا اللہ کے بجائے اِنْ تَنْصُرُوا دِیْنِ اللہ فرمایا جاتا، جب ایک مضمون کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے درپے کئی مقامات پر

ایک ہی طرز بیان اختیار فرماتا ہے، تو یہ اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ اصل مقصود ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار ہی کہنا ہے۔ مگر یہ ”مددگاری“ نعوذ باللہ اس معنی میں نہیں ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا کُلُّہ درت پوری کرتے ہیں جس کے لئے وہ ان کی مدد کا محتاج ہے۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ لوگ اسی کام میں حصہ لیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنی قوت کے ذریعہ سے کرنے کی بجائے، اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتا ہے۔

دعوتِ حق اور اس کا مقصد

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَذَّكَّرُ أَفَ تَنْفَعُهُ الذِّكْرُ ۝

(غالب - ۳۰-۱۶)

”تمہیں کیا خبر شاید وہ سیدھا جائے ایسی“ پر دھیان دے اور

یقین کرنا اس کے لئے نافع ہو

یعنی دعوتِ حق کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسانوں اور خدا کی بندگی اور اطاعت سے منحرف لوگوں کی اصلاح اور سدھار ہو تاکہ وہ رب العالمین کی بندگی قبول کر کے شر و فساد سے اجتناب کریں اور گندے اخلاق کو ترک کر کے پاکیزہ اخلاق اختیار کریں۔

اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰ ۝ فَصَلِّ حَتّٰى لَكَ اِلٰی اَنْ تَذَكَّرَ ۝ وَاَهْدِيْكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝

(النزعت - ۱۷-۱۸-۱۹)

”فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہہ دے کہ کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو۔“

فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے متجاوز کر کے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے، خالق کے مقابلے میں اس کی سرکشی کا ذکر تو آگے اسی سورہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ فَخَشَّ كُنَادِي، فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمْ اَلَا اَسْمٰى کہ اس نے اپنی رعایا کو جمع کر کے اعلان کیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر سخت ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور پوری اپنی قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا جیسا کہ سورہ قصص ۱۷ میں ان الفاظ میں مذکور ہے

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَكَ شِيْعًا يَّسْتَضِعُّ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ سِيْذِجَ اَبْنَاءَهُمْ وَكَيْنَحَى نِسَاءَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (القصص - ۴)

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے رٹکوں کو قتل کرتا اور اس کو جیتا رہنے دیتا تھا، فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور سورہ الزخرف میں ہے فَاسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝ (الزخرف - ۵) اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔

فرعون کی اس سرکشی میں مبتلا ہونے اور اس سرکشی سے اسے نکلنے کے لئے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ تزکیہ کے ہیں کہ وہ اس سرکشی سے باز آ جائے جو اس نے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں اختیار کر رکھی تھی اور اس کا ذریعہ توفیق خدا ہے تو دونوں کا ذکر فرمایا کہ ہیں تمہیں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں

سُورَةُ الْقُرْآنِ - سُورَةُ الْقَصَصِ - ۴

اس کی عظمت اور جبر و تبت تیرے سامنے پیش کروں تاکہ تیرے دل میں اس کا خوف اور اپنی بندگی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہو تو خالق اور خالق دونوں کے مقابلے میں سرکشی سے باز آ جائے۔

تزکیہ، معنی و مفہوم

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝ (الاعلیٰ: ۱۴)

”فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔“

پاکیزگی سے مراد ہے کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، بڑے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور بڑے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال اختیار کرنا۔ فلاح سے مراد دنیوی خوشحالی نہیں بلکہ حقیقی کامیابی ہے خواہ دنیا کی خوشحالی اس کے ساتھ میسر ہو یا نہ ہو۔

دعوت حق ایک نصیحت

سَلَامًا إِنَّهُ تَذَكَّرَكُمُ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ ۝ (عبس: ۱۱-۱۲)

”... ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کر لے۔“

یعنی دعوت حق کو رد کرنے والوں کی بے جا خواہشیں اور مطالبے پورے نہیں کئے جاسکتے، مثلاً یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمد ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو، اور یہ خط ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفار مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔“

لے تفسیر القرآن - الاعلیٰ ۱۲ / ۱۷ تفسیر القرآن - المدثرہ ۵۵ - ۵۶

ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے
آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لا کر ہمیں دیں، جسے ہم پڑھیں
(بنی اسرائیل - ۹۲) کیونکہ یہ تو ہم اس نصیحت ہے جس کا جی چاہے اس نصیحت اور سبق کو اہل کرے۔
اِنَّ هٰذِهِ تَذٰكِرَةٌ - مِمَّنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَجِیْمٍ سَبِیْلًا ۝ (الدھر: ۲۹)
یہ ایک نصیحت ہے اب بس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے
کا راستہ اختیار کرے۔

نصیحت (ذکر قبول کرنے والے کو) لوگ ہیں اور نہ قبول کرنے والے کو
سَيَذْكُرْ مَنْ يَخْشَى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ
الْكُبْرَى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۝ (الاعلیٰ: ۱۰-۱۱-۱۲-۱۳)
”جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرے گا، اور اس سے گریز کرے گا۔
وہ انتہائی بد بخت ہو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں
مرے گا اور نہ جینے گا۔“

یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہوگا اسی کو یہ فکر
ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اس بندے کی
نصیحت کو توجہ سے سنے گا، جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور فلاح و سعادت
کا راستہ بتا رہا ہو۔

الْأَشْقَى - یعنی جو شخص مرتے دم تک کفر و شرک یا دھرمیت پر قائم رہا۔
اور اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول نہ کیا تو اس کی سزا یہ ہوگی، کہ
جہنم میں ڈالا جائے گا۔ تو نہ اسے موت آئے گی۔ کہ عذاب سے پھوٹ جائے۔
اور نہ جینے کی طرح جینے گا، کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔

راہِ حق کا مسافر

يُذَكِّرُ كَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ بملا جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پاتے والا ہے یا وہ جو سراٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہے۔
ہو ۹ - ۲۲ - الملک

جس پر مزید ان الفاظ میں اضافہ کیا گیا ہے۔
قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ ۖ
الْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝
”ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔“

یعنی اللہ نے تو تمہیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا، تمہارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ یہ کان تمہیں اس لئے تو نہیں دئے گئے تھے کہ جو شخص تمہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات سن کر توجہ نہ دو اور جو غلط ملط باتیں پہلے سے تمہارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں انہی پر اڑے رہو، یہ آنکھیں تمہیں اس لئے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بنیائی سے کام لے کر یہ نہ دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ آیا اس کی توحید کی شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظام کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اس کو چلا رہے ہیں، اس طرح یہ دل و دماغ بھی تمہیں اس لئے نہیں دئے گئے تھے کہ تم سوچنے سمجھنے کی کوئی رحمت

گوارا نہ کرو کہ وہ غلط ہے یا صحیح، اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں حق شناسی کے لئے دی تھیں۔ تم ان شکر کر رہے ہو کہ ان سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لئے یہ دی گئی تھیں

حق کے منکر

أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَىٰ (المائدہ: ۱۰۰)
 ”غور کر کے جو شخص منہ اتر دھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پاتے والا ہے۔“
 یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کئے ہوئے اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اسے ڈال دیا ہو۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۚ كَذَٰلِكَ هُمْ صَرُّ
 مُتَنَفِّرُونَ ۚ كَرِهَتْ مِنْ قُورَ ۚ (المذثر: ۴۹-۵۰-۵۱)
 ”آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے من موڑ رہے ہیں گویا یہ جنگلی گیسے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔“
 یہ ایک عربی معاشرہ ہے جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھڑکتے ہی وہ اس قدر بدحراس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا، اس لئے اہل عرب غیر معمولی طور پر بدحراس ہو کر بھاگنے والے کو جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کا ریو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے۔

حق کی نصیحت

وَتَوَّاصُوا بِالْحَقِّ - العصر
 اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے، اس آیت کریمہ میں اجتماعی خسارے اور معاشرے کو بگاڑنے سے بچانے کی تدبیر بیان فرمائی ہے کہ معاشرے

۱۔ تفہیم القرآن - المائدہ: ۲۲
 ۲۔ تفہیم القرآن - المذثر: ۴۹-۵۰-۵۱
 ۳۔ تفہیم القرآن - العصر: ۳۲

کے ہر فرد کو جس طرح خود نیک اور صالح بننے کی کوشش کرنی چاہیے اسی طرح فردی ہے کہ ان کے اجتماع سے بھی ایک مومن اور صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے، دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے اس لئے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور یہ بالعموم دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات خواہ وہ مخفیہ اور ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے، دوسرے وہ حق جس کا ذکر کرنا انسان پر واجب ہو خواہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا حسن نہ ہو کہ اس میں باطل سراٹھا رہا ہو، اور حق کے خلاف کام کئے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سراٹھانے لگے حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل کی نصیحت کرے، یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے، اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا۔ اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں، مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں، یہی بات ہے جو سورۃ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا انکباب عام ہو رہا تھا، اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بڑے افعال

سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (آیات ۷۸-۷۹) پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا ہفتے کے احکام کی خلاف ورزی کر کے پھیلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے، (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۷) اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵) اسی لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران ۱۱۰) اور اس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے۔ (آل عمران ۱۱۰)

دعوت حق کی کامیابی

ثُمَّ لَعَنَّا مِنْ بَعْدِ هٰذَا مُوسٰی بِاٰیَتِنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ وَصَلَٰتِهِمْ - ۱۰۳
 ”پھر ان قوموں کے بعد اجن کا ذکر اور کیا گیا (ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔
 اوپر جو قصہ بیان ہوئے ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے، اسے پھر ہلاک کئے بغیر نہیں چھوڑا جاتا اس کے بعد اب موسیٰ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور سبق بھی کفار قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیتے گئے ہیں۔

کفار قریش کو اس قصے کے پیرائے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا

۱۰۳ لَعَنَّا مِنْ بَعْدِ هٰذَا مُوسٰی بِاٰیَتِنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ وَصَلَٰتِهِمْ - ۱۰۳

ہے، اس وجہ سے کہ نہ کھانا چاہتے۔ حق کی تو پوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی اقلیت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی مروتانہ کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے پھر بھی آخر کار وہی غالب آکر رہتا ہے، نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعی حق کے مقابلہ میں جو پالہیں چلی جاتی ہیں اور جن تعبیروں سے اس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کتنی کئی طویل مدت سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے اور جب کسی تنبیہ کسی سبق آموز واقعہ اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انہیں عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصے میں دوسرا سبق دیا گیا ہے، پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری کو نا واقفان، حق کی کثرت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ ٹوٹے اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں، دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روشیں اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں کی طرح خدا کی لعنت میں بھی گرفتار ہوتا ہے، قصہ یوسف علیہ السلام سے جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو تو وہ محض اپنے اخلاق کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے، یوسف علیہ السلام کو دیکھئے، ۱۷ برس کی عمر، تن تنہا، بے سروسامان، اجنبی ملک اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں، تاریخ کے اس دور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی وہ کسی سے پریشیدہ نہیں، اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا جس کی معیار سزا بھی کوئی نہ تھی، اس حالت تک گرا دیئے جانے کے بعد وہ محض اپنے ایمان اور اخلاق کے بل پر اٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو

مسخر کر لیتے ہیں۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهُ خِشَاءً ط فَصِيبُ
بِرَحْمَتِنَا مِنْ خِشَاءٍ وَلَا تُضِلُّوا أَعْيُنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ ۵۶: يوسف علیہ السلام

”اللہ اس طرح ہم نے اس زمین میں یوسف کے لئے اقتدار کی راہ
ہموار کی، وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے، ہم اپنی
رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے
ہاں مارا نہیں جاتا۔“

یعنی اب ساری زمین مصر اس کی تھی، اس کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کہہ سکتا
تھا، وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جو اس سے روکا جاسکتا تھا، یہ گویا اس
کامل تسلط اور ہمہ گیر اقتدار کا بیان ہے جو حضرت یوسف کو اس ملک پر حاصل
تھا، قدیم مفسرین بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں، چنانچہ ابن زید کے حوالے
سے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ
”ہم نے یوسف کو ان سب چیزوں کا مالک بنا دیا جو مصر میں تھیں، دنیا کے اس
حصہ میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا۔ وہ سرزمین اس کے حوالے کر دی گئی
تھی، حتیٰ کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو اپنا زیر دست کرے اور خود اس سے بالاتر
ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا۔“ دوسرا قول علامہ موصوف نے مجاہد کا نقل کیا ہے
جو مشہور رائے تفسیر میں سے ہے، ان کا خیال ہے کہ بادشاہ مصر نے یوسف کے ماتھے پر
اسلام قبول کر لیا تھا۔

دعوت حق اور اللہ کی فاق

فَاتَمَّ عَلَىٰكَ الْبَلَاءُ وَعَلَيْكَ الْحِسَابُ ۝ ۴۰: الرعد علیہ السلام

”بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حجاب لینا ہمارا کام ہے۔“
وَمَا تَنْفَعُكَ الْآيَاتُ إِلَّا بِرُؤُوفٍ ۝ ۴۱: التہیم القرآن راء الرعد علیہ السلام

مطلب یہ کہ تم اس نکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوت حق کو جھٹلادیا ہے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب وہ ظہور میں آتا ہے؟ تمہارے سپردچوکلہ کیا گیا ہے، اسے پوری یکسوئی کے ساتھ کئے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات ان مخالفین کو سنانی مقصود ہے جو پیچھے کے انداز میں بار بار حضور سے کہتے تھے کہ ہماری جس شامت کی دھکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ کیوں نہیں آتی۔

اَدَّكُم مَّيْرًا اَمَّا نَأْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اُخْدَافِهَا وَاللّٰهُ يَكُفُّ لَكُمْ لَعْنَتِيْكُمْ لِحُكْمِهِ ط وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ه وَذُنُ مَكْرًا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ط يَعْلَمُ مَا تَكْتَسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ط وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (البقرہ: ۲۴۹-۲۵۰)

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آ رہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں۔ اللہ حکومت کر رہا ہے کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جانتا ہے کہ کون کچھ کمانی کر رہا ہے اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر برے ہے؟"

یہ ارشاد کہ ہم اس کا دائرہ تنگ کرتے چلے آتے ہیں، بہت واضح ہے، یعنی کیا تمہارے مخالفین کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ اسلام کا اثر سرزمین عرب کے گوشے گوشے میں پھیلنا جا رہا ہے اور چاروں طرف سے ان پر حلقہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے؟ یہ ان کی شامت کے آثار نہیں ہیں تو کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم اس سرزمین پر چلے آ رہے ہیں، ایک نہایت لطیف انداز بیان ہے، چونکہ دعوت حق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ اس کے پیش کرنے والوں میں سے ہوتا ہے، اس لئے کسی سرزمین میں اس دعوت کے پھیلنے کو اللہ تعالیٰ یوں تعبیر فرماتا

”دعوتِ حق کے مقابلے میں مخالفین کی چالیں ناکام ہوں گی“

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا. (الرعد: ٣٣)

ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ بڑی بڑی چالیں پل چکے ہیں، مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یعنی آج کوئی نئی بات نہیں کہ حق کی آواز کو دبانے کے لئے جھوٹ اور غریب اور ظلم کے ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہوں۔ کچھلی تاریخ میں بار بار ایسی چالوں سے دعوتِ حق کو شکست دینے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

اَقِ اَمْرًا لِلّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْا ۝۱۰۰ النحل، آگیا اللہ کا فیصلہ اب اس کے لئے

بلدی نہ مجاؤ۔

یعنی بس وہ آیا ہی چاہتا ہے اس کے ظہور اور نفاذ کا وقت قریب آگیا ہے۔
اس بات کا صیغہ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے
کے لئے فرمایا گیا یا پھر اس لئے کہ کفارِ قریش کی مکرشی اور علی کا پیانا لبریز ہو چکا تھا، اور
آخری فیصلہ کن قدم اٹھائے جانے کا وقت آگیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ”فیصلہ“ کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں واللہ اعلم بالصواب، کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان معبود ہوتا ہے ان کے بخود الکفار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ حکم ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے، اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کن عذاب آجاتا ہے یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے، ہجرت جب واقع ہوئی تو کفار مکہ سمجھ کر فیصلہ ان کے حق میں ہے، مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکہ سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يُعَادُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُتِبُوا كُتِبَتِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَهَذَا أَمْزَلُنَا آيَاتِ بَيِّنَاتٍ ط وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُجِيمٌ (المجاد: ۵)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہو چکے ہیں ہم نے صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔“

اصل میں لفظ کُتِبَ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، رائدہ درگاہ کر دینا، دھکے دے کر نکال دینا، تذلیل کرنا۔ ارشاد الہی کا مدعا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت اور اس کے احکام سے بغاوت کا جو انجام پچھلے انبیاء کی امتیں دیکھ چکی ہیں اس سے وہ لوگ برگزیدہ بنج سکیں گے، جو اب مسلمانوں میں سے وہی روش اختیار کریں گے۔ انہوں نے بھی خدا کی شریعت کے خلاف خود قوانین بنائے، یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کو اختیار کیا تب اللہ کے فضل اور اس کی نظر عنایت سے وہ محروم ہوئے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی ایسی گراہیوں بدکرداریوں اور اخلاقی و تمدنی برائیوں سے لبریز ہوتی چلی گئی جنہوں نے بالآخر دنیا - ۱

ہی میں ان کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑا۔ یہی غلطی اگر اب امت محمدیہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ قبول بارگاہ ہی رہے اور اللہ اسے ذلت کے گڑھ میں گرنے سے بچائے چلا جائے، اللہ کو نہ اپنے پچھلے رسولوں کی امت سے کوئی عداوت تھی، نہ اس رسول کی امت سے اس کا کوئی خصوصی رشتہ ہے۔

اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب، سیاق و سبب پر غور کرنے سے یہ بات متشریح ہوتی ہے کہ یہاں اس روش کی دوسرا ذکر ہے۔ ایک کبت، یعنی وہ خوار می رسولی جو اس دنیا میں ہوئی اور ہوگی دوسرے عذاب جہنم، یعنی ذلت کا وہ عذاب جو آخرت میں ہونے والا ہے۔

آخری کامیابی مومنین کا حق

وَسَيَعْلَمُ الْكَافِرُ لِمَنْ عَصَى اللَّهَ أَرْسَلَهُ - العنكبوت: ۲۴ اور غنیمت یہ منکرین حق دیکھ

طہ: تنبیہ القرآن - العنكبوت: ۲۴

لیں گے کہ انجام کس کا بھرا ہوتا ہے۔

اس کا ظہور جاہلی سوسائٹی میں کس طرح کھلبلی ڈالتا ہے

قَالُوا يٰصَلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَوْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا
يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ (ہود: ۶۲)

انہوں نے کہا کہ اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان
ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات والبتہ تھیں، کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش
سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ تو جس طریقے
کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں حجاب
میں ڈال رکھا ہے؟

اس آیت کریمہ سے تین باتیں یادیں کیئے کہ تین مضامین پر روشنی پڑتی ہے
۔ پہلی بات یہ کہ نبی کے متعلق بعثت سے قبل لوگوں کے تصورات اس کی شخصیت کے
بارے میں کس طرح کے ہوتے ہیں۔ قوم صالح، حضرت صالح کے بارے میں بعثت
کے بعد کس طرح حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے۔ یٰصَلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَوْجُوًّا
۔ اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے
بڑی توقعات والبتہ تھیں۔

یعنی ہوشمندی، ذکاوت، فراست، سنجیدگی و منانیت اور پر وقار شخصیت کو دیکھ
کر ہم یہ امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ بڑے آدمی ہو گئے۔ اپنی دنیا بھی خوب بناؤ گے
اور ہمیں بھی دوسری قوموں اور قبیلوں کے مقابلے میں تمہارا سے ندرت سے فائدہ اٹھانے
کا موقع ملے گا۔ مگر تم نے یہ توحید اور آخرت کا نیا راگ چھیڑ کر تو ہماری ساری
امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یاد رہے کہ ایسے ہی کچھ خیالات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
متعلق آپ کی ہم قوموں میں پائے جاتے تھے، وہ بھی نبوت سے پہلے آپ کی بہترین
قابلیتوں کے معترف تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص بہت بڑا تاجر بنے
گا اور اس کی بیدار مغزی سے ہم کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ مگر حجاب کی

توحیات کے خلاف آپ نے توحید و آخرت اور احکام اخلاق کی دعوت دینی شروع کی
تو وہ آپ سے نہ صرف مایوس بلکہ بیزار ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا خاصا کام کا
آدمی تھا، خدا جانے اسے کیا جنون لاحق ہو گیا ہے کہ اپنی زندگی بھی برباد کی اور ہماری
امیدوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔ (۲) دوسرا مضمون جس پر آیت مذکور میں روشنی پڑتی
ہے، وہ ہے اسلام اور جاہلیت میں وجہ نزاع، اور دونوں کے طرز استدلال کا نمایاں
فرق۔ ان کا قول ہے کہ **اَتَّخِذْنَا اِنْ لَعْنَةُ مَا لَعَبَدُ اَبَاؤُنَا** کیا تو ہمیں ان معبودوں
کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟۔
یہ گویا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ معبود کیوں عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پوجا
کس لئے ہوتی ہے یہاں اسلام و جاہلیت کے طرز استدلال کا فرق
نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت صالح نے کہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں
ہے اور اس پر دلیل یہ دی تھی کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور زمین میں آبار کیا
ہے۔ اس کے جواب میں ان کی شرک قوم کہتی ہے کہ ہمارے یہ معبود بھی مستحق عبادت
ہیں اور ان کی عبادت ترک نہیں کی جاسکتی، کیونکہ باپ دادا کے دقتوں سے ان
کی عبادت ہوتی چلی آرہی ہے یعنی مکھی پر مکھی صرف اس لئے ماری جاتی رہی چاہیے
کہ ابتدا میں کسی بے وقوف نے اس جگہ مکھی ماری تھی اور اب اس مقام پر مکھی مارتے
رہنے کے لئے اس کے سوا کسی معقول وجہ کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں مدتوں سے
مکھی ماری جا رہی ہے۔

(۳) تیسرا مضمون وہ خلیان اور اضطراب ہے جو دعوت حق کے ظہور کے وقت
عام جاہلی سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار آیت مذکور میں ان الفاظ سے
کیا گیا ہے **وَ اِنَّا لَنُفِيْ شَرِّكَ مِمَّا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝** **لَقَدْ اَفْرَأْنٰ** تو جس طریقے
کی طرف ہمیں بلا رہا ہے۔ اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں
خلیان میں ڈال رکھا ہے، یہ شبہ اور یہ خلیان کس امر میں تھا؟ اس کی کوئی تصریح

نہیں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نجان میں تو سب پڑ گئے تھے مگر ہر ایک کا نجان الگ نوعیت کا تھا۔ یہ دعوت حق کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب دعا ہوتی ہے تو لوگوں کا اطمینان قلب رخصت ہو جاتا ہے اور ایک عام بے کلی پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ ہر ایک کے احساسات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر اس بے کلی میں سے سب کو کچھ نہ کچھ حاصل کر ضرور رہتا ہے۔ اس سے پہلے جس اطمینان کے ساتھ لوگ اپنی ضلالتوں میں نہمک رہتے تھے اور کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، وہ اطمینان اس دعوت کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ نظام جاہلیت کی کمزوریوں پر داعی حق کی بے رحم تنقید، اثبات حق کے لئے اس کے پر زور اور دل لگتے دلائل، پھر اس کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا علم اس کی شرافت نفس، اس کا نہایت کھرا اور راست بازانہ رویہ اور اس کی وہ زبردست حکیمانہ شان جس کا سکڑ بڑے سے بڑے ہٹ دھرم مخالف کے دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے، پھر وقت کی سوسائٹی میں سے بہترین عناصر کا اس سے متاثر ہوتے چلے جانا اور ان کی زندگیوں میں دعوت حق کی تاثیر سے غیر معمولی انقلاب رونما ہونا یہ ساری چیزیں مل جل کر ان سب لوگوں کے دلوں کو بے چین کر ڈالتی ہیں جو حق آ جانے کے بعد بھی پرانی جاہلیت کا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔

الْمَیَّاتُ کُمْ نَبُوءَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمٌ نُّوحٌ وَعَادٌ وَثَمُودٌ وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ط جَاءَهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنَاتِ فَرَدُّوا اَیْدِیْہُمْ فِیْ اَنۡوَاحِہِمْ وَقَالُوۡا اِنَّا کَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِہِمْ وَاِنَّا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوۡنَا اِلَیْہِ مُرِیۡبٍ ۝ (ابراہیم: ۹)

”کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی نشانیاں لئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں مالتھو دیا لئے اور کہا، ”جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے

گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلیجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ختم کرنے کے بعد اہل مکہ کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق پر تمہارا غصہ حیرت اور انکار کوئی نئی بات نہیں، تم سے پہلے جس قدر قومیں گزری ہیں ان سب کی حالت یہ تھی کہ جَا رَنَّهُمْ رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَذَرُوهَا يُدْبِرْهُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ ﴿١٠﴾ اِن کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لئے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لئے، یہ وہ حالت ہے کہ جو غصے، انکار، جھجلاہٹ اور اچھے سے انہوں نے کی تھی، اور کہا

اَنَا كَفَرْنَا بِمَا ارْسَلْتُمْ بِهِ وَاِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا اِلَيْهِ مُرْتَبِهٖ ۝
 ”جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اہل کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلیجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

یعنی ایسا شک جس کی وجہ سے اطمینان رخصت ہو گیا ہے، یہ دعوت حق کا خاصا ہے کہ جب وہ اٹھتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کھلبلی ضرور مچ جاتی ہے اور انکار و مخالفت کرنے والے بھی پورے اطمینان کے ساتھ اسکا انکار کر سکتے ہیں اور نہ اس کی مخالفت دعوت کی سچائی، اس کی معقول دلیلیں، اس کی کھری کھری اور بے لاگ باتیں، اس کی دل موہ لینے والی زبان، اس کے داعی کی بے داغ سیرت، اس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں کا صریح انقلاب اور اپنی دعوت حق کے عین مطابق ان کے پاکیزہ اعمال، یہ ساری چیزیں مل جل کر کٹے سے کٹے مخالف کے دل میں بھی ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ داعیان حق کو بے چین کرنے والا خود بھی چین سے شردم ہو جاتا ہے۔

دعوتِ حق کے نازک مراحل

دعوتِ حق کے ان نازک مراحل کا تذکرہ کرنے سے پہلے جو سورہ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے والے چند نوجوانوں کی دعا کے پیرا میں بیان ہوا ہے ان حالات پر بھی نگاہ ڈال لی جائے جو اسی دعا سے بالکل مماثل قرآن مجید نے بنی اسرائیل اور قوم فرعون کی مختصر انداز میں حالت بیان فرمائی ہے۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتُهُ مِمَّنْ قَوْمُوهٖ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ ۖ وَ

مَلَأَهُمُ الْمَلَأُ أَن يَفْتِنَهُمْ ۖ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ ۚ وَ

أَخَذَ لِمَنْ أَلْمَسَ فِتْنَةً ۚ (یونس ۸۳)

”اے دیکھو کہ موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور اپنی قوم کے سربراہان و لوگوں کے ڈر سے انھیں خوف تھا کہ فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکھتے نہیں ہیں۔“

(۱) اس آیت میں اتنا بیان ہے کہ چند نوجوان مسلمان ہوئے، مگر رسیدہ لوگ ایمان نہیں لائے لفظ ذریتہ کا استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے ترجیح دی ہے کہ اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرتا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس پر خطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لوگوں اور لڑکیوں نے تو کی، مگر ماؤں، باپوں اور قوم کے سن سیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات میں نظر آ رہا تھا، بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے عذاب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی عذاب لاؤ گے۔“

سہ لفظیہ القرآن - سورہ یونس - ۸۳

یہ بات خاص طور پر قرآن نے نمایاں کر کے اس لئے پیش کی ہے کہ مکہ کی آبادی میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے، بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے، بلکہ چند باہمت نوجوان تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقت اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لئے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مصلحت کو شہ بوتھا کوئی نہ تھا۔ سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علی بن ابی طالب، جعفر طیار، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، مصعب بن عمیرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ جیسے لوگ قبول اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سن رسیدہ عبدالرحمن بن عوفؓ، بلالؓ اور سہیبؓ تھے جن کی عمریں ۳۰ اور ۳۵ کے درمیان تھیں۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ، زید بن حارثہ عثمان بن عفانؓ اور عمر فاروقؓ ۳۰ اور ۳۵ کے درمیان عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سن رسیدہ ابو بکر صدیقؓ تھے ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تھی۔ یعنی حضرت عبداللہ بن حارثؓ مطلبیؓ اور غالبؓ پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضور کے ہم عمر تھے یعنی عمار بن یاسرؓ۔

(۷) آیت مذکور میں فَمَا أُتِيَ بِمُوسَىٰ کے الفاظ میں اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے لیکن ایمان کے ساتھ لام کا صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت کے معنی دیتا ہے۔ یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہنے پر چلنا۔ پس دراصل ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ موسیٰ کو اپنا رہبر پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوت اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا، پھر بعد کے فترے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرز عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰ کے

صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسیٰ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیرمی کے خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے امتی تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدت دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست سمیٹی نے جو زیر دستی سے پیدا ہوئی تھی۔ ان میں اتنا بل بوتہ باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرمان روائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھتے، یا جواٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسیٰ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرز عمل کیا تھا۔ اس کا اندازہ بائبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:-

”جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰ اور ہارون ملاقات کے لئے راستہ پر کھڑے ملے۔ تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے۔ تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھناؤنا کیا ہے۔ کہ ہمارے قتل کے لئے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے“ (خروج ۶: ۲۰-۲۱)

تورات میں لکھا ہے کہ نبی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے: ”ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو کچا اور چرواہے نے اگر اس کو بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے۔ بس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی بھیخ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔“

انہی باتوں کی طرف سورہ اعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ نبی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ اُوذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیْنَا وَمِنْ کَعْدِ مَا جِئْنَا (تفہیم القرآن)

رس، ازل حال تھا تو جو ان غلص ایماں داروں کا، دو ٹوٹا حال تھا تو ام مصلحت کوشوں کا۔ تمیر احال اسی آیت میں ہے فرعون کے مظالم اور تشدد اور سخت گیرمی کا۔

وَ اِنْ جَرَعُوْنَ لَعَالٌ فِی الْاَرْضِ وَ اَخَذَ لِمَنْ الْمُسْرِفِیْنَ ۝

۱۱۔ واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکھتے نہیں ہیں۔ اس آیت میں فرعون کے متعلق لفظ مسرفین استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مسرفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطالب کے لئے کسی بڑے سے بڑے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ کسی ظلم اور کسی بداخلاقی اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چوکتے، اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جاسکتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی حد نہیں جس پر جا کر رک جائیں۔

حضرت موسیٰ کا خطاب

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُّسْلِمِينَ
”موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ ”لوگو، اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو“
ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جاسکتے۔ حضرت موسیٰ کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی، اور حضرت موسیٰ ان کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔

صادق الایمان نوجوانوں کا جواب

فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ج رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ
”انہوں نے جواب دیا ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنانا۔“
ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ ”ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنانا۔“ بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ مگر اسی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیام

حق کے لئے اٹھتے ہیں تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیاں حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا اچھا خاصہ گروہ ہوتا ہے، جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی تاباں فرماں روائی کے مقابلے میں اقامت حق کی سعی کو غیر واجب، لا حاصل، یا طاقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے، کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے۔ اور ان لوگوں کو الٹا برسر باطل ثابت کر دے اور اپنے ضمیر کی اس خاش کو مٹائے جو ان کی دعوت اقامت دین حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا نفی طور پر پیدا ہو کر ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں۔ جو الگ کھڑے نماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا دوش آخر کار اسی طاقت کے حق میں ہوتا ہے جس کا پلہ بھاری ہے خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ اس صورت حال میں ان داعیاں حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لئے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہو گا اور آخر کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا۔ دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و اعمال سے پورے ہو رہے تھے، جن کی اجازت قراغز وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ منہ پر کرتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں یا مصائب و مشکلات کی سہارا نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے۔ بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا حادثہ ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لئے باطل سے چٹے رہنے کے برابر بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدتہائے دراز تک

۱۔ حق اور صداقت پر ثبات قدم رہیں اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال لینا گوارا نہ کریں، وہی دعوت حق کے علمبردار ہوتے ہیں۔

(الكهف: ١٣-١٢-١٥)

١٥ سورة الكهف ١٥

یہ وہ حالات ہیں جو اصحاب کہف کے چند نوجوان جب عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تو انہیں درپیش آئے۔ اصحاب کہف کا ایمان لانا اور کھل کر لوگوں کے سامنے بر ملا کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ”ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو بیجا بات کہیں گے“ پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم قوم اور گمراہ پیش کے لوگوں پر بھرپور تنقید کرتے ہیں کہ یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنائے بیٹھتی ہے یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ درپھر اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ صرف جھوٹ ہی نہیں بلکہ یہ بہت بڑا ظلم ہے، کیونکہ رب کائنات کو چھوڑ کر غیروں کو خدا بنانا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔

ان نوجوانوں کا یہ اعلان ”افس“ شہر میں تھا جو ایشیا کو چمک میں بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈاٹا دیوسی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دور دور سے لوگ اس کی پوجا کے لئے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے، شام فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کا رد بار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصہ حصہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے۔ رملہ حنظلہ ہو سائلو پیڈیا آف بائبیکل لٹریچر عنوان (EPOCH) شمرک اور ادبام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا، اس کا اندازہ اصحاب کہف کے اس فقرے سے کیا جاسکتا ہے جو اگلے رکوع میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اَتَّحَمُّنَ يٰظَلَمُوْا عَلٰیكُمْ يٰرْجُوْكُمْ اَوْ لِيُعِيْدُوْكُمْ فِیْ مَوٰتِهِمْ
وَلٰنْ تَفْلَحُوْا اِذَا اَبَدًا ۝ (الکھف: ۲۰)

اگر کہیں ان کا بلکہ ہم پر پڑ گیا تو بس سگسا رہی کہ مڑالیں گے، یا پھر

لَعَلَّہُمْ الْقُرْآنُ یَسْمُوْہُ الْکُفْرَ ۱۰

زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے اور ایسا ہوا تو ہم کبھی علاج نہ پاسکیں گے۔“

جب وہ خوب سوچ سمجھ کر ایمان لاتے ہیں اور ان سنگین حالات میں اعلان دیتے ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:-
وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝ وَرَبُّنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ ۝ اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے۔
یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں اور اپنے آپ کو خطر میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

اسباب کی بجائے اللہ پر اعتماد

اصحاب کہف کے ان نوجوان مسلمانوں کے ایمان اور اعلان حق سے دوسرا سبق جو ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ حق کو قبول کرنے والا دنیا کے ظاہری اسباب پر اعتماد نہیں رکھتا بلکہ اس کا اعتماد فی الحقیقت اللہ پر ہوتا ہے اور وہ حق پرستی کے لئے بظاہر ماحول میں کسی سازگار سی کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہ حق میں قدم اٹھادیتا ہے۔ اصحاب کہف کا صرف اللہ پر اعتماد جس قدر سازگار۔ حالات میں اعلان حق تھا اسی طرح جب وہ دعوت حق دیتے ہوئے ان مشکل حالات میں مبتلا ہوئے ہیں اور شہر انفس میں ان کا قیام ناممکن بنا دیا جاتا ہے تو ایک غار کی طرف پناہ لیتے ہوئے ان کی آپس کی گفتگو ایک نمایاں مثال ہے
وَإِذْ اَعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ فَأَوَّاهِيَ الْكَلْبُ يَنْشُرُكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئُ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مَرْفَاقًا ۝ (الکھف: ۱۶)

اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع

کرے گا اور تمہارے کام کے مرد سامان جہیا کر دے گا۔

اللہ کی غیبی امداد

اس واقعہ سے جو اصحاب کہف کے ضمن میں بیان ہوا ہے یہ سبق ملتا ہے کہ جس عادت جاوید، کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ کوئی بڑا کام نہیں کہ کسی کو دس سو برس سلا کر اس کو اس طرح اٹھا بٹھا تے بیسے وہ چند گھنٹے سویا ہو اور اس کی عمر، شکل، سدرت لباس، تند رستی، غرض کسی چیز پر بھی اس امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اسی طرح جب باطل قوتیں، اگر دنیا کی مادی طاقتیں، حملہ سامانِ حرب سے مسلح ہوں اور اس کے مقابل حق کے پاس کوئی مادی طاقت نہ ہو اور بظاہر مغلوبے کی کوئی بسورت نہ ہو لیکن جب حق کو حق سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور باطل کو باطل سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے اور باطل کی جگہ حق کو قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور باطل اپنی پوری قوت کے ساتھ زور آزمائی پر اتر آتا ہے اور بظاہر کوئی امکان نہیں نظر آتا ہے کہ حق جم کے گا، لیکن اللہ تعالیٰ معجزانہ طریقے سے حق کے قدم جما دیتا ہے اور باطل کے بادل غبار کی طرح چھٹ جاتے ہیں۔

حق و باطل کی کشمکش

سورہ کہف آیت ۸۲ تا ۹۰ میں حضرت موسیٰ اور عبد صالح رحمہما علیہما کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر میں نگاہ بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ

کی وہ مصیبتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا بھینٹا بھینٹا اور بے گناہوں کی تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرمان برداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکو کاروں کی خستہ حالی یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور محض اس لئے کہ لوگ ان کو نہیں سمجھتے ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دیوانہ جھیرنگری ہے، کوئی اس کا داجر نہیں اور بے توجہ چوہا ہے۔ یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانہ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے۔ اور کس طرح واقعات کا نظارہ ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو یہ مشاہدات کب کب آئے گئے ہوں گے۔ تو اس قصے پر غور کرنے سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دور میں کوائے گئے ہوں گے کیونکہ آغاز نبوت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اسی طرح کی تعلیم و تربیت دے کر رہا ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ کو ان مشاہدات کی حوزرت اس زمانے میں پیش آئی ہوگی جبکہ بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آرہا تھا۔ جن سے مسلمان کہہ معظفہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے واللہ اعلم، کہ اس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی

طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے، جو اس سے باز پرس کرنے والا ہو، اور ان کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ پکار اٹھے غصے کہ :-

رَبَّنَا اِنَّا لَكِ الْتَمَيْنَا فِرْعَوْنَ وَمَلَاكَ ذُنُوبًا وَاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
دُنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ج (یونس: ۸۸)

”اے پروردگار، تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لئے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟“

دعوتِ حق آزمائش

دعوتِ حق کو ابتدائی دور میں غیر مؤثر بنانے کے لئے تفسیک و استہزاء سے کام لیا جاتا ہے، پھر جھوٹے الزامات لگائے جاتے ہیں جب یہ حربے ناکام ہو جاتے ہیں تو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور جب یہ کارگر نہ ہوں تو پھر طمع اور مارچ دے کر داعیاں حق کو راستے سے ہٹایا جاتا ہے، جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے لے کر ظلم و ستم اور فتنہ کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تفسیک، استہزاء، الزامات جوڑ و ستم، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھہ بندی تک قیامت پہنچی، اس

کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :-

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَبَّارٍ ۖ أَن رَّآكَ اسْتَعْجِلَ ۚ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرَّجْعُ ۚ
أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۖ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۚ (العلق: ۶-۷-۸-۹-۱۰)

جیسے ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ (حالات) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے، تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ ۶۔

ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں اسلامی طریقہ پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابو جہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اس سے روکنا چاہا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بنی ہوتے کے بعد قبل اس کے کہ حضور اسلام کی اعلانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپ نے حرم میں اس طریقہ پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو آپ کو اللہ نے سکھائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس سے قریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں، دوسرے لوگ تو اسے ہجرت کی ہی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابو جہل کی آتش جاہلیت بھڑک اٹھی اور اس نے آپ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اس طریقے سے حرم میں عبادت نہ کریں، چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں جن میں ابو جہل کی ان بہبودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابو جہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا، "کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں، لوگوں نے کہا

ہاں، اس نے کہا: "لاٹ اور غرتی کی قسم" اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ یا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔" پھر ایسا ہوا کہ حضور کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے، اس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا کہ میرے اور ان کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پڑھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ قریب پہنچتا تو ملا کہ اس کے چہرے اڑا دیتے۔ (احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردودہ)

ابن عباس کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ اے محمد کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ اور اس نے آپ کو دھمکیاں دینی شروع کیں جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ بھڑک دیا اس پر اس نے کہا، اے محمد تم مجھے کس بل پر ڈراتے ہو، خدا کی قسم اس راوی میں میرے جاتی سب سے زیادہ ہیں (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردودہ)

مسلمہ اخلاق کی پامالی

قرآن مجید میں سورہ ہب ایک ایسا مقام ہے جہاں دشمنان اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے، حالانکہ مکہ میں بھی اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھے، سوال یہ ہے کہ اس دشمن کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی؟ اس بات کو سمجھنے کے

لئے ضروری ہے کہ اس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے اور اس میں ابوہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملک عرب میں، ہر طرف بد امنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، ادرسیلوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لئے اس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ کی حمایت کے سوا، جان و مال اور عزت آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لئے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلہ رحمی۔ (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا، عرب کی اپنی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور کی شدید مخالفت کی، لیکن بنی ہاشم اور بنی مطلب (ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے حالانکہ ان میں اکثر لوگ ایمان نہیں لائے تھے، قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضور کے ان خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہو، وہ اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ وہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو کسی حالت میں اس کے دشمنوں کے حوالہ نہیں کر سکتے، اور ان کا اپنے عزیز کی پشت پناہی کرنا قریش اور اہل عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اس اخلاقی اصول کو، جسے زمانہ جمالت میں عرب کے لوگ واجب الاسترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابوہب بن عبدالمطلب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، حضور کے والد ماجد۔

اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے، عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا خصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو، تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا، لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابن عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایات محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا، یا صباخاۃ (بلاتے صبح کی آفت) عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لئے آتے دیکھ لیتا تھا، حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے یہ دریافت کیا کہ یہ کیوں پکار رہا ہے، بتایا گیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہے، اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے، جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا اور جوند آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا، جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر پکارا، اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ نبأؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے، اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابوہب نے کہا۔ تَبَا لَكَ الْهَذَا جَمْعَتْنَا؟ ستیا ناس جائے تیرا، کیا اس لئے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے، (سند احمد - منجادی، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔

ابن زبید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا کہ اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان والوں کو ملے گا، اس نے کہا میرے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضور نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں، اس پر وہ بولا ثَبَّ لِهَذَا السَّيِّئِ ثَبًّا اِنَّ اَتَّخُوْنَ دَهْلًا سَوَاءً نَّاسٍ جَاءَتْ اس دین کا جس میں اور یہ سب دوسرے لوگ برابر ہوں۔ (ابن جریر)

مکہ میں ابولہب حضور کا قریب ترین ہمسایہ تھا، دونوں کے گھر ایک دیوار پر واقع تھے، اس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ) عقبہ بن ابی معیط، عدیہ بن حُمر، اور ابن اور صلاء الہندی بھی آپ کے ہمسائے تھے، یہ لوگ گھر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چین نہیں دیتے تھے، آپ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپ پر پھینک دیتے کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاط پھینک دیتے، حضور باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبدمناف، یہ کیسی ہمسائیگی ہے۔؟" ابولہب کی بیوی ام جلیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ طریقہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ مائٹوں کو آپ کے دروازے پر خاردار چھاڑیاں لاکر ڈال دیتی، تاکہ جمع سویرے جب آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے (یعنی، ابن ابی حاتم ابن جریر، ابن عساکر، ابن ہشام)۔

نبوت سے قبل آپ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عقبہ اور عقیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں، نبوت کے بعد جب حضور نے اسلام کی طرف دعوت دینے شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لئے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو، چنانچہ دونوں

اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے، عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا خصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو، تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا، لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابن عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایات محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا، یا صبا حاء (بلنے صبح کی آفت) عرب میں یہ صدا وہ شخص گاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لئے آتے دیکھ دیتا تھا، حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے یہ دریافت کیا کہ یہ کیوں پکار رہا ہے، بتایا گیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہے، اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے، جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا اور جوندہ آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا، جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر پکارا، اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی قہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ نبأؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خمر دار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے، اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابوہب نے کہا۔ تَبَا لَہُ اَلْہٰذِ اَجْمَعِیْنَ؟ ستیا ناس جائے تیرا، کیا اس لئے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے، (سند احمد - منہاجی، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔

ابن زبید کی روایت سے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا کہ اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان والوں کو ملے گا، اس نے کہا میرے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضور نے فرمایا اور آپ کی چاہتے ہیں، اس پر وہ بولا: ثَبَّ لِهَذَا السَّيِّئِ تَبًّا اِنَّ اَخْوَنَ دَهْشَلَةٍ سَوَاءٌ نَّاسُ جَانِّ

اس دین کا جس میں اور یہ سب دوسرے لوگ برابر ہوں۔ (ابن جریر) مکہ میں ابولہب حضور کا قریب ترین ہمسایہ تھا، دونوں کے گھر ایک دیوار پیچ واقع تھے، اس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ) عقیقہ بن ابی مقیط، عدیہ بن حمرہ، اور ابن اور صلاء الہندی بھی آپ کے ہمسائے تھے، یہ لوگ گھر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چین نہیں دیتے تھے، آپ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپ پر پھینک دیتے کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے، حضور باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبدمناف، یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟" ابولہب کی بیوی ام جمیل (بوسفیان کی بہن) نے تو یہ طریقہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ ماتوں کو آپ کے دروازے پر خاردار چھاڑیاں لاکر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپ کے پیچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے (سہیح) ابن ابی حاتم ابن جریر، ابن عساکر، ابن شہام،

نبوت سے قبل آپ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عقیقہ سے بیاہی ہوئی تھیں، نبوت کے بعد جب حضور نے اسلام کی طرف دعوت دی تو شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لئے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو، چنانچہ دونوں

نے طلاق دے دی، اور عقیبہؓ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ اور الَّذِي دَفَاكَ خَدَّيْ کا انکار کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے حضور کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا، حضور نے فرمایا، خدا اس پر اپنے کنتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے، اس کے بعد عقیبہؓ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا، دوران سفر ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں، ابوہب نے اپنے ساتھی اہل قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو کیونکہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کا خوف ہے، اس پر قافلے والوں نے عقیبہؓ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور پڑ کر سو رہے، رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر عقیبہؓ کو بھاڑ کھایا، (الاستیاب لابن عبد البر، الاصابہ لابن حجر، دلائل نبوة لابی نعیم الاصفہانی، روض الائف للشیخین روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملہ کو اعلان نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ثبت ید الیہب کے نزول کے بعد پیش آیا تھا، اس امر میں اختلاف ہے کہ ابوہب کا لڑکا عقیبہؓ تھا یا عقیبہؓ، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد عقیبہؓ نے اسلام قبول کر کے حضور کے دست مبارک پر بیعت کی تھی، اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عقیبہؓ تھا۔

اس کے جثہ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑتا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے نام و نشان ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لئے

تشریف لے جاتے یہ آپ کے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا، ربیعہؓ اپنے عہد السیّدی بیان کرتے ہیں کہ میں نور عمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالحجاز کے بازار میں گیا، وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے، "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے۔" اور آپ کے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھوٹا ہے، دین ابائی سے پھر گیا ہے" میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے، لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد - بیہقی) دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ بنی فلاں میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تا کہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لئے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔" آپ کے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عذابی سے پھیر کر اس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے، اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو، میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے، انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد - کلانی)

طارق بن عبد اللہ الحماری کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے، وہ کہتے ہیں میں نے ذوالحجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ "لوگو، لا الہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے۔" اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو۔" میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (ترمذی)

بنوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کا

معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے، تو نہایت ہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کی بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا، یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا، اور اس دوران میں نبی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی، مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لئے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ ہو گا اسے میں پورا کروں گا، چنانچہ وہ بے تحاشہ قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا، پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیز بازار کے جھاڑ خرید لیتا (ابن سعد وابن ہشام)

مشکلات میں سکینت

الْمَشْرِحُ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۖ
الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۖ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۖ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ فَإِذَا خَرُغْتَ فَأَنْصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝
(الشرح)

اے نبی! کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا، اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آواز بلند کر دیا پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، بے شک تنگی کے

کے ساتھ فراخی بھی ہے، لہذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب کی طرف راجع ہو۔

اس کا مقصد و مدعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، نبوت سے پہلے حضور کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جس کا سامنا نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرنے ہی یکایک آپ کو کرنا پڑا، یہ خود آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم تھا جس کا کوئی اندازہ آپ کو قبل نبوت کی زندگی میں نہ تھا، اسلام کی تبلیغ کیا شروع کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہی معاشرہ آپ کا دشمن ہو گیا جس میں آپ پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ ہی رشتہ دار، دوست، اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپ کو گالیاں دینے لگے۔ جو پہلے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، مکہ میں کوئی آپ کی بات سننے کا روادار نہ تھا، راہ چلتے آپ پر آوازے کسے جانے لگے، قدم قدم پر آپ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں، اگرچہ رفتہ رفتہ آپ کو ان حالات، بلکہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی۔ لیکن ابتدائی زمانہ آپ کے لئے نہایت دل شکن تھا۔ اسی بنا پر آپ کو تسلی دینے کے لئے پہلے سورۃ صغی نازل کی گئی اور پھر اس سورہ کا نزول ہوا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں ایک شرح صدر کی نعمت، دوسری یہ نعمت کہ آپ کے اوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو نبوت سے قبل آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا، تیسری رفع ذکر کی نعمت جو آپ سے بڑھ کر تو رکنا رہا آپ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔

اس کے بعد رب کائنات اپنے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور جس سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے کوئی

معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے، تو نہایت ہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کی بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا، یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا، اور اس دوران میں نبی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی، مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لئے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ ہو گا اسے میں پورا کروں گا، چنانچہ وہ بے تماشہ قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا، پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیز بازار کے بھاؤ خرید لیتا (ابن سعد و ابن ہشام)

مشکلات میں سکینت

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۚ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۚ
اَلَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۚ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۚ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ
يُسْرًا ۚ فَاِذَا خَرُغْتَ فَاَنْصَبْ ۚ وَالْاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝
(الشرح)

اے نبی! کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا، اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آواز بلند کر دیا پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، بے شک تنگی کے

کے سامنے فراختی بھی ہے، لہذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب کی طرف راجع ہو۔

اس کا مقصد و مدعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، نبوت سے پہلے حضور کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جس کا سامنا نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرتے ہی ایک ایک آپ کو کرنا پڑا، یہ خود آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم تھا جس کا کوئی اندازہ آپ کو قبل نبوت کی زندگی میں نہ تھا، اسلام کی تبلیغ کیا شروع کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہی معاشرہ آپ کا دشمن ہو گیا جس میں آپ پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ ہی رشتہ دار، دوست، اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپ کو گالیاں دینے لگے۔ جو پہلے آپ کو ماتحتوں یا تھ لیتے تھے، مکہ میں کوئی آپ کی بات سننے کا روادار نہ تھا، راہ چلتے آپ پر آوازے کسے جانے لگے، قدم قدم پر آپ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں، اگرچہ رفتہ رفتہ آپ کو ان حالات، بلکہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی۔ لیکن ابتدائی زمانہ آپ کے لئے نہایت دل شکن تھا۔ اسی بنا پر آپ کو تسلی دینے کے لئے پہلے سورۃ صغی نازل کی گئی اور پھر اس سورہ کا نزول ہوا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں ایک شرح صدر کی نعمت، دوسری یہ نعمت کہ آپ کے اوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو نبوت سے قبل آپ کی مکر توڑے ڈال رہا تھا، تیسری رفع ذکر کی نعمت جو آپ سے بڑھ کر تو رکنا رہا آپ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔

اس کے بعد رب کائنات اپنے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور جس سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے کوئی

بہت لمبا دور نہیں ہے بلکہ اس تنگی کے ساتھ ہی ساتھ فراخی کا دور بھی لگا چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ ضحیٰ میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ آپ کے لئے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا اور غریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ آخر میں حضور کو ہدایت کی گئی ہے کہ ابتدائی دور کی ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپ فارغ ہوں تو عبادت کی مشقت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لو لگائیں۔

مزید فرمایا گیا۔

إِنَّا عَطَيْنَاكَ الْكُوفَةَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۚ إِنَّ شَانِئَكَ
هُوَ الْأَعْتَرُ ۚ (الکوثر)

اے نبی ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا، پس تم اپنے رب ہی کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔ اس سے پہلے سورہ ضحیٰ اور سورہ الم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضور اور آپ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دور دور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اس وقت آپ کو تسلی دینے اور آپ کی ہمت بندھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں سورہ ضحیٰ میں فرمایا وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۚ

لے تفہیم القرآن، سورہ کوثر

اور یقیناً تمہارے لئے بعد کا دور (یعنی ہر بعد کا دور) پہلے دور سے بہتر ہوتا ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔ اور اہم نشرح میں فرمایا کہ ذَرَعْنَا ذٰلِكَ فَكُنْكَ۔ "اور ہم نے تمہارا آوازہ بلند کر دیا یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے ان کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرتے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے، اور فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنْ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔" یعنی اس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورہ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضور کو تسلی بھی دی اور آپ کے خائفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیش گوئی بھی فرمائی قریش کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں۔ اور ان کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار، انسان کی سی ہو گئی ہے، عکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضور بنی بنائے گئے اور آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے بَكَوْهُمُذُنًا۔ (ابن جریر) یعنی محمد اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت جڑ سے کٹ گیا ہو، اور متوقع یہی ہو کہ کچھ مدت بعد وہ سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے گا، محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا۔ "اجی چھوڑو انہیں، وہ تو ایک اتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں ان کی کوئی تربیہ اولاد نہیں، مہرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں ہو گا شمر ابن عطیہ کا بیان ہے کہ عتقہ ابن ابی معیط بھی ایسی ہی باتیں بالعموم کیا کرتا تھا یہی باتیں ابولہب بھی حضور اکرم کے صاحبزادے کے انتقال پر کرتا پھرتا تھا کہ اب محمد کی جڑ کٹ گئی ہے۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورہ کوثر حضور پر نازل کی گئی
قریش اس لئے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی (عبادت کرتے
تھے) اور ان کے شرک کو آپ نے علانیہ رد کر دیا تھا، اسی وجہ سے پوری قوم
میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چین بیگا
تھا، اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے، اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک
بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں
قبیلے اور برادری کے لوگوں اور مہالیوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کی بجائے
خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور ایسی باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف
انسان کے لئے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے
ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مختصر ترین
سورہ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دنیا کے کسی
انسان کو کبھی نہیں دی گئی، اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی سنایا گیا کہ آپ کی مخالفت
کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں حضور اکرم دعوتِ دین اور اس کے تقاضے پورے کر رہے تھے۔
آنے والے ایام میں جو لوگ بھی دعوتِ دین کا علم اٹھائیں، انہیں یہ تقاضے پورے
کرنے ہی ہوں گے۔

آزمایش اوراستقامت

ابتدائیہ

جب تک کوئی نظام حیات اپنے محض نگرہی اور تصوراتی دور میں ہوتا ہے نظام غالب اس کے وجود سے عموماً آشنا نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ زندگی کی اس شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب پروانوں کا یہ اجتماع کچھ غیر معمولی سی صورت حال پیدا کر دیتا ہے اور معاملات پر اپنی جداگانہ نظر کھلم کھلا ڈالنے لگتا ہے تو نظام غالب چونکتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس جنگل میں ایک دوسرا شیر بھی پل رہا ہے جسے ختم کئے بغیر اس کی راج دھانی کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کے سارے نیکلے ناخن نکال کر اس پر چھپتا ہے یہیں سے اس تحریک کا دورا ابتلا شروع ہو جاتا ہے یہیں سے وہ دعوت ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ کاروان نو اپنی مسافت کی سب سے زیادہ پر صعوبت منزل میں داخل ہو جاتا ہے یہیں اس کی زندگی یا موت اور کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ ہوتا ہے یہیں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور زمانہ یہ فیصلہ کرنے پر تل جاتا ہے کہ انسانوں کو اس نئے سانچے میں ڈھلنا ہے یا اس سانچے کو توڑ پھوٹ کر پھینک دینا ہے۔

ابتلا کے اس دور میں الہی ہدایات پر چلنے والی تحریکیں اور انسانی فکر کی محتاج تحریکیوں کے انداز برداشت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اور یہی دور ان کے فرق کو بہت زیادہ نمایاں کرنے والا ہوتا ہے اخلاقی اقدار کے قیام کو انقلاب کا مقصود قرار دینے والی تحریکیں پر جب دورا ابتلا آتا

ہے تو ان کے کارکنوں کا اپنے مالک و آتما کی طرف رجوع پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے ان کا تعلق جہاں و زمان کے پروردگار سے اور زیادہ قریبی ہو جاتا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو آزمائے رہا ہے کہ وہ اپنے نصب العین سے کتنی گہری نسبت اور اپنے مقصد سے کتنا پختہ عشق رکھتے ہیں وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو ضائع کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی کھوٹ کو آزمائش کی بھیڑ میں تیار کر لکال دینا چاہتا ہے تاکہ ان کے دامن سے ذاتی خواہشات اور دنیا طلبی کے سارے دھبے دھل جائیں اور قلب کی لوح پر خدا نے واحد کی پرستش کے نقش کے سوا اور کوئی نقش باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ ایسی تحریک کے کارکنوں پر حیب کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ مالوسی بکھلا بٹ بدحواسی اور شکست خوردگی کے جذبات سے قطعی بالاتر رہتے ہیں اور خلوص نیت کی جس نسبت سے انہوں نے اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کو اس کام میں لگایا ہو تب اسی نسبت سے وہ اپنی فطری کمزوریوں سے پاک رہتے ہیں بلکہ ان کے پاس کامیابی اور ناکامی کو ٹولنے کی وہ ترازو نہیں ہوتی جو عموماً دنیا میں رائج نظر آتی ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نصب العین کی راہ میں کتنا کچھ لٹایا ہے پھر مینا کچھ انہیں لٹنا نظر آتا ہے اتنا ہی وہ اپنے نفع کے کھاتے میں درج کر لیتے ہیں جو کچھ وہ اس راہ میں لٹاتے ہیں اسی قدر وہ اپنا بوجھ ہلکا محسوس کرتے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر امانت ادا ہو گئی اسی قدر سہرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر اس راہ میں ان کی جان بھی چلی جائے تو ان کے لبوں پر دم واپس ہی ہونے لگے کہ
 سہ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آزمائش جب ان کے چاروں طرف منڈلانے لگتی ہے تو جہاں وہ آزمائش سے پناہ اور ضروری قلب کے ساتھ اپنے رب سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی راہ میں ثابت قدمی عطا کرے وہیں دوسروں کو محبوب حق کی راہ میں آزمائش میں مبتلا ہوتے اور عشق کے مقامات طے کرتے ہوئے دیکھ کر شک سے ان کا سینہ معمور ہو جاتا ہے اور وہ تمنا کرتے ہیں

کہ ان کا محبوب ان کو بھی قابلِ اغننا سمجھے۔ ان کو بھی اس قابلِ جانے کہ ان کی راہ میں کانٹے بچھیں اور ان پر آوازے کسے جائیں ان کی رگوں کا خون بھی اس کی راہ کی گرد کو تر کرے اور ان کا سینہ بھی اس راہ میں چلنے کے جرم میں زخموں سے خونچکاں ہو یہ تمنا ان کو بستروں پر تڑپاتی ہے کہ ان کا بستر ان کا ٹٹوں سے معمور کیوں نہ ہو جو ان کے حبیب کی راہ میں بچھائے گئے اور راستوں کے پتھروں کا وہ نشاۃ کیوں نہ بنائے گئے جو مصائب راہِ حبیب میں چلتے ہوئے دوسروں کو نصیب ہوئے ان سے وہ آخر کس نااہلی کی بنا پر بہرہ مند اور لذتِ آشنا نہ ہو سکے انہیں دہم ہونے لگتا ہے کہ کہیں محبوب نے انہیں ترک کر عیار تو نہیں قرار دے دیا کہ ان کی طرف کسوٹی نہیں بڑھائی گئی اور انہیں درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔

ابتلا کا دور گویا کسی تحریک کے کارکنوں کے لئے چھان پھٹک کا دور ہوتا ہے جس طرح ایک کسان اپنے کھلیان میں گہیوں کی بالوں کو پیہم کل کل کر اناج اور بھس کو علیحدہ علیحدہ کر دیتا ہے اسی طرح ابتلا کا دور بھی کسی نصب العین کے دعویداروں کے انبار کو چھان پھٹک اور کل کل کر گندم اور بھس، مقصد کے شیدائیوں اور خواہشِ نفس کے پرستاروں کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ ابتلا کی یہ پیش تحریک کے سارے آماس کو ختم کر کے اس کی اصل فرہی کو نمایاں کر دیتی ہے یہ قصہ گندے خون کے سارے مواد کو نکال کر جسم میں صرف صالح خون ہی باقی رہنے دیتا ہے اس دور سے گزر کر تحریک ایک نئی توانائی لیکر آگے بڑھتی ہے جیسے بیمار غسلِ صحت کے بعد تازہ دم ہو کر بستر سے اٹھتا ہے اس آگ سے گزر کر ملمع اور زرخالص ایک ہی پھیلی میں رکھے نہیں رہ سکتے دونوں کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے اور اسی حیثیت کے مطابق دونوں کا کام متعین ہو جاتا ہے۔

تاریخ میں آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی نے انالٹھ کا لغو لگایا ہو اور اس کے سامنے دار کا تختہ نہ کھڑا کیا گیا ہو کسی نے وقت کے دریا کی مخالفت سمت میں تیرنے کی کوشش کی ہو اور حالات کی تیز رفتاریوں نے اسے الٹا اٹھا کر بہاؤ پھینچ دینے کی

کوشش نہ کی ہو اور کسی نے بت خانے کے آداب کو توڑا ہو اور اسے آگ میں نہ جھونکا گیا ہو۔ جب بھی کبھی کسی نے ایسی جہالت کی ہے، غاصب تو توں نے اس کا راستہ روکنے کی انتہائی کوشش کی ہے، زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر کے جان لیوا مقابلہ کیا ہے اور ایک بار تو نئی فکر کے علمبرداروں کو اپنے استبداد کے شکنجے میں کس کر ان کا پورا خون پھوڑ دیا ہے۔

پھر باطل تو ممکن ہے کہ غیر خالص زر بھی قبول کر لے، اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی جھوٹ اور کذب پر اٹھتی ہے زندگی کے غلط زادیوں کو نمایاں کرنے کی دعوت ہی لے کر وہ اٹھتا ہے۔ وہ انہیں مسائل کا احاطہ کرتا ہے جو زندگی کو صراطِ مستقیم سے ہٹکا دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر جھوٹ اور فکری گمراہی کے پاس ذوقِ لطیف اور اتنی نفاست کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں پوری پوری تمیز کر سکیں تو ان کی حمیت اور غیرت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ اس تمیز کے تقاضوں کو پورا کر سکیں پھر باطل نمود و نمائش کے لئے لکڑی کے کندوں کو بھی دردی پہنا کر میدانِ جنگ میں اپنے سپاہیوں کی گنتی بڑھانے کے لئے لاسکتا ہے۔ وہ ان کرائے کے لوگوں کے کندھوں پر بھی اپنی بندوقیں رکھ سکتا ہے جن کے دل اس کے ظلم و تشدد سے نالال ہوں لیکن حق تو اتنا باریک میں واقع ہوا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنی فوجی خدمات سے بری قرار دے دیتا ہے جو چاہے اس کی ریاست کی وفاداری کا عہد کریں لیکن اس کے بنیادی اصولوں سے متفق نہ ہوں جبر و اکراہ کا اس کے ہاں سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو رغبت، طلب، نرپ بلکہ جنون دیکھا جاتا ہے اور جس کے پاس جنون ہے وہ ہی اس کی پھیلی کاسب سے کھرا سکتا ہے۔

انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کے معاملات میں جب اتنا دور اندیش واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کی تمیز کے لئے کئی طرح کے معیار رکھتا ہے معمولی دوستی کے لئے وہ دوسرے میں ایثار، خلوص، ہمدردی اور وقت پڑنے پر کام آنے کے جذبے کو جانچتا ہے معمولی سودا خریدنے کے لئے دو سو بار مال کو

دیکھتا جا پہنچتا اور پرکھتا ہے اور اس وقت تک نہیں خریدنا جب تک مال کے کھرا ہونے اور اسے دیئے جانے والے سکے کی قیمت کے مطابق نہیں سمجھ لیتا تو آخر حق ایسا بے بصر کا ہک کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کے کھرے کھوٹے مال سے دامن بھر لے اور ہر قسم کے انسان سے اپنے پُر اعتماد و دوستانہ تعلقات قائم کر لے۔ ایک معمولی بے شعور کل کی خبر سے بے خبر انسان جب اپنی دوستی سے پہلے دوسرے انسان کو پرکھتا ہے، وقت پڑنے پر کام آنے کی صفت کو دیکھتا ہے تب اس پر اعتماد کرتا ہے تو پھر جس کی نفاس طبع اور حمیت سے بڑھ کر نفاست اور حمیت دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی وہ کیسے ان صفات کو دیکھے پرکھے اور جانچے بغیر قبول کر سکتا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لائے والوں پر گزر چکی ہے۔ ان پر سختیاں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی صحیح اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟“ (بقرہ ۲۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سے سستے چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے تلبی تعلق نہ رکھا،“ (توبہ ۲)

”اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے جب اللہ کی راہ میں نہیں سنایا کیا تو انسانوں کے ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے، حالانکہ اگر نیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ اُک کر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے واقف نہیں ہے، مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہے اور منافق کون،“ (مائدہ ۱)

چنانچہ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لئے کہ اللہ کی راہ میں چلتا پھولوں کی سبج پر چلنا نہیں ہے بلکہ ایک وادی پر خارا میں قدم رکھنا ہے اور اس وادی کے کانٹوں کے لئے اپنے تلووں کو پیش کر دینا ہی حقیقت میں اصل مراد کا پالینا ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا

کوشش نہ کی ہو اور کسی نے بت خانے کے آداب کو توڑا ہو اور اسے آگ میں نہ جھونکا گیا ہو جب بھی کبھی کسی نے ایسی جہالت کی ہے، غاصب قوتوں نے اس کا راستہ روکنے کی انتہائی کوشش کی ہے، زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر کے جان لیوا مقابلہ کیا ہے اور ایک بار تو نئی فکر کے علمبرداروں کو اپنے استبداد کے شکنجے میں کس کر ان کا پورا خون پھوڑ دیا ہے۔

پھر باطل تو ممکن ہے کہ غیر خالص زر بھی قبول کر لے، اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی جھوٹ اور کذب پر اٹھتی ہے زندگی کے غلط زادیوں کو نمایاں کرنے کی دعوت ہی لے کر وہ اٹھتا ہے، وہ انہیں مسائل کا احاطہ کرتا ہے جو زندگی کو صراطِ مستقیم سے جھٹکنا تو لے ہوتے ہیں، پھر جھوٹ اور فکری گمراہی کے پاس ذوقِ لطیف اور انسانی نفاس کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں پوری پوری تمیز کر سکیں تو ان کی حمیت اور عزت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ اس تمیز کے تقاضوں کو پورا کر سکیں پھر باطل نمود و نمائش کے لئے لکڑی کے کندوں کو بھی دردی پہنا کر میدانِ جنگ میں اپنے سپاہیوں کی گنتی بڑھانے کے لئے لاسکتا ہے، وہ ان کرائے کے لوگوں کے کندھوں پر بھی اپنی بندوقیں رکھ سکتا ہے جن کے دل اس کے ظلم و تشدد سے نالام ہوں لیکن حق تو اتنا باریک میں واقع ہوا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنی فوجی خدمات سے بری قرار دے دیتا ہے جو چاہے اس کی ریاست کی وفاداری کا عہد کریں لیکن اس کے بنیادی اصولوں سے متفق نہ ہوں جبر و اکراہ کا اس کے ہاں سوال ہی نہیں ہے، یہاں تو رجعت، طلب، نرپ بلکہ جنوں دیکھا جاتا ہے اور جس کے پاس جنون ہے وہ ہی اس کی پھیلی کاسب سے کھر اسکتا ہے۔

انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کے معاملات میں جب اتنا دور اندیش واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کی تمیز کے لئے کئی طرح کے معیار رکھتا ہے معمولی دوستی کے لئے وہ دوسرے میں ایثار، خلوص، ہمدردی اور وقت پڑنے پر کام آنے کے جذبے کو جانچتا ہے معمولی سودا خریدنے کے لئے دو سو بار مال کو

دیکھتا جاہنچا اور پرکھتا ہے اور اس وقت تک نہیں خریدنا جب تک مال کے کھرا ہونے اور اسے دیئے جانے والے سکے کی قیمت کے مطابق نہیں سمجھ لیتا تو آخر حق ایسا بے بصر گاہک کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کے کھرے کھوٹے مال سے دامن بھر لے اور ہر قسم کے انسان سے اپنے پُر اعتماد و دوستانہ تعلقات قائم کر لے۔ ایک معمولی بے شعور کل کی خبر سے بے خبر انسان جب اپنی دوستی سے پہلے دوسرے انسان کو پرکھتا ہے، وقت پڑنے پر کام آنے کی صفت کو دیکھتا ہے تب اس پر اعتماد کرتا ہے تو پھر جس کی نفاست طبع اور حمیت سے بڑھ کر نفاست اور حمیت دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی وہ کیسے ان صفات کو دیکھے پرکھے اور جانچے بغیر قبول کر سکتا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت نوگذری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے۔ ان پر سختیاں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی صحیح اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟“ (بقرہ ۲۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قبل تعلق نہ رکھا،“ (توبہ ۲)

”اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے جب اللہ کی راہ میں نہیں سنایا گیا تو انسانوں کے ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے، حالانکہ اگر نیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ اگر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے واقف نہیں ہے، مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہے اور منافق کون،“ (مائدہ ۱۰)

چنانچہ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لئے کہ اللہ کی راہ میں چلنا پھولوں کی سبج پر چلنا نہیں ہے، بلکہ ایک وادی پر خار میں قدم رکھنا ہے اور اس وادی کے کانٹوں کے لئے اپنے تلووں کو پیش کر دینا ہی حقیقت میں اصل مراد کا پالینا ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا

جس کے پاؤں راہِ خدا میں گروا لود ہوں ان کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی،
یہاں گروا لود ہونے سے مراد محض پاؤں پر گرو پڑ جانا ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ
میں مصائب کو برداشت کرتے ہوئے اس کی راہ میں آگے ہی بڑھے جانا ہے اور
اپنے حقیقی نصب العین کی راہ میں پیہم جدوجہد کئے جانا ہے۔
حضرت جناب سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرت کی خدمت میں اپنی مشکلات کی
شکایت کی اس حالت میں کہ آپ کبھی کے سائے میں چادر پر ٹیک لگائے تشریف فرما
تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ہم مشرکین کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ ہم نے کہا: کیا آپ
ہمارے لئے مدد طلب نہ کریں گے؟

آپ نے فرمایا، تم سے پہلوں کا یہ حال ہوا کہ مومن مرد کو پکڑا جاتا اور زمین میں
گرہا کھود کر اس میں اسے ڈال دیا جاتا پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ دیا جاتا
اور دو ٹکڑے کر دیئے جاتے اور گوشت بڈیوں میں لوہے کی کنگھیاں پھیر دی جاتیں
لیکن یہ سب کچھ اسے راہِ حق سے باز نہ رکھتا۔ بخدا اللہ اس کام کو پورا کر کے
رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعاؤ میں سے حضرت موت تک سفر کر لے گا اور اسے
خدا کے سوا اور کبریوں پر بھیڑیے کے حملے کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم
جلد بازی سے کام لے رہے ہو،

غرض یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اقامت دین جیسے بلند ترین مقصد کو لیکر
اٹھے لیکن اس کے خوف کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک عشقِ الہی سے معمور
ہے لکن کی کتنی مقدار اسے حاصل ہے، اپنی خواہشات نفس کی کتنی قربانی وہ دے
سکتا ہے، چنانچہ اگر ہم تاریخ کے ان تمام اقدار پر سرسری نظر ڈالیں جن میں راہِ
حق میں جدوجہد کرنے والوں کے کارنامے ہمیں قدرے صاف نظر آتے ہیں
تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جس کسی نے بھی دعوائے عشق کی اس کے سامنے وار و سن
کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا گیا، اس امتحان میں کامیابی حاصل کئے بغیر کسی کو اس راہ میں قدم
بڑھانے کا پروانہ راہِ جاری نہ ہو سکا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں خدا کے بندوں

نے جو جو کھن امتحان پاس کئے وہ تاریخ عزیمت کے درختوں باب میں جنہیں انسانیت قیامت کے روز فخر کے ساتھ داور محشر کے روبرو پیش کر سکتی ہے۔

استقامت حضرت نوحؑ کی نو سو سالہ دعوت حق سے کون باخبر نہیں ہے عشق الہی کی اس مے مردانگی کا کون حریف ہو سکتا ہے جس کا نشہ مسلسل نو سو پچاس سال تک اترنے پایا اور اسی قوم میں مسلسل کام کرتے کرتے اور صالح انقلاب کے لئے تمام راہیں مسدود پانے کے باوجود ایمانہ صبر اس وقت تک لبر نہ ہوا جب تک مشیت نے اس خطہ زمین کو ہی عذاب المناک سے لبر نہ کر دیا کسی قوم اور اس کے لوگوں کے درمیان ایک ہی پیام حق نو صدیوں تک پہنچاتے رہنا پتھر کھاتے رہنا پاگل اور دیوانہ کہلاتے رہنا۔ حق کی لذت اور اس سے وابستگی کا ایک عظیم مظاہرہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی صبر و استقلال کا گویا ہمالہ ہے جسے مخالفت میں کام کرنے والی انسانی مساعی توڑ نہیں سکتیں طوفان آتا ہے اور وہ لوگ جو حق کے اس کسان کی مسلسل محنت کے باوجود جھاڑ جھنکار سے زیادہ اپنی وقعت ثابت نہ کر سکے تھے عرق جوشے لگتے ہیں اور انہیں میں اس کا بیٹا بھی ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوا پلا بڑھا اور جوان ہوا ہے۔

”بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ کشتی میں آ جاؤ۔ آج کے دن خدا کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں ہے“ باپ اپنے بیٹے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر اسے لپکا رہا ہے۔ اور جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے کہ وہ تو ایک ”عمل غیر صالح“ ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے تو پھر وہ عظیم رہنما گڑ گڑا کر اپنے رب سے استغفار کرتا ہے اس بات پر کہ اس نے اس بیٹے کے ساتھ خفیف سی تلبی لاگ بھی کیوں رکھی جسے حق کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی عذاب سے بھرپور تھپیڑے کے ساتھ ایک لہر بیٹے کو باپ کی آنکھوں کے سامنے بہا لے گئی لیکن باپ استغفار ہی کرتا رہا کہ اس نے اپنے رب سے وہ کیوں چاہا جسے اس کا رب نہ جانتا تھا اس لئے کہ

جس کے پاؤں راہِ خدا میں گرد آلود ہوں ان کو دوسخ کی آگ نہ چھوئے گی،
یہاں گرد آلود ہونے سے مراد محض پاؤں پر گرد پڑ جانا ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ
میں مصائب کو برداشت کرتے ہوئے اس کی راہ میں آگے ہی بڑھے جانا ہے اور
اپنے حقیقی نصب العین کی راہ میں پیہم جدوجہد کئے جانا ہے۔
حضرت جناب سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرتؐ کی خدمت میں اپنی مشکلات کی
شکایت کی اس حالت میں کہ آپؐ کچھ کے سائے میں چادر پر ٹیک لگائے تشریف فرما
تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ہم مشرکین کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ ہم نے کہا: کیا آپ
ہمارے لئے مدد طلب نہ کریں گے؟

آپؐ نے فرمایا، تم سے پہلوں کا یہ حال ہوا کہ مومن مرد کو پکڑا جاتا اور زمین میں
گرہا کھود کر اس میں اسے ڈال دیا جاتا پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ دیا جاتا
اور دو ٹکڑے کر دیئے جاتے اور گوشت بڈیوں میں لوہے کی گنگھیاں پھیر دی جاتیں
لیکن یہ سب کچھ اسے راہِ حق سے باز نہ رکھتا۔ بخدا اللہ اس کام کو پورا کر کے
رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعا دین سے حضرت موت تک سفر کر لے گا اور اسے
خدا کے سوا اور کبریوں پر بھیڑیئے کے حملے کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم
جلد بازی سے کام لے رہے ہو،

غرض یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اقامت دین جیسے بلند ترین مقصد کو لیکر
اٹھے لیکن اس کے خوف کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک عشقِ الہی سے معمور
ہے۔ لکن کی کتنی مقدار اسے حاصل ہے، اپنی خواہشات نفس کی کتنی قربانی وہ دے
سکتا ہے، چنانچہ اگر ہم تاریخ کے ان تمام اودار پر سرسری نظر ڈالیں جن میں راہ
حق میں جدوجہد کرنے والوں کے کارنامے ہمیں قدرے صاف نظر آتے ہیں
تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جس کسی نے بھی دعوائے عشق کیا اس کے سامنے دار و دار
کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا گیا۔ اس امتحان میں کامیابی حاصل کئے بغیر کسی کو اس راہ میں قدم
بڑھانے کا پروانہ راہِ جاری نہ ہو سکا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں خدا کے بندوں

نے جو جو کٹھن امتحان پاس کئے وہ تاریخ عزیمت کے درختوں باب میں جنہیں انسانیت قیامت کے روز فخر کے ساتھ داور محشر کے روبرو پیش کر سکتی ہے۔

استقامت حضرت نوحؑ کی نو سو سالہ دعوت حق سے کون با خبر نہیں ہے عشق الہی کی اس بے مردانگی کا کون حریف ہو سکتا ہے جس کا نشہ مسلسل نو سو پچاس سال تک اترنے پایا اور اسی قوم میں مسلسل کام کرتے کرتے اور صالح انقلاب کے لئے تمام راہیں مسدود پانے کے باوجود بیہمانہ صبر اس وقت تک لبر نہ ہوا جب تک مشیت نے اس خطہ زمین کو ہی عذاب المناک سے لبر نہ کر دیا کسی قوم اور اس کے لوگوں کے درمیان ایک ہی پیام حق نو صدیوں تک پہنچاتے رہنا پتھر کھاتے رہنا پاگل اور دیوانہ کہلاتے رہنا۔ حق کی لذت اور اس سے وابستگی کا ایک عظیم مظاہرہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی صبر و استقلال کا گویا ہمالہ ہے جسے مخالفت میں کام کرنے والی انسانی مساعی توڑ نہیں سکتیں طوفان آتا ہے اور وہ لوگ جو حق کے اس کسان کی مسلسل محنت کے باوجود جھاڑ جھنکار سے زیادہ اپنی وقعت ثابت نہ کر سکے تھے عرق جوںے لگتے ہیں اور انہیں میں اس کا بیٹا بھی ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوا پلا بڑھا اور جوان ہوا ہے۔

”بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ کشتی میں آ جاؤ۔ آج کے دن خدا کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں ہے“ باپ اپنے بیٹے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر اسے لپکا نہا ہے۔ اور جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے کہ وہ تو ایک ”عمل غیر صالح“ ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے تو پھر وہ عظیم رہنما گڑا گڑا کر اپنے رب سے استغفار کرتا ہے اس بات پر کہ اس نے اس بیٹے کے ساتھ خفیف سی تلبی لاگ بھی کیوں رکھی جسے حق کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی عذاب سے بھرپور تھپیڑے کے ساتھ ایک لہر بیٹے کو باپ کی آنکھوں کے سامنے بہا لے گئی لیکن باپ استغفار ہی کرتا رہا کہ اس نے اپنے رب سے وہ کیوں چاہا جسے اس کا رب نہ چاہتا تھا اس لئے کہ

رشتہ تو وہ ہے جسے پروردگار قائم کرے نہ کہ وہ جسے لوگ رشتہ سمجھیں۔
اللہ کا حق کہہ کر لو کھلا دیا کہ میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے
مغرب سے نکال، تو عراق کی سرزمین ان کے لئے تنگ ہو گئی راہیں آگ میں جھونک
دینے کے منصوبے بن گئے، خدائی کے دعویداروں کو حقارت سے ٹھکرا دینے کا یہ نتیجہ
تھا جو دعوائے بندگی، حق کا حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا تھا اب اس کے امتحان کے
یہ سامان تھے رپورا خاندان بھڑوں کا چھتہ بن گیا تھا پوری قوم کاٹنے کو دوڑتی تھی
آگ میں جھونکے گئے اور بالآخر وطن سے بے وطن ہو کر بادیر پیائی کرنی پڑی باؤ
پیائی کے ایک طویل دور کے بعد بیٹے کی قربانی کا مطالبہ ہوا اور باپ نے اپنے رب
کے حکم کے مطابق چھری تیز کر کے بیٹے کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر اسے اوندھے
منہ زمین پر لٹا دیا یہ واقعہ آسمان کے نیچے اس رشتہ اور ناتہ کی زمین پر پہلی اور آخری
بار ہوا پوری کائنات دم بخود تھی کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ حیران تھے جنہوں
نے خدا کی زمین میں ابن آدم پر فساد کا الزام لگایا تھا کہ یہ انسان خدا کی محبت اور
اطاعت میں اتنا غرق بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیٹے کے حلق پر چھری چلا دینے پر بھی
تیار ہو جائے اور خدا کی اطاعت و محبت کی تاریخ میں انسانیت نے یہ نمایاں
ترین سنگ میل نصب کر دیا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نہ ہاتھ مٹھائے نہ آواز
کا بپی نہ لہرہ طاری ہوا اور چھری چل گئی۔ اس چھری نے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ ابن
آدم خدا کی اطاعت میں ہر رشتے پر ہر متاع عزیز اور کائنات کی ہر دولت بے بہا
پر چھری چلا سکتا ہے۔ انسانیت نے راہ حق میں قربانی اور ایثار کا ایک معیار قائم کر
دیا اور اس معیار پر انسانیت ہمیشہ فخر کر سکے گی، محبوب کی طرف سے آئیو لے ابلہ کو
دونوں ہاتھوں سے سینے سے لگانا حق سے ثابت قدمی اور استقامت کی توفیق چاہنا
اور آئیو لے امتحان میں اپنی ساری متاع حیات جھونک دینا یہی وہ طریق کار ہے
جسے مومن کا ایمان اختیار کرنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بھی ایک طویل دور ابتلا سے گزرنا پڑا اور اس لئے کہ ابتلا سزا نہیں ہے پر کھبے اگر یہ سزا ہو تو پیغمبروں پر بھی نہ آئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کا کوئی بندہ جتنا اس کے نزدیک برگزیدہ ہو اسی قدر سخت ابتلا میں اسے مبتلا کیا گیا۔ جتنا اونچا اس کا درجہ ہوا اتنا ہی کڑا امتحان اس کا لیا گیا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں پر فرعون نے مصر کی زمین تنگ کر دی۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جاتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا۔ اس طرح پوری قوم کی نسل کشی کے پروگرام پر ایک عرصہ تک عمل کیا جاتا رہا۔ بنی اسرائیل سے بدترین برتاؤ کیا جاتا۔ حضرت موسیٰ پر جادو گروں کی ایک بھیڑ اپنے تمام جہتوں، منبروں اور شعبہ بازیوں کے ساتھ چڑھ آئی اور اسی وقت طلحہ حق نے باطل کو پوری طرح شکست دے دی۔

حضرت عیسیٰ کو روم کے قیصر اور یہودیوں کی ماتحت ریاست سے سابقہ پڑا یہ وقت تھا جب فریسیوں اور صدوقیوں کا طوطی بولتا تھا اور انہوں نے تورات میں تحریف کرتے کرتے اسے اپنی خواہشات کا تصدیق نامہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ سیدنا عیسیٰ کی دعوت حق کا آغاز ہوتے ہی یہ لوگ شہید کی کھیتوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ دعوت اسلامی میں انہیں اپنے اقتدار کی موت اور کتاب الہی میں اپنی تحریفات کا پول کھلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر فریسی اور فقیہ کو اپنی اپنی گدی اس دعوت کے سیل میں بہتی نظر آتی تھی۔ ہر مفاد پرست دین باز کے نزدیک اس دعوت کی موجودگی میں اس کا کاروبار چلتا نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ دعوت کے آغاز میں ہی ان کے فتنوں کے بند ٹوٹ گئے اور ان کے مکرو فریب کے جال پھ گئے اس طرح سیدنا عیسیٰ کی دعوت کا آغاز ہی ابتلا سے ہوا اور آغاز کے ساتھ ہی مصائب کا وہ نقطہ شروع آگیا جو ابتدا میں آئے تو کسی تحریک کے لئے انتہائی خطرناک اور اگر کچھ وقت پکڑ جانے کے بعد آئے تو عموماً مفید ہو کر رہتا ہے۔ یہاں ابھی دعوت نے

رشتہ تو وہ ہے جسے پروردگار قائم کرے نہ کہ وہ جسے لوگ رشتہ سمجھیں۔
اللہ کا حق کہہ کر پوکھلا دیا کہ میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے
مغرب سے نکال، تو عراق کی سرزمین ان کے لئے تنگ ہو گئی راہیں آگ میں جھونک
دینے کے منصوبے بن گئے، خدائی کے دعویداروں کو حقارت سے ٹھکرا دینے کا یہ نتیجہ
تھا، جو دعوے بندگی، حق کا حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا تھا اب اس کے امتحان کے
یہ سامان تھے، پورا خاندان بھڑوں کا چھتہ بن گیا تھا پوری قوم کاٹنے کو دوڑتی تھی
آگ میں جھونکے گئے اور بالآخر وطن سے بے وطن ہو کر با دیہ پیائی کر فی پڑی با دیہ
ہیائی کے ایک طویل دور کے بعد بیٹے کی قربانی کا مطالبہ ہوا اور باپ نے اپنے رب
کے حکم کے مطابق چھری تیز کر کے بیٹے کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر اسے اذیت
مند زمین پر لٹا دیا، یہ واقعہ آسمان کے نیچے اس رشتہ اور ناتہ کی زمین پر پہلی اور آخری
بار ہوا، پوری کائنات دم بخود تھی کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ حیران تھے جنہوں
نے خدا کی زمین میں ابن آدم پر فساد کا الزام لگایا تھا کہ یہ انسان خدا کی محبت اور
اطاعت میں اتنا غرق بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیٹے کے حلق پر چھری چلا دینے پر بھی
تیار ہو جائے اور خدا کی اطاعت و محبت کی تاریخ میں انسانیت نے یہ نمایاں
ترین سنگ میل نصب کر دیا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نہ ہاتھ پھڑکے نہ آواز
کپنی نہ لہرہ طاری ہوا اور چھری چل گئی۔ اس چھری نے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ ابن
آدم خدا کی اطاعت میں ہر رشتے پر ہر متاع عزیز اور کائنات کی ہر دولت بے بہا
پر چھری چلا سکتا ہے۔ انسانیت نے راہ حق میں قربانی اور ایثار کا ایک معیار قائم کر
دیا اور اس معیار پر انسانیت ہمیشہ فخر کر سکے گی، محبوب کی طرف سے آنیوالے ابتلا کو
دونوں ہاتھوں سے سینے سے لگانا حق سے ثابت قدمی اور استقامت کی توفیق چاہنا
اور آنیوالے امتحان میں اپنی ساری متاع حیات جھونک دینا یہی وہ طریق کار ہے
جسے مومن کا ایمان اختیار کرنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بھی ایک طویل دور ابتلا سے گزرنا پڑا اور اس لئے کہ ابتلا سزا نہیں ہے پر کھ ہے اگر یہ سزا ہو تو پیغمبروں پر کبھی نہ آنے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کا کوئی بندہ جتنا اس کے نزدیک برگزیدہ ہو اسی قدر سخت ابتلا میں اسے مبتلا کیا گیا۔ جتنا اونچا اس کا درجہ ہوا اتنا ہی کڑا امتحان اس کا لیا گیا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں پر فرعون نے مصر کی زمین تنگ کر دی۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جاتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا۔ اس طرح پوری قوم کی نسل کشی کے پروگرام پر ایک غرصہ تک عمل کیا جاتا رہا بنی اسرائیل سے بدترین برتاؤ کیا جاتا۔ حضرت موسیٰ پر جاؤ گروں کی ایک بھیڑ اپنے تمام جہتوں، منبروں اور شعبہ بازیوں کے ساتھ چڑھ آئی اور اسی وقت طحیج حق نے باطل کو پوری طرح شکست دے دی۔

حضرت عیسیٰ کو روم کے قیصر اور یہودیوں کی ماتحت ریاست سے سابقہ پڑا یہ وقت تھا جب فریسیوں اور صدوقیوں کا طوطی بولتا تھا اور انہوں نے تورات میں تحریف کرتے کرتے اسے اپنی خواہشات کا تصدیق نامہ بنا کر رکھ دیا تھا سیدنا عیسیٰ کی دعوت حق کا آغاز ہوتے ہی یہ لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ دعوت اسلامی میں انہیں اپنے اقتدار کی موت اور کتاب الہی میں اپنی تحریفات کا پول کھلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر فریسی اور فقیہ کو اپنی اپنی گدی اس دعوت کے سیل میں بہتی نظر آتی تھی۔ ہر مفاد پرست دین باز کے نزدیک اس دعوت کی موجودگی میں اس کا کاروبار چلتا نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ دعوت کے آغاز میں ہی ان کے فتنوں کے بند ٹوٹ گئے اور ان کے مکرو فریب کے جال بچھ گئے اس طرح سیدنا عیسیٰ کی دعوت کا آغاز ہی ابتلا سے ہوا اور آغاز کے ساتھ ہی مصائب کا وہ نقطہ شروع آگیا جو ابتدا میں آئے تو کسی تحریک کے لئے انتہائی خطرناک اور اگر کچھ فتنہ پکڑ جانے کے بعد آئے تو عموماً مفید ہو کر رہا ہے۔ یہاں ابھی دعوت نے

اپنی آواز بلند کی ہی تھی کہ چاروں طرف سے فتنے مرنے اور مارنے کے لئے جمع ہونے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے مختلف خطبات اور اقوال جو بائبل میں ملتے ہیں۔ ان کا انداز خطاب دہی ہے جو ابتلا کے دور میں کسی تحریک کا لیڈر اختیار کرتا ہے۔ وہ انہیں واضح طور پر راہ کی مشکلات سے آگاہ کرتا ہے۔ انہیں کھول کھول کر اس راہ کے نشیب و فراز سے خبردار کرتا ہے۔ اس دور میں پیدا ہونے والی ان کی کمزوریوں کا تجزیہ کرتا ہے اور انہیں ثابت قدمی کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کا انداز تلقین بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ ابتداء سے ہی دعوت اس دور میں داخل ہو گئی جو ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ اول تو عام حالات میں کسی تحریک کا کارکن ہونا ہی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ پیہم حرکت اور جدوجہد کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جب وہ تحریک ابتلا کے دور میں سے گذر رہی ہو تو پھر اس کا ساتھ دینا گویا خود اپنے آپ کو متقل میں لاکھڑا کرنا ہے اپنے تلوؤں کو خود کاٹنے کے فرش پر رکھ دینا ہے۔ اپنا سر خود ٹکچنے میں دے دینا ہے مسئلہ نظام سے وابستہ اپنی امیدوں کا خود گھلا گھونٹ دینا ہے اور حق کا کام چونکہ دنیا نہیں بھرتا ہے شکست کھانا نہیں بلکہ شکست دینا ہے مایوس ہونا نہیں بلکہ مایوس کرنا ہے۔ اس لئے وہ مصائب کے علی الرغم آگے ہی بڑھتا ہے۔ وہ باطل سے حق فروشی کا سودا کبھی نہیں کرتا اس کے ہاں کفر کے لئے صرف مرجانا ہی مقدر ہے۔ اس لئے وہ کبھی منافقانہ مصالحت نہیں کرتا۔

”جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہتا ہے، وہ اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے چلے،“ یہاں صلیب اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی موت کی سزا کے لئے تیار رہے۔ اس لئے کہ اس راہ کے تقاضے یہ بھی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ذہن میں ریزرویشن (RESERVATION) رکھ کر آتا ہو تو اسے پہلے ہی اس راہ سے ہٹ جانا چاہیئے۔ اس لئے کہ ابتلا تو ہر اس شخص پر آئے گی جو اس نصب العین کا دعوئے کر لگا

اگر وہ ملازم ہو گا تو ملازمت سے برعاشقی کی شکل میں، اور اگر مہاجر ہو گا تو تجارت میں خسارے کی شکل میں اس کے آنے کے تو ان گنت پہلو ہیں۔ خالق کائنات جب اپنے سپاہی کو آزمائے گا کہ وہ جاننا ز سپاہی ہے یا کاکھڑ کا پیلا ہے تو اس کی آزمائش کے ہزار راستے ہیں جو ایک شخص راستے سے بچے گا اس پر دوسرے راستے سے آزمائش آنے کی تا آنکہ وہ راہ حق سے فرار نہ اختیار کر جائے اور تا آنکہ وہ اس نصب العین سے ہی دست بردار نہ ہو جائے جس نصب العین سے عشق کی گہرائی ناپنے کے لئے وہ آزمائش اس پر آئی ہوتی ہے۔

کسی نصب العین کے عشق کا دعویٰ کرنا کھیل نہیں ہے اس لئے کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے معمولی ایذا سے لے کر جان تک دینی پڑ جاتی ہے کسی نظام باطل میں رہتے ہوئے اس کے خلاف اعلان جنگ کرنا معمولی کام نہیں ہے اس لئے کہ ایسی کسی تحریک سے ڈپٹی بہادر دی یا رکینیت کے تعلق کا اعلان ہوتے ہی اس کے چاروں طرف کا ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ دوست اور عزیز جو اس کی محبت کا دم بھرتے رہے ہوتے ہیں اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ گویا چاکل وہ انسانوں کی بستی سے نکل کر بھیڑیوں کے جنگل میں آ جاتا ہے اس کے خلاف سازشیں ہونے لگتی ہیں اس پر بہتان لگائے جاتے ہیں اسے غدار اور انتشار پسند کہا جاتا ہے۔ عدالتوں اور جلیوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ عبادت خانوں سے نکال دیا جاتا ہے اور اس کے لئے زندگی دو بھر کر دی جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا تھا:۔

”دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے نیچ میں۔ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے۔ اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کئے جاؤ گے پھر فرمایا۔“

ترک کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور میوی اور بچوں اور بھائیوں
اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا رحم میں سے جو
کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے، وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا،

اس قول کی روح اس آیت قرآنی کی روح سے کتنی ملتی جلتی ہے۔

”اے بنی کہہ دیجئے کہ تمہیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور بزرگیاں
اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور
گھر جو تمہیں پسند ہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے
زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ فرما دے اللہ ناسق
لوگوں کو ہدایت نہیں فرمایا کرتا۔“ (توبہ — ۲۴)

تخریک کے بالکل ابتدا میں آنیوالی اس ابتلا میں جو طریق کار اور طرز عمل
ایک مومن کو اختیار کرنا چاہیئے اور حق کے سپاہی کے صبر و تحمل کا جو معیار ہونا چاہیئے
اسے حضرت عیسیٰ نے اس طرح پیش فرمایا،

”شہریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داھنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس
کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالیش کرے تیرا کرتہ لینا چاہتے تو چغہ بھی اسے
لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگاری میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس
چلا جا۔“

اس کا نمونہ بھی نبی کے آغاز دعوت کے دور میں ملتا ہے جب مسلمانوں کو گرم بیت
پر گھسٹا جاتا، دکنے کوٹلوں پر لٹایا جاتا، پتھر کی گرم سلوں کے نیچے دبایا جاتا مارا اور
پٹایا جاتا اور عورتوں تک کو نیزے مار کر شہید کر دیا جاتا لیکن تخریک کا ہر کارکن اسے
صبر و تحمل اور بردباری سے برداشت کرتا رہا۔

حضرت عیسیٰ نے ابتلا میں اپنے ساتھیوں کے سامنے مطیع نظر کی بلندی اور دنیا
کے جھوٹے مدعیوں کے سامنے بے خوفی و بیباکی کا یہ معیار پیش کیا۔

”جو بدن کو قتل کرتے ہیں لیکن روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو

روح اور بدن دونوں کو پیدا کرتا ہے اس طرح صرت خدا سے امیدیں والبتہ رکھنے اور اور آخرت کے نامہ اعمال پر ہی نظر رکھنے کے لئے فرمایا۔

پھر یہ بے لاگ اصول پیش کر دیتا کہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص ابتلا سے بچنے کے لئے دنیا بازوں سے بھی دوستی رکھے اور خدا کے حقوق بھی ادا کرتا رہے ان سے بھی لاگ رکھے جو خدا کے اور اس کے دین کے قیام کے دشمن ہیں اور پھر بھی اس کی محبت و اطاعت خدا سے بے لاگ رہے۔
 ”کوئی بھی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔“

مملواری کی دھار بنی کریمؐ نے جب مکہ شریف میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تو اس تحریک کو ان تمام فطری مراحل سے گزرنا پڑا، جو ایک اصولی اور آئینی انقلاب برپا کرنے کے لازمی مراحل ہیں، ان تمام مراحل میں حضورؐ اور آپ کے پاک باز ساتھیوں نے اخلاق و عالی ظرفی اور صبر و تحمل کا جو نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے کسی دور کی کسی تحریک کے کارکنوں اور لیڈروں میں بھی نظر نہیں آتا۔ صبر و استقامت، ثبات قدمی، مقصد کا عشق، یہ غیر اللہ سے بغاوت، ہر بے اصولی اور ظلم سے مکمل بیزاری، خدا کے باغی اور بڑائی کے ہر دعویدار کے مقابلہ میں سر بلند رہنے اور بے باکی، گھر بار، مال و اولاد کا رویہ برادری غرض تعلقات کو حق کی قیچی سے بیدریغ کاٹ دینے کی مثال اور شاید کہیں نہ مل سکے پھر یہ آزمائش چند روزہ نہ تھی بلکہ برسہا برس رہی ایک نوعیت کی نہ تھی بلکہ ہر نوعیت کی تھی، ظلم بھی اور شفقت بھی، تشدد بھی اور لائحہ بھی، مصالحت بھی اور جان لینے کی ایکیں بھی، برادری کا دباؤ بھی اور نفوت و ہیبت کا استعمال بھی نہ گھر میں زندہ رہنے کی اجازت نہ باہر جا کر پنیپے دینے کا عزم، ان حالات میں عرب میں بنی کریمؐ کی قیادت میں تحریک اسلامی چلی اس آزمائش سے تحریک کے لیڈر سے لے کر ایک ایک فرد تک متاثر ہوا اور برسوں تک تختہ مشق بنا رہا اس آزمائش سے بظاہر نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن تحریک کے علمبرداروں کا عزم تباہ تھا کہ یا کفر کی یہ تاریکی چھٹے گی یا

”اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے، وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔“
اس قول کی روح اس آیت قرآنی کی روح سے کتنی مل جاتی ہے۔

”اے بنی کہہ دیجئے کہ تمہیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور بڑیاں اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور گھر جو تمہیں پسند ہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ فرما دے اللہ ناسق لوگوں کو ہدایت نہیں فرمایا کرتا۔“ (توبہ — ۲۴)

تحریک کے بالکل ابتدا میں انیوالی اس ابتلا میں جو طریق کار اور طرز عمل ایک مومن کو اختیار کرنا چاہیئے اور حق کے سپاہی کے صبر و تحمل کا جو معیار ہونا چاہیئے اسے حضرت علیؑ نے اس طرح پیش فرمایا،

”مشریک کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالیش کرے کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگاری میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔“

اس کا نمونہ بھی نبیؐ کے آغاز دعوت کے دور میں ملتا ہے جب مسلمانوں کو گرم بیت پر گھسٹا جاتا، دیکتے کوٹلوں پر لٹایا جاتا، پتھر کی گرم سلوں کے نیچے دبایا جاتا مارا اور پٹایا جاتا اور عورتوں تک کو نیزے مار کر شہید کر دیا جاتا لیکن تحریک کا ہر کارکن اسے صبر و تحمل اور بردباری سے برداشت کرتا رہا۔

حضرت علیؑ نے ابتلا میں اپنے ساتھیوں کے کمانے مطمع نظر کی بلندی اور دنیا کے بھوٹے مدعیوں کے سامنے بے خوفی و بیباکی کا یہ معیار پیش کیا۔
”جو بدن کو قتل کئے ہیں لیکن روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو

روح اور بدن دونوں کو پیدا کرتا ہے اس طرح صرف خدا سے امیدیں وابستہ رکھنے اور آخرت کے نامہ اعمال پر ہی نظر رکھنے کے لئے فرمایا۔

پھر یہ بے لاگ اصول پیش کر دیا تاکہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص ابتلا سے بچنے کے لئے دنیا بازوں سے بھی دوستی رکھے اور خدا کے حقوق بھی ادا کرتا رہے ان سے بھی لاگ رکھے جو خدا کے اور اس کے دین کے قیام کے دشمن ہیں اور پھر بھی اس کی محبت و اطاعت خدا سے بے لاگ رہے۔
 ”کوئی بھی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔“

میتلواری دھار بنی کریم نے جب مکہ شریف میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تو اس تحریک کو ان تمام فطری مراحل سے گزرنا پڑا، جو ایک اصولی اور آئینی انقلاب برپا کرنے کے لازمی مراحل ہیں، ان تمام مراحل میں حضورؐ اور آپ کے پاک باز ساتھیوں نے اخلاق و عالی ظرفی اور صبر و تحمل کا جو نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے کسی دور کی کسی تحریک کے کارکنوں اور لیڈروں میں بھی نظر نہیں آتا۔ صبر و استقامت، ثابت قدمی، مقصد کا عشق، ہر غیر اللہ سے بغاوت، ہر بے اصولی اور ظلم سے مکمل بیزاری، خدا کے باغی اور بڑائی کے ہر دعویدار کے مقابلہ میں سر بلندی اور بے باکی، گھر بادر مال و اولاد کا رویار برداری غرض تعلقات کو حق کی قیچی سے بیدریغ کاٹ دینے کی مثال اور شاید کہیں نہ مل سکے پھر یہ آزمائش چند روزہ نہ تھی بلکہ برسہا برس رہی ایک نوعیت کی نہ تھی بلکہ ہر نوعیت کی تھی، ظلم بھی اور شفقت بھی، تشدد بھی اور لالچ بھی، مصالحت بھی اور جان لینے کی اسکیمیں بھی، برادری کا دباؤ بھی اور قوت و ہیبت کا استعمال بھی نہ گھر میں زندہ رہنے کی اجازت نہ باہر جا کر چنپنے دینے کا سہم، ان حالات میں عرب میں بنی کریم کی قیادت میں تحریک اسلامی چلی۔ اس آزمائش سے تحریک کے لیڈر سے لے کر ایک ایک فرد تک متاثرہ ہوا اور برسوں تک تختہ مشق بنا رہا اس آزمائش سے بظاہر نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن تحریک کے علمبرداروں کا عزم تباہ تھا کہ یا کفر کی یہ تاریکی چھٹے گی یا

اسلام کے نور کے داعی ایک ایک کر کے جانیں دے دیں گے۔ جو بھی اس راہ میں آگے بڑھا داپسی کی کشتیاں جلا کر آبا جس نے بھی اس مصیبت کو چکھا وہ عیش و آرام نہج کر اسی کا ہو رہا۔ مومر و مومر توں کا جذبہ اسلام بھی ایسا نظر آیا کہ جس پر آسمان کے فرشتوں کو بھی رشک آئے۔

حضرت عمرؓ شہزاد کے قائد کا خاتمہ کرنے کے لئے ننگی تلوار لئے مکہ کی گلی میں سے گزر رہے ہیں کہ ایک راہرو نے سامنے سے آکر کہا:-

”محمدؐ کا خاتمہ کرنے سے پہلے گھر کی خبر لو تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں اور تشدد کا رخ بہن کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ شدید ظلم اور مار سے جب بہن کا جسم لہو لہان ہو گیا تو اس نے بے تاب ہو کر کہا: عمرؓ جو چاہو کر لو اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا۔“

یہ جملہ جس حالت میں اور جس انداز میں کہا گیا ممکن نہ تھا کہ کوئی صحیح الفطرت آدمی اسے سننے اور اس کے دل میں نشتر بن کر نہ اتر جائے اس طرح اسلام کے ایک نازک ہانڈے کو کفر کا ایک مضبوط قلعہ فتح کیا۔

حضرت سمیثہؓ کو دردناک ادیت دیتے ہوئے ابو جہل نے بالآخر ران میں نیزہ مار کر ختم ہی کر دیا لیکن ان کی زبان یہی کہتی رہی کہ اب اسلام سے پھرنا ممکن نہیں۔“

حضرت بلالؓ کو ان کا مالک پتتی ہوئی ریت پر گھسیٹا رہا۔ لٹاتا رہا اور چلچلاتی دھوپ میں پتے ہوئے پتھروں کی سلوں کے نیچے دباتا رہا۔ حضرت خبابؓ کو دھکنے کو ٹلوں پر لٹایا جاتا رہا یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر نکل آتی تھی

اہل ایمان کو شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال تک فقر و فاقے میں مبتلا رکھا گیا۔ جہاں انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کو پانی میں بھگو کر اور آگ پر بھون کر کھانا پڑا۔ اسلامی تحریک کے ان ابتدائی کارکنوں کو کھلے میں رسی ڈال کر گھسیٹا گیا۔ پٹیا گیا۔ معائنہ کرتی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا گیا اور بھوکے پیاسے قید و بند میں رکھا گیا اور حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا پھر وہاں بھی بھینا نہ چھوڑا بلکہ وہاں سارے بارے کے حدود حبش -

سے بھی نکلوا دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔
 مکہ کے ابتدائی تیرہ سال تحریک کے لئے دردناک ترین سال تھے اس سنگلاخ
 زمین میں اسلام کی جڑیں پیوست کرنے کے لئے حضور کو جن مشکلات میں سے گزرنا پڑا،
 ان کا تصور بھی اس تحریک کے کارکنوں کو اسلام کی راہ میں جان دے دینے کا عزم
 بخشنے کے لئے بہت کافی ہے حضور کو مجنون، شاعر اور جادوگر کہا گیا جو لوگ آپ کو
 "امین"، کہتے تھے اور حجر اسود کے نصب کرنے کی خوفناک نزاع میں جسے اپنا ثالث
 تسلیم کر چکے تھے انہوں نے تنگ کرنے کا کوئی حیلہ اور مہمانہ اٹھانہ رکھا۔ آپ کے
 سر مبارک پر حالت سجدہ میں اونٹ کی اوجھڑالی آپ کے گھٹے میں کپڑا ٹال کر اتنی
 شدت سے کھینچا گیا کہ آپ کا دم کھٹنے لگا آپ کا مذاق اڑایا گیا راہ میں کانٹے بچھائے
 گئے مکہ سے تنگ آکر حضور طائف دعوت حق دینے کے لئے گئے تو وہاں آپ کو تیغوں
 سے مار مار کر لہو لہان کر دیا گیا یہاں تک کہ لونڈوں اور غنڈوں کو آپ کے پیچھے لگایا گیا
 اور آپ جب جنگی درماندگی اور مارتے تنگ آکر سائے میں بیٹھے تو آپ کو بازو سے پکڑ کر
 اٹھا دیا گیا اس وقت کائنات کے سب سے بڑے محسن انسان کا یہ عالم تھا کہ پاؤں لہو لہان
 تھے اور آپ کی زبان پر تھا۔

"میرے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ مجھے نہیں پہنچاتی۔"
 سختی اور تشدد کے مقابلے میں لڑائی کی ایک دوسری ابتلا بھی تھی جب تمام قبائل
 قریش نے دعوت حق سے پریشان ہو کر آپ سے درخواست کی۔
 ۱۔ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو ہم عرب کی دولت آپ کے قدموں پر ڈھیر کرنے
 کے لئے تیار ہیں۔

۲۔ اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تمام قبائل کے سردار آپ کے سامنے بادشاہ تسلیم
 کئے لیتے ہیں۔
 ۳۔ اگر آپ کسی حسین ترین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لئے بھی
 تیار ہیں۔

لیکن آپ دعوت حق کو چھوڑ دین اس تحریر سے اور اس پیشکش کا جواب حضور
کی طرف سے یہ تھا:-

”خدا کی قسم! اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لا کر
رکھ دو۔ تو میں اس سے باز نہ آؤں گا جب تک میرے جسم میں جان بے رہے۔“
”تاہم اس سرزمین میں کفر نے اسلام کے لئے آئینی اور اخلاقی ذرائع سے زیادہ عرصہ
تک کام کرنا محال کر دیا تھا۔ تاہم کفر نے اسلام کی زندگی پر براہ راست چھاپہ مارنے کے منصوبے
بنائے۔ تاہم یہ طے پایا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک فرد مل کر ایک بلوہ کی صورت میں حضور پر رات
کے وقت سوتے ہوئے حملہ آور ہو گا کہ قصاص کا سوال پیدا نہ ہو۔ اور بنی ہاشم زیادہ سے زیادہ
فدیہ ہی لے سکیں، کفر کے یہ منصوبے اس قدر حقیقی سے چھپے ہوئے نہ تھے جس کا ہاتھ اس
تحریک کی پشت پر تھا جو اپنی طرف چل کر آیا۔ نیا بے کی طرف دوڑ کر جاتا ہے اور جس کی راہ
میں تیر چلانے والا ہاتھ گویا اس کا اپنا ہاتھ ہوتا ہے۔“

ہجرت کا عام حکم ہو گیا اور مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ کی طرف جانے لگے۔ یہ وقت تھا
جب مال، اولاد، جائیداد، مکان، کھیتی باڑی، برادری اور خونی رشتے راستہ روکنے کیلئے
ایک ایک کر کے سامنے آکھڑے ہوئے اور جان و مالوں میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کا راستہ
وہ روک سکے ہوں۔ تحریک کا ہر فرد انہیں روندنا ہوا۔ مدینہ کی طرف چلا گیا جس رات حضور
نے ہجرت کی وہی رات قیامت کی رات تھی۔ جب آپ پر شیطان اپنے حواریوں کو لیکر
حملہ آور ہوا۔ اللہ تعالیٰ لیکن شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔

حضور کا بستر اس رات موت کا بستر تھا اور اس بستر پر سونے کے لئے حضور کے
بھانجے جس نے اپنے آپ کو پیش کیا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ منصوبہ ناکام رہا اور آپ
کی تلاش کو وہ دامن میں شروع ہو گئی۔ آپ کے سر کی قیمت مقرر ہو چکی تھی، مال و دولت
اور سرخ اونٹوں کے سچاری تلاش میں مصروف تھے۔ اور حضور اپنے رفیق سفر کے ساتھ
غار ثور میں پوشیدہ تھے۔

بار بار کھوج لگانے والوں کے پاؤں کی چاپ سنانے سے جاتی اور اچانک ایک روز

ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کی طرف آتا نظر آیا۔
 صلیق اکبر نے فرمایا: ”میرے ماں باپ حضور پر خدا ہم دیکھ لئے گئے،“
 آپ نے فرمایا: ”لا تحزن ان الله معنا،“ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور اللہ
 واقعی ان کے ساتھ تھا۔ ان دو کے ساتھ تیسرا اللہ تھا، جو ان کا حامی اور مددگار تھا۔
 جنگ یدر میں ایک طرف آپ امن پوش ساز و سامان سے لے کر پچھلے تہار سے رائد
 کافر تھے اور دوسری طرف بیچارگی اور بے منو سامانی کے ساتھ تین سو تیرہ مسلمان تھے دنیا
 نے ایسے معرکے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے جب لڑائی پونی تلواریں لیکر جیتھڑوں میں
 ملبوس تین سو تیرہ نے ایک ہزار آسمن پوش جبرائیل کے سامنے آنے کی کوشش و جرات کی ہو
 جنگ احد کے اس منظر کا تصور کیجئے جب حضورؐ گڑھے میں گرے پڑے تھے جب
 آپؐ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے جب خود کی کٹیاں آپؐ کی پاک پیشانی میں
 گر گئی تھیں رجب حضرت فاطمہؓ آپؐ کے زخموں کو دھو رہی تھیں اور شیش پانی ڈال رہے
 تھے رجب چاروں طرف سے تیر بس رہے تھے اور آپؐ پہاڑ کی طرح تیروں کی بارش
 میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کو لپکا رہے تھے اور ان کی ہمتیں بڑھا رہے تھے
 پھر رجب آپؐ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ احد پہاڑ پر پناہ گزین تھے اور نیچے کافر لگا رہے
 رہے تھے اس طرح دنیا کا سب سے بڑا انسان خدا کا فرستادہ امتحان گاہ میں سے
 گزر کر اپنی دعوت حق کے مراحل طے کر رہا تھا اور یہی وہ مراحل تھے جن سے گزر کر وہ
 دور آیا جبکہ رحمت کامل نے خون کے پیاسے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ آج معافی
 کا دن ہے آج امن کا دن ہے، اور انہیں مراحل میں سے گزر کر وہ وقت آیا جب
 گروہ کے گروہ دین کے دائرے میں دھل ہوتے جا رہے تھے۔

حق کو ایک تحریک کے طور پر لے چلنا اور اسے ایک نظام زندگی کے طور
 پر مسلط کرنا اور اس کے مقابلے میں گہری جڑیں رکھنے والے نظام باطل کو اکھاڑ کر
 پھینکنا تو بہر حال ایک کٹھن کام ہے اور اس کے لوازم یقیناً زیادہ بڑے پیمانے
 پر قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور زیادہ وسیع آزمائشیں ان پر آتی ہے تاہم رنج

میں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی نے انفرادی طور پر بھی باطل کی کسی ایک بات کے مقابلے میں حق کی ایک بات پیش کی اور اس بات کی پشت پناہی کے لئے اپنی ہستی کو وقف کر دیا تو اس پر بھی آزمائشوں اور ابتلاؤں کا وہ ہجوم ہوا جس کا تصور بھی ایک مفاد پرست کے بس کا کام نہیں ہے۔

علم۔ باعمل حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حق بات کہی اور باطل کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا اور اگرچہ وہ تنہا تھے۔ وہ کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے جس سے حکومت کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا لیکن اقتدار وقت نے انہیں بھی برداشت نہیں کیا۔ آپ کو قید و بند کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے آپ کو کوڑوں کی شدید سے شدید سزا دی یہاں تک کہ زہر دے کہ آپ کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔

امام مالکؒ کو منصور عباسی کے دور میں ۱۰۰ کوڑوں کی مار کے ساتھ اس سختی سے شکنجے میں لپیٹی کہ ہاتھ بازوؤں سے اکھڑ گئے لیکن حق پناہی کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ اسی حالت میں اونٹ کی پشت پر کھڑے ہو گئے جس پر زلت و رسوائی اور تشہیر کے لئے سوار کرا کے شہر میں پھرایا جا رہا تھا اور پکار کر اس حق کو بیان کیا جس کے جرم میں آپ کی یہ حالت کی گئی تھی۔

امام احمد بن حنبلؒ کو مامونؒ اور معتصمؒ کے زمانے میں جس جس طرح ایذا پہنچائی گئی اور فتنہ خلقِ قرآن کے سبب ان پر ظلم و ستم کئے گئے اس کی مثال ملنی محال ہے جس وقت تمام علماء خلوت کے حجروں میں سر چھپائے بیٹھے تھے یا حکومت اور بادشاہ وقت کے ہاتھ پر بیعت کہہ چکے تھے اس مردِ خدا نے حق کی پشت پناہی کا اعلان کیا جس کے جرم میں انہیں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا چار چار بوجھل بیڑیاں پہنائی گئیں عین رمضان کے مہینے میں بھوکے پیاسے بیڑیوں میں مجبوس اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دھوپ میں پٹھانے گئے اور پیٹھ پر لگاتا کوڑوں کی بارش اس طرح کی گئی کہ جالدار کے ٹھہر کر وہ طرہیں لگاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے اور پھر نازہ دم جلاو آگے بڑھ کر ہزب

لگاتا تھا۔

جب ان سے کسی نے پوچھا کہ اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دیئے گئے تو کیا آپ اس وقت مان لیں گے۔ آپ نے کہا: نہیں اس کائنات میں میرے سر کو جھکانے والی دو ہی چیزیں ہیں اللہ کی کتاب یا رسول کی سنت، شاہ کے کو توال نے بتایا کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہیں پایا ہم عمال حکومت تو ان کی نظر میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور جب جیلہ جو علماء نے آپ سے جا کر وہ روایت بیان کی جس سے جان کے خوف سے تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی تھی تو انہوں نے کہا لیکن اس حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جب صحابہ نے حضور سے مظالم و مصائب کی تسکایت کی تو فرمایا، تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں کھدا کر کے آسے سے چیر دیا مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو بڑھی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں لیکن وہ اس کو بھی سہہ گئے اور حق سے منہ نہ موڑا، جیلہ جو علماء یہ جواب سن کر واپس چلے گئے۔

جنگی اذانوں کا فاش سرکلمہ خلیل

پورے اسلام کے قیام کے لئے خلافت راشدہ کے بعد پہلی بار ہندوستان کی سرزمین میں پہلی ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک کے تمام لوازمات کے ساتھ ایک منظم جماعت قائم کی گئی یہ سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کی تحریک اسلامی تھی جو دہلی اور بریلی سے اٹھی بہار اور بنگال سے اپنے مجاہد اور ذرائع رسد فراہم کئے سرحد کے قبائل میں ڈیرہ ڈالا اور پنجاب و سرحد کے خوشخوار سکھوں سے ہرو آنا ہوئی جس کا تذکرہ لکھنے والوں نے لکھا۔ ہے کہ تاریخ نے صحابہ کے بعد پہلی بار اس طرز کے لوگ دیکھے جو دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانغاں پر ہوتے تھے اس تحریک نے کم و بیش پچاس برس تک سرحد میں جہاد کا علم بلند رکھا اس تحریک کے علمبرداروں پر جو آزمائشیں آئیں اور وہ ان میں سے

جس عزم و استقلال پامردی و جوانمردی اور صبر و توکل سے گزرے وہ صبر کر سنے والوں کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

۱۹۵۷ء میں جب ہندوستان میں فوجی بغاوت اور تحریک آزادی نے تمام راسنوں کو چرخر خطرناک بنا دیا سرحد کے مجاہدوں کے لئے بہار اور بنگال سے جانیوالی سپلائی کٹ گئی۔ -
نافہ کشی نے مجاہدین کی حالت تباہ کر دی انہوں نے دشتوں کی پٹیاں اور کوئٹہ میں کھاکھا کر گزارہ کیا کئی ماہ تک غلہ کا دانہ بھی نظر نہ آیا یہاں تک کہ خون کی اجابتیں آنے لگیں پھر سازش کے مقدمات شروع ہوئے اور انگریز نے اس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں کی لاکھوں اور کروڑوں کی جامدادیں ضبط کر لیں ان لوگوں کی عزیمت کا عجب حال نظر آتا ہے کہ بنگال اور بہار سے پیادہ چلتے ہیں اور سرحد میں سینکڑوں میلوں کے فاصلے پر جا کر ایک نئے علاقے میں دشمن سے جنگ آزما ہوتے ہیں عزیمت کے یہی نمونے کسی تحریک کی جان ہوتے ہیں سازش کے مقدمات میں جب مجاہدین کی گرفتاریاں ہوئیں تو انہیں جن عذاب ناک جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا ان کی لمبائی چوڑائی ۵ × ۴ فٹ بتائی جاتی ہے کوٹھڑی کی تنگی اور جس کا یہ عالم تھا کہ قیدی کے لئے سانس لینا بھی دو بھر ہونا اور قید و بند کی یہ کیفیت کئی ماہ تک رہی کھانا اتنا گھٹیا اور کم دیا جاتا تھا کہ جیل کی گھاس پر گزارا کرنا پڑتا رہا۔

مولوی محمد جعفر تنہا نیسری نے انبالہ جیل سے لاہور کی تبدیلی کی عجیب کیفیت لکھی ہے کہیل اوڑھے ہوئے بیڑی اور ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ پیادہ خنقال آہنی کو پہنے ہوئے منزل در منزل چلے جاتے تھے۔
پھر لاہور پہنچ کر مزید عنایت ہوئی جس کا ذکر یوں کیا۔

لاہور جیل کا عطیہ ایک آہنی آٹھانڈا تھا جو بیڑی میں ڈال دیا گیا پھر بیڑی ہتھکڑی اور ڈنڈے کے ساتھ ایک بہت موٹی آہنی زنجیر بھی بیڑیوں کے یچ سے پہنا دی گئی جس کے بوجھ سے کوئی ہل نہ سکتا تھا۔ انڈمان کے لئے کراچی جاتے ہوئے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا لیکن ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے،

بھوٹے گواہوں کو بھوٹی گواہی دینے پر مجبور کرنے کے لئے اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ بے بس ہو گئے۔ بعض مر گئے۔ مولوی جعفر نے اپنی روداد لکھی ہے کہ ان سے مجاہدین کے حالات معلوم کرنے کے لئے ان پر کیا کچھ سختیاں ہوئیں۔

»پارسن صاحب نے مجھے پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب مارا حد کو پہنچی اور میں گر پڑا اور اس پر بھی میں نے نہ بتایا تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے دوسرے روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے دن سے ان کی فضا رکھنا شروع کر دی پھر دوسرے دن پارسن صاحب مجھے الگ ایک کمرے میں لے گئے۔ جہاں لے جا کر مارنا شروع کیا۔ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب میری وقت امتحان کا ہے تو مجھ کو ثابت قدم رکھو۔«

پھر مولانا یحییٰ اسلی صاحب کا ذکر کیا ہے جو امیر جماعت تھے۔
»اس مار پیٹ کی وجہ سے جیل میں ہم سب حواس باختہ ہوتے لیکن امیر جماعت بہت مسرور و خوش تھے۔ آپ کے چہرے پر کچھ بھی آثار رنج و محن کے نہ پائے جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے اور حضرت جدیث کے شعر کثر زبان پر رہتے۔
»جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں۔

تو مجھے اس کی پروا نہیں
کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔
یہ سب اللہ کی راہ میں ہے۔

وہ چلے تو بوسیدہ ٹکڑے ٹکڑے جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے۔
چنانچہ جب پھانسی کے بجائے جس دو دم کی سزا دی گئی۔ اور مجاہدوں کے لباس بدل کر ان کے داڑھی مونچھ اور سر کے بال بھی کتر دیئے گئے تو مولانا یحییٰ علی اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا کر کہتے۔

”و افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی راہ میں کتری گئی۔“
پھر مولانا کو ایک بڑے کنوئیں کے رہٹ میں جوت دیا گیا۔ جسے آپ دو
تین روز تک چلچلاتی دھوپ میں چلاتے رہے یہاں تک کہ خون کے پیشاب
آنے لگے۔

زمانہ حال میں حق کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعتوں میں مصر کی
انخوان المسلمین کے حالات سے کون ناواقف ہے۔ اس اسلامی تحریک پر ایک
”مسلمان حکومت“ کی سختیاں کسی کافر حکومت کی سختیوں سے کم نہیں ہوئیں اس لئے
کہ جب مسلمان کہلانے والا اقتدار اسلام کے درپے آزار ہوتا ہے تو اس کی
ڈھٹائی اور شقاوت تبلی اپنی اتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ وہ ہر ظلم خدا اور رسول کا نام لیکر کرتا
ہے۔ ہر مظلوم کے گلے پر بھم اللہ اکبر کہہ کر چھری چلاتا ہے۔ ہر معصوم کا خون کافر کہہ کر بہاتا
ہے۔ اور جمعیت کو عین اسلام کا لیل لگا کر انجام دیتا ہے اس کے شراب خلانے بھی
اسلامی شراب خانے ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں بد اخلاقی کے بدترین ذرائع بھی اسلامی کلب
اسلامی سینما اور اسلامی رقص و موسیقی اور آرٹ کہلاتے ہیں ایسے ہی ایک اقتدار سے جب
انخوان المسلمون کو سابقہ پیش آیا تو ان کے گلے پر چھری چلانے کے لئے بھی ایک مسلمان حکومت
نے وہ تمام مظالم ایجاد کئے جس کی جرأت کسی کافر حکومت کو بھی نہیں ہو سکتی۔ ان کے لیڈر کو
دھوکے اور فریب سے نہایت دردناک طریقے پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ان کی جماعت پر
پورے ملک میں پابندی لگا دی گئی۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان نوجوانوں کو جن کا ایمان
اپنے ملک کے لئے بیش بہا سرمایہ تھا جیلوں میں محبوس کر دیا گیا اور ان پر ایک طویل عرصے
کے لئے مظالم اور تشدد کا سلسلہ جاری رکھا گیا ان کو دردناک عذاب دینے کے لئے کوڑے
لگائے گئے سانس روک دینے والی تنگ جیلوں میں انہیں ٹھونس دیا گیا اور وہ سب کچھ
کیا گیا۔ جو ایک فرد یا جماعت کو نشانہ بنانے، پکڑنے اور ذلیل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے یہاں تک
کہ بہترین افراد کو چھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔

یہ آزمائش اور ابتلا حق ہی نہیں باطل کی راہ میں بھی پیش آتی ہے ایشار
 ایشار اور قربانی کے بغیر باطل کو بھی مشکل ہی سے فروغ ہوتا ہے آزمائشوں
 کی بھٹی میں تپ کر ہی کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور قدرت اس کا امتحان کرتی
 ہے کہ اپنے مقصد سے کس کو کتنی محبت ہے جب کفار تک اپنے مقصد کے لئے قربانیاں
 دیتے اور ایشاد کرتے ہیں جو نہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر صرف دنیا کی چند
 روزہ راحت اور کامیابی کے لئے وہ اتنی عظیم الشان قربانیاں دیتے ہیں تو ان لوگوں
 کی ذمہ داریوں کا اندازہ لگا بیٹے جن کا عقیدہ ہے کہ یہ زندگی اور یہ دنیا امتحان گاہ ہے
 یہ آخرت کی کھیتی ہے اس چھوٹی سی زندگی کے بعد وہ دائمی زندگی شروع ہوگی
 جس کی اچھائی یا برائی کا انحصار اس چھوٹی زندگی کی کمائی پر ہے خدا ہے وہ اس
 زندگی کا حساب لے گا اس ہدایت کے مطابق لے گا جو اس نے کمال مہربانی سے
 پہلے ہی پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک پہنچا دی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ
 ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ لکھا جاتا ہے ضائع نہیں ہوتا ایک پیسہ بھی اگر ہم حق کی راہ میں
 خرچ کرتے ہیں تو اس کا انعام بھی ہمیں کئی گنا ملے گا پھر یہ قرار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے
 پاس جو کچھ موجود ہے یہ ہمارا نہیں ہے بلکہ خدا کا دیا ہوا ہے یہ سب کچھ اسی کا ہے ماسی
 کی امانت ہے اگر ہم یہ سب کچھ بھی اس کی راہ میں لٹا دیں گویا ہم نے دیانت داری
 سے جس کی امانت تھی اسے ہی لٹا دی بلکہ اگر جان بھی اس کی راہ میں لٹا دیں تو گویا
 ہم نے اسی کو وہ چیز دے دی جس نے ہمیں وہ دی تھی یہ تصور اور عقیدہ رکھنے والے
 پر قربانی کے لحاظ سے کس قدر عظیم ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں پھر چونکہ اسلامی تحریک
 کا علمبردار یہ تصورات اپنے گہرے بنیادی ایمانیات کے طور پر رکھتا ہے اس لئے اس
 کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے باطل مقصد کے لئے جدوجہد کرنے والا اگر ایک پیسہ بھی
 اس راہ میں خرچ کرتا ہے تو اسے بجا طور پر اس پیسے کی جدائی کا کچھ صدمہ ہو سکتا ہے
 اس لئے کہ گویا اس نے اپنی ایک چیز صرت کی لیکن اس کے مقابلے میں اگر مومن
 راہ حق میں اپنی ساری متاع بھی لٹا دے تو اسے دکھ کی بجائے فرحت ہوگی اس لئے

کہ اس کا تہا ہی کیا جو اس نے دیا۔ اسے وہی لذت محسوس ہوگی جو ایک مفروض اپنا قرض ادا کر کے محسوس کرتا ہے۔

پھر جو حق ابدیت کا حامل ہے وہ ازل سے ایک ہی راستہ کی طرف بہتا اور چلتا چلا آیا ہے اور آخر ازل تک ایک ہی راستے کی طرف چلا جائے گا۔ اس کے ہاں مقاصد اور نصب العین کا امتیاز نہیں ہے۔ پھر وہ اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کو ابدی اور ہمیشہ کے انعامات دینے کا وعدہ کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ عیش ابدی کا سود زیادہ قربانی اور ایثار چاہتا ہے۔

حق کی راہ کی جدوجہد میں ناکامی کی منزل بھی نہیں آتی
کامیابی کی منزل جو منزل تک پہنچ گیا۔ اسے تو نفع و نقصان کی ترارودیں دالے بھی کامیاب کہنے پر مجبور ہیں لیکن جو منزل کی راہ میں ہی جان دے گیا حق کی لذت میں وہ بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے کامیابی زیادہ مختصر راہ سے حاصل کر لی اس لئے کہ وہ تو صرف اپنا اثاثہ راہ حق میں لگا دینے ہی کا مکلف تھا، جب وہ اس راہ میں اپنا دامن جھاڑ دیتا ہے تو اس کی کامیابی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے اس نے

اپنی ڈیوٹی پوری کر دی اور کارکن کی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ اس نے ذمہ داری سے اپنا فرض نبھایا۔ نتائج کا حساب کتاب کرنا اس کا کام ہے جس نے اسے ڈیوٹی پورا کر لیا ہے۔ نہ کہ اس کا جس نے ڈیوٹی پر جان دیدی۔ ناکامی تو صرف ان کے مقدر میں ہوتی ہے جو آخرت میں اپنی کھیتی میں کانٹوں کی فصل کے سوا کچھ بھی اگا نہ سکے۔ اور مؤرخ نے بھی جن کے بارے میں شرح صدر سے گواہی دیدی کہ ناکامی حقیقت میں انہیں کا حصہ تھی جنہوں نے حق کا راستہ روکا وہ راستہ روکنے میں ناکام ہو گئے تو گویا مقدر نے انہیں دوسری ناکامی سے دوچار کر دیا اور اگر چند دن کے لئے ان کا پلڑا بھاری ہو گیا تو بھی ان کے پلڑے کی بے وزنی ان کے لئے مقدر ہے اس لئے یہ بات تو مسلم ہے کہ جس طرح مومن کے نزدیک مالیوسی نہیں آتی اس لئے

کہ قنوطیت شیطان کا حصہ ہے اسی طرح حق اور ناکامی کی منزلیں بھی مخالف ہمنوں میں ہیں یہاں چونکہ نفع اور نقصان کی ترازو میں نصب نہیں ہوئیں بلکہ ادبگی فرض کی ترازو ہی فیصلہ کرتی ہے اس لئے جس نے اس راہ میں اپنا فرض ادا کر دیا اس نے گویا فیصلے کی ترازو میں اپنا بھاری وزن ڈال دیا اور فرض کی کمی پیشی اسی درجہ کی ہوتی ہے جس درجہ کی کسی جگہ کفر اور اسلام کی کشمکش ہوتی ہے کفر غالب ہو رہا ہو تو فرض بڑھ جاتا ہے ڈیوٹی سخت ہو جاتی ہے کفر دم توڑ رہا ہو تو فرض کم ہو جاتا ہے ڈیوٹی نرم ہو جاتی ہے جیسے کسی بستی میں حفظانِ صحت کا اہتمام ہو تو وہاں ڈاکٹر چھین سے کہاں بیٹھ سکتا ہے وہ بستی کو بہتر سے بہتر بنانے کی تدابیر سوچتا رہتا ہے اور اگر وہاں وبا پھوٹ پڑے تو پھر اس کے لئے دن دن نہیں رہتا اور رات رات نہیں رہتی ہر مریض کی طرف لپکنا اس کا فرض ہے چاہے وہ اسے رات کے بارہ بجے بلائے یا دن کے بارہ بجے پھر اس کی ڈیوٹی کے حدود متعین نہیں ہو سکتے وہ سرایا ڈیوٹی ہوتا ہے اس وقت اگر وہ اپنی تفویضات کے لئے وقت نکالنا چاہے تو وہ مجرم سمجھا جائے گا خدا کے جن نیک بندوں کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور جنہوں نے اپنا مزاج دنیا اسی "سب سے بڑے" کی رضا اور خوشنودی سے وابستہ کر دیا ہو ان کے دل سے چھوٹوں کا خوف نکل جاتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے انسانیت کو بڑی بڑی توفقات وابستہ ہوتی ہیں اور جو کائنات کو صلح و عافیت امن و آسوشی اور خیر و اخلاق سے لبریز کر دینے کا عزم رکھتے ہیں راہِ حق کی مشکلات میں استقامت فی الدین ہی مومن کا حقیقی سرمایہ حیات ہے۔

استقامت

اگرچہ خلوص ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لئے ناگزیر ہے
نہاں وہ دین حق ہو یا دین باطل، مگر دین حق اس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی
مانگتا ہے جو دین باطل کے قیام کے لئے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین
صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص
سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی بھیڑ میں سے گزر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ
جائے اور پورے معیار STANDARD کا کندن نہ نکل آئے وہ اپنے نام سے
اس کو باز نہیں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے،
باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملتے کٹے ہوئے زیور بیچتا پھرے یہی وجہ ہے
کہ قرآن باریا کہتا ہے۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ
مِنَ الطَّيِّبِ (ال عمران: ۱۷۹)

» اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے
جس پر تم لوگ اس وقت ہو کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں، وہ نہ مانے گا
جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔،

أَحِبِّ النَّاسَ أَنْ يُتْرَكَوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَ
لَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (عنکبوت: ۲-۳)

» کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے
چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھیڑ میں تنہا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان

سے پہلے جو گزر چکے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) ان سب کو ہم نے بتایا ہے پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمْ يَأْتِ شَيْءٌ مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَدُوْا مِنْ قَبْلُ مَسْئَلَةً اَلْبَاسَةِ وَالْقِرَآءَةِ وَلَمْ يُنْزَلْ عَلَيْكَ ذٰلِكَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ حَتّٰى تَنْزَلَ اِلَيْهِمْ رِبْقًا (۲۱۳)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے ؟ ان پختیاں اور مبتلیں آئیں اور وہ بلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ؟“

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا أَنْ تَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَكُنْتُمْ مِنْ الْكَاذِبِينَ
يَتَّخِذُهُ أُمَمٌ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ آلَاءَ لَا تَأْتِيهِمْ سَاعَةٌ أَنْ يَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِمْ أَنْ يَشَاءُوا أَلَيْسَ ذَلِكَ
بِظَاهِرٍ لِعَامِلٍ

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا“

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةً
النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ط وَكُنِ مِنْ أَجَاءِ لَصْرٍ مِّن رَّبِّكَ يَقُولُونَ أَأَنَا كُنَّا مَعَكُمْ
أَوْ لَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝ وَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
وَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ۝ (الجنس ١٠١-١١)

”اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے
مگر جب اللہ کی راہ میں انہیں متناہ کیا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے
اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے
تو یہی لوگ اکر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے

خوب واقف نہیں ہے مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون؟

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالتَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَأَنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قَفْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُحْتَدُونَ ۝

(البقرہ: ۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷)

”ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دیدہ ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔“

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَتَذَكَّرُ اللَّهُ لَأَنتَصِرَ مِنْهُمْ ۚ وَلَٰكِن لَّيَبْئُوكُمْ بِبَعْضِ

(محمد ۲۱)

”اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ

لوگوں کے ذریعہ سے آزماتا ہے۔“

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی نہیں کر سکتا اس لئے تم سے مدد مانگتا ہے نہیں وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں ان کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے مگر اس نے جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لئے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں آزمانا چاہتا ہے جیت تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں پیچھے اہل

ایمان بھوٹے مدعیوں سے تمیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتنا نہیں بن سکتا جو خلافت الہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریہ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریہ حق تو موجود ہے البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دھن کے پکے اور اپنی ہر عریزہ محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس ایک مبارک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے رہے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الایاد وہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سر بلند کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جبرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی حفاظت کے لئے دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری ان کی گھات میں لگے ہوئے ہیں روس کا انقلاب جو ابھی چوبیس سچیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزار ہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک

سہ یہ مضمون اپریل ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا

ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے، سا بیڑیا کے جہنم میں بھیجے گئے پھانسی پر چڑھائے گئے
 ملا وطن کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانٹتے پھرے اپنی ذاتی خوش
 حالی کی تمام خواہشوں اور تمنائوں کا خون کیا، خانماں بر باد ہی کو خود اپنے ہاتھوں
 مول لیا اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب کہ نزار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور
 بھی مشکل ہی کیا جاسکتا تھا۔ دور نہ جانیے خود ہندو سننا ہی کو دیکھ لیجئے۔
 میاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت و خون کے ذریعہ سے
 وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی
 زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرتے میں کیا کسراٹھا رکھی، کون
 سی ممکن تصویر مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو، قید خانوں
 میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں جس دوام میں عمریں گزار دیں، پھانسی کے
 تختہ پر جائیں تک دے دیں اس سے بچت نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط
 مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس
 کے لئے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارہ کرنے اور مصیبتیں سہنے
 کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ اگر خاک وطن میں اتنی کشش
 ہے کہ اس کے لئے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا
 اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود لپیت ہمت
 اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کا عظیم کے لئے جن
 اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے البتہ اپنی ذات
 کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں اِذْهَبْ اَنْتَ دَبِّكَ فَقَاتِلْ اِنْ تَابَ هُمُ فَذَٰعِدْ دَانَ
 جاثم اور مہاراجہ دونوں لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں (المائدہ ۲۴) سہ

۱۔ تحریک آزادی ہند کے سلسلے میں کسانوں کی ایک تحریک۔

سہ واضح رہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے ۴۴ مہینے بعد ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء
 کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا

آزمائش ہجرت

دعوت دین کا کام ہوگا تو اس راستے میں مشکلات اور آزمائشیں بھی آئیں گی۔
دعوت حق میں عدم ملامت، استقامت، وطن، مال، رشتہ و تعلق کی قربانی مطلوب ہوتی ہے۔

سورۃ کہف اور سورۃ مریم کا نزول بعثت نبوت کے قیام اور مخالفت اور مخالفت کے دوسرے دور کی سورتیں ہیں جو دو بعثت نبوت کے رشتہ تائید تک چلتا ہے اس دور کے جو حالات تھے ان کا ذکر تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں سورتوں کے ذریعے سے جو اسباق دیئے گئے ہیں اس پر بات کی جائے گی۔

قریش کے سردار جب تصنیف، استہزا، اطماع، تحریف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریک اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے قلم و ستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کئے ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے اپنے قبیلے کے تو مسلمانوں کو تنگ کرنا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دیکر، حتیٰ کہ سخت جسمانی اذیتیں دے کر انہیں اسلام چھوڑنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور موی جو ان کے زیر دست کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ہر سی طرح پیسے گئے مثلاً بلال، عامر بن نفیر، اُمّ عبیس، زئیرہ، عمار بن یاسر اور ان کے والدین وغیرہم، ان لوگوں کو مار مار کر آدمہ مو کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا کہ کی تپتی ہوئی ریت پر چپلائی دھوپ میں ٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے ان سے کام لے لیا جاتا اور اجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا چنانچہ صحیحین میں حضرت جناب بن ارت کی یہ روایت موجود ہے کہ

سَلَّمَ لِمِ الْفَرَّانِ اِنْ سَوَّرْتُمْ كَيْ دِيَاچے

”میں مکے میں دوبارہ کام کرتا تھا، مجھ سے عام ابن دائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اجرت نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔“

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے ان کے دوبارہ کو برباد کرنے کی کوشش کی جاتی اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے ان کو ہر طریقے سے ذلیل و سوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ”یا رسول اللہ! اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ خدا سے تمنا کیوں نہیں فرماتے؟“ یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک تمنا اٹھا اور آپ نے فرمایا، ”تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے، ان پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آگ سے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی منہ سے حضرت موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔“ (بخاری)

یہ حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو جب شہ عام فیل (شہ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ ”وَحَرِّ جَبْتُمْ اِلٰی اَرْضِ السَّبْتِ فَاِنَّ بَلْعًا مَلَكًا لَا يَكْلُمُ عِنْدَ احَدٍ وَصِي اَرْضٍ صِدْقٌ حَتّٰی يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِّمَّا اَنْتُمْ فِيْهِ۔“

”اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔“

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شعیبہ کے بند گاہ پر ان کو بر وقت

جیش کے لئے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۶ مرد گیارہ عورتیں اور سات غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکہ میں بنی صلیٰ اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴ آدمی رہ گئے۔

اس ہجرت سے کچھ گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابو جہل کے بھائی سلمہ ابن ہشام، اس کے چچا زاد بھائی ہشام بن ابی حذیفہ اور عباس بن ابی ربیعہ اور اس کی چچا بہن حضرت ام سلمہ، ابوسفیان کی بیٹی ام جلیبہ، عتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے بھائی ابو حذیفہ، سہیل بن عمرو کی بیٹی سلمہ، اور اسی طرح دوسرے سرداران قریش اور مشہور دشمنان اسلام کے اپنے بگڑ گوتے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے اسی لئے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخر کار وہ مسلمان ہو گئے چنانچہ حضرت عمرؓ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعہ سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار یحییٰ بن زبیر ابی حاتم بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لئے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے مشہور عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے اتنے میں عمر آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے کچھ دیر کے بعد کہنے لگے ”عبداللہ کی ماں، جارہی ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں، خدا قسم تم لوگوں نے یہاں مہرت ستایا۔ خدا کی زمین کھلی پڑی ہے اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے“ یہ سن کر عمر کے چہرے پر رقت کے ایسے آثار ظاہر ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ ”خدا تمہارے ساتھ ہو“

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ربیعہ (ابو جہل کے ماں جانی) اور عمر بن عاص کو مہرت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین

لو مکہ واپس بھیج دے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے (جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیان سلطنت میں خوب تحفے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لئے نجاشی پر بلا اتفاق زور دیں گے پھر نجاشی سے ملے اور اس کو حبش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور قوم کے اشتراک نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لئے بھیجا ہے یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔ ان کا کلام ختم ہوتا ہی اہل دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ ”ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے“ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جلتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے، مگر نجاشی نے بکڑ کر کہا کہ ”اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لئے آئے ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے“ چنانچہ نجاشی نے اصحاب رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پاکر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے آخر سب نے باتفاق فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم و کاست پیش کریں گے خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے دربار میں پہنچے تو چھوٹے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ ”یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا۔ اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دنیا کے دوسرے ارباب ہی میں سے کسی کو اختیار کیا، آخر یہ تمہارا دین ہے کیا؟“ اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفر بن ابی طالبؓ نے ایک جڑبڑ تقریر کی جس میں عرب جاہلیت کی دیتی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں پھر ان مظالم کا

ذکر کیا جو آنحضور کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھسا رہے تھے اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رخ اس امید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے نبی پر انرا ہے۔ حضرت جعفر نے جواب میں سورۃ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے نجاشی اس کو مستار یا اور دنا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈالٹھی تر ہو گئی۔ جب حضرت جعفر نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ ”یقیناً“ یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔“

دوسرے روز عمر بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ ”ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھ لیتے کہ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔“ نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا، مہاجرین کو پہلے سے عمر کی چال کا علم ہو چکا تھا انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے۔ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے مگر پھر بھی اصحاب رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسول نے سکھائی چنانچہ جب یہ لوگ دوبارہ گئے اور نجاشی نے عمر بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اٹھ کر بلا مائل کہا ”مَوَّعِبِدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ وَدُحْنُ وَكَلْبَتُهُ الْغُلَاظُ الْاِثْمُ الْاَعْدَاۗءُ الْمُتَبَتُّوۗلُ“ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر افشاء کیا، نجاشی نے سن کر ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا ”خدا کی قسم، جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔“ اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بیٹھے ہوئے تمام تعالت یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں رشوت نہیں لینا اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

دعوتی اسباق | ۱۔ اصحاب کہف کے قصے میں اہل ایمان کو یہ سبق

دیا گیا کہ اگر کفار کا غلبہ ہے پناہ اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک مہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر اللہ کی زمین میں نکل جانا چاہیے۔

۲۔ ہمیں مہاجرین جیشہ کے واقعات سے جس طرح یہ سبق ملنے لگے ظالم معاشرے میں باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر تنہا تقدیر نکل جانا چاہیے دوسری بات جو اس قصے میں نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ بات ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزین گروہ کی حیثیت سے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرہ برابر مہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زاد راہ کے طور پر یہ سؤۃ مریم ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کریں۔

۳۔ تمیز اسبق جو ان دونوں واقعات میں سے ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت حق کو قبول کرنے والے جب تک اپنے عمل اور کردار سے یہ نہ ثابت کر دیں کہ جس حق کو انہوں نے حق تسلیم کیا ہے اس کے لئے برادریوں کے تعلقات کو تنجہ سکتے ہیں وطن چھوڑ سکتے ہیں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتے ہیں لیکن دعوت حق کو نہ چھوڑ سکتے نہ چھپا سکتے ہیں۔ نہ باطل کے آگے جھک سکتے ہیں اس وقت تک کامیابیوں کی منزل تک نہ پہنچ سکتے اور نہ خدائی نصرت کے وہ مستحق ہو سکتے ہیں۔

۴۔ چوتھا سبق ہمیں یہ ملتا ہے کہ جب حق قبول کرنے والے دنیا کے سارے تعلقات اور ذرائع وسائل کو خدا کے بھروسے پر تنہا تقدیر ترک کر دیتے ہیں تو اللہ ان کو نہیں چھوڑتا اور نہ ان کو ضائع ہونے دیتا ہے بلکہ وہ آخر کار محبوب مخلوق ہو کر رہتے ہیں۔

اہل حق کا ایک تاریخی واقعہ | اور اس راستہ پر چلنے والوں کے لئے

قَالَ اَرَاغِبْتُ اَنْتَ عَنِ الْهَيْتِ يَا اَبْرَاهِمُ جَ لَيْسَ كَمْ تَنْتَبِهْ

لَا رَجْمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۚ قَالَ سَلَّمَ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُكَ
رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ۚ وَأَعْتَزُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَأَدْعُوا رَبِّي عَسَىٰ أَنْ لَا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ۚ فَلَمَّا اعْتَرَاهُ الْجُحُمُ
وَمَا يَعْجُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا وَهْبًا لَهُ إِنْ شِئَ أَنْ يُعْقِبَ ط وَكَلَّا جَعَلْنَا
نَبِيًّا ۚ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۚ (مریم: ۵۰ تا ۵۶)

باپ نے کہا " ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا، ابراہیم نے کہا "سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔"

"بس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے توانا اور ان کو سچی ناموری عطا کی۔"

یہ حرت تسلی ہے ان مہاجرین کے لئے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے ان کو تباہی جارا ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اٹنے سے بلند و سر فراز ہو کر رہے اسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے بلکہ وہ عزت پاؤ گے جس کا تصور بھی جاہلیت میں پڑے کفار قریش نہیں کر سکتے۔

دعوتِ نبی اور محبوبیتِ خلائق | اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ
لَهُمُ اللّٰهُ مَخْرَجًا ۚ (مریم: ۶۱)

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمان ان کے لئے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔"

یعنی آج کے کی گلیوں میں وہ ذیل در سوا کئے جا رہے ہیں مگر یہ حالت دیر پا نہیں

ہے وہ دتے آگے کا ہنک اپنے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے وہ محبوب مخلوق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھینچیں گے دنیا ان کے آگے پلکیں بچھائے گی فسق و فجور، رعونت اور کبر، جھوٹ اور ریاکاری کے بل پر جو سیادت و تیادت چلتی ہو وہ گمراہوں کو چاہے جھکائے دلوں کو مسخر نہیں کر سکتی اس کے برعکس جو لوگ صداقت، دیانت، اخلاص اور حسن اخلاق کے ساتھ راہ راست کی طرف دعوت دیں ان سے اول اول چاہے دنیا کتنی ہی باز آئے آخر کار وہ دلوں کو موہ لیتے ہیں اور بد دیانت لوگوں کا جھوٹ زیادہ دیر تک ان کا راستہ روکے نہیں رہ سکتا۔

(الف) سورة الفلق اور سورة الناس میں اللہ

باطل قوتیں اور حق سے مقابلہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ طرز عمل سکھایا ہے کہ جب باطل قوتیں آخری فکر لینے پر تکی جائیں اور یہ فیصلہ کریں کہ اب ایک ہی کو جینا ہے حق کو یا باطل کو۔ لیکن باطل قوت کو اپنی کثرت اور اسباب پر اعتماد ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ جیسے کا حق تو صرف اسی کو حاصل ہے اور اہل حق جبکہ قلیل اور بے سرد سامان اور بے وسائل ہیں ان کو مٹنا ہے اور ان کو مٹا کر چھوڑیں گے تو اس وقت اللہ کا فیصلہ بھی آکر رہتا ہے۔ کہ معظمہ میں یہ دونوں صورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں مانند ڈال دیا ہے جوں جوں آپ کی دعوت پھیلتی گئی، کفار قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی جب تک انہیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے یا بھلا بھسلا کر آپ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اس وقت تک تو پھر عداوت کی شدت میں کچھ کمی رہی لیکن جب حضورؐ نے ان کو اس طرف سے بالکل بالوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے اور سورۃ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جس کی بندگی تم کرتے ہو ان کی بندگی کرنے والے میں نہیں ہوں اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لئے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ تو کفار کی دشمنی اپنے لیے

عروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں) نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضورؐ کے خلاف ہیشیاں سلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپ کو کوسا جارہا تھا خفیہ مشورے کئے جارہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور وہ بدلہ لے سکیں آپ کے خلاف جادو لوٹنے کئے جارہے تھے کہ آپ یا تو ذنات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطین جن داس ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپ کے خلاف اور آپ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی دوسرہ ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے مثال کے طور پر ابو جہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا اس کی وجہ وہ خود بیان کرتا ہے کہ ”ہمارا اور بنی عبدمناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ انہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے انہوں نے لوگوں کو سوار ہاں دیں تو ہم نے بھی دیں انہوں نے عیٹے دیئے تو ہم نے بھی دیئے یہاں تک کہ وہ اوہ ہم برابر کی ٹکڑ ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے مہلا اس میدان میں ہم کیسے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے“ (ابن ہشام ص ۳۲۷-۳۲۸)

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوع صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادو گروں اور جادو گر بنوں کے شر سے اور حسدوں کے شر سے اور انسانوں کے معبود کی ہر اس دوسرہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں دلوں میں دوسرے ڈالتا ہے خواہ وہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰ نے اس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے

بھرے دربار میں انکے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ لَاتِیْ عُدَّتْ بِرَبِّیْ وَذَرَبْتُ مِنْ سُلَیْمٰنَ لَیْ
یَوْمَیْنِ یَوْمَ الْحِسَابِ (المومن: ۲۰) میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی
ہے اس تکبر کے مقابلے میں جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا
وَ لَاتِیْ عُدَّتْ بِرَبِّیْ وَذَرَبْتُ مِنْ سُلَیْمٰنَ لَیْ اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے
اس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو (الملوکان: ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی
حالت میں بڑے سروسامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا
دونوں مواقع پر وہ طاقت ور دشمنوں کے آگے دینی دعوت حق پر ٹٹ گئے قوت ایمانی کے سوا
انکے پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ ان کا مقابلہ کر سکتے اور دونوں مواقع
پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور معاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا
کہ تمہارے مقابلے میں ہم نے رب کا ثبات کی پناہ لے لی ہے ظاہر ہے یہ الوالعزمی اور ثابت
قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اس رب کی طاقت سب سے بڑی
طاقت ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی سب طاقتیں پہنچیں اور اس کی پناہ جسے
حاصل ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمہ حق کے اعلان نے
ہرگز نہیں ہجڑوں کا تم جو چاہو کرو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں تمہارے اور اپنے
اور ساری کائنات کے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔

سورة ابراہیم، اس آخری دور کی سورت ہے
جبکہ کشمکش آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے

باطل کا مقدمہ پسپائی اور فنا

اس میں انبیاء سابقین اور ان کی مخالفت قوتوں کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ انبیاء
نے کس طرح واقعات پیش کر کے تعلیم کا حق ادا کیا اور ظالموں کے ظلم و تشدد پر استقامت
اور توکل علی اللہ کا مظاہرہ کیا اور جب ظلم حد سے گزرنے لگا تو اللہ نے ظالموں کی گردن
پکڑ لی۔

وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَهَدٰۤى نَاصِرٰنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا

سہلے تعلیم القرآن

لَاَذِيْصُوْحًا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فُلْتُوْ كُلُّ الْمُنْتَوِكِلُوْنَ ۝ (ابراہیم: ۱۲)

”ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔“

حق کے مقابل کفار کا کروار

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَاۤ اَوْ نَحْمِلُ اَيْدِيْكُمْ رَبُّهُمْ لَتَنُهْلِكَنَّ النَّصْلَيْنِ ۚ وَلَتَسْلُكُنَّمُ الْاَرْضَ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ط ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ (ابراہیم: ۱۳)

آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ”یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے“ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ”ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔“

یعنی گھبراؤ نہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے مگر ہم کہتے ہیں کہ اب یہ اس سرزمین میں نہ رہنے پائیں گے اب تو جو تمہیں مانے گا۔ وہی یہاں رہے گا۔

عجربین کی تباہی کا الہی اصول

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لئے) ایک پیغام بر نہ بھیج دیں۔“

یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے قرآن بار بار مختلف طریقوں سے انسان کے ذہن میں بیٹھانے کی کوشش کرتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظام عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے پیغمبر اور اس کا لایا ہوا پیغام ہی بندوں پر خدا کی حجت ہے یہ حجت قائم نہ ہو تو بندوں کو عذاب دنیا خلاف انصاف ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ یہ غدر پیش کر سکیں گے کہ ہمیں اگاہ کیا ہی نہ گیا تھا پھر اب ہم پر یہ گزشت کیسی مگر جب یہ حجت قائم ہو جائے تو اس کے لئے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے۔

لے تفہیم القرآن ۛ تفہیم القرآن

جنہوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغام سے منہ موڑا ہو، یا اسے پا کر پھراس سے انحراف کیا ہو بے وقوف لوگ اس طرح کی آیات پڑھ کر اس سوال پر غور کرنے لگتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کسی نبی کا پیغام نہیں پہنچا ان کی پوزیشن کیا ہوگی حالانکہ ایک عقلمند آدمی کو غور۔ اس بات پر کرنا چاہیے کہ تیرے پاس تو پیغام پہنچ چکا ہے اب تیری اپنی پوزیشن کیا ہے رہے دوسرے لوگ، تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے پاس، کب، کس طرح اور کس حد تک اس کا پیغام پہنچا اور اس نے اس کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا اور کیوں کیا عالم الغیب کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا کہ کس پر اللہ کی حجت پوری ہوئی ہے اور کس پر نہیں ہوئی۔

گمراہ انسانی معاشرے اور حکمت بانی

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَوْمًا مِّنْ قَوْمِكَ فَأَمْرًا مُّتَرَفِعًا فِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ فَنَفَخْنَا فِيهِم مِّمَّا هُمْ شَاقِقُونَ (نبی اسرائیل: ۱۶)

سبب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرینیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اس آیت میں حکم سے مراد حکم طبعی اور قانون فطری ہے یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے شرفاء فاسق ہو جاتے ہیں ہلاک کرنے کے ارادے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یونہی بے تصور کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسانی آبادی برائی کے راستے پر چل پڑتی ہے اور اللہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے تباہ کرنا ہے تو اس فیصلے کا ظہور اس طریقے سے ہوتا ہے۔

در اصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال لوگوں اور اونچے طبقوں کا لگاؤ ہے جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت مند اور صاحب اقتدار

لوگ فسق و فجور پر اتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرتے لگتے ہیں اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے نکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بد اخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

۳۶۔ باطل مٹ کر رہے گا | وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝

- اور انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی۔

یہ ہے وہ آخری معرکہ جو پچھلی بگڑی ہوئی قوموں نے اپنے وقت کے انبیاء سے لڑا تھا اور وہ اپنے ظاہری اسباب اور جتنہ بندی پر مغرور تھے اور وہ اہل حق کے مقابلے میں اس غرور پر نکلے تھے کہ اہل حق بے وسیلہ اور کمزور ہیں ہم ان کا نام نشان مٹا کر رکھ دیں گے لیکن اہل حق اپنی ساری کمزوریوں اور بے وسیلہ ہونے کے باوجود جب پوری استقامت سے خدا پر اعتماد و بھروسہ رکھتے ہوئے ان کی ساری شان و شوکت کو نظر انداز کر کے میدان میں ڈٹ گئے تو اللہ نے ان کی نصرت فرمائی اور ان جباروں کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے ایک صاحب ولایت بزرگ کا کیا بہترین قول ہے۔

پسیت خداوند ہر کرا بیندازی بنا اندازی

اسے خدا یا تیرے عجیب نزلے کام ہیں، جب مفسدین کو ان کے ظلم و فساد کی وجہ سے توڑ دے زمین کو ان مفسدین سے پاک کرنا چاہتا ہے تو تو انہیں ہمارے گلے ڈال دیتا ہے۔

اسی طرح مولانا رومؒ نے ایک بادشاہ کا ذکر کیا کہ جب اہل ایمان کو اس نے شرک پر مجبور کیا اور جب اہل ایمان نے انکار کیا تو اس نے ان سب کو آگ میں جلائے کا فیصلہ کیا تو اللہ کا غضب فوراً اس کے دامن گیر ہو گیا اور ایک عینی آواز آئی

بانگ آور چونکہ کار اینجا رسید | پائے داری سگ کہ تہرت مار رسید

یعنی معاملہ جیب اسی حد تک آن پہنچا تو غیبی آواز آئی کہ اے کھٹے پہلیں، ٹھہر، ہمارا غصہ آیا ہی چاہتا ہے۔

اسی پر کہا گیا ہے۔

دیگر گیر دستخت گیر دستترا

تو مشغومغور پر علم خدا

گمیر مائے ہچو ابرزار کن

زود شور و ریاب استفتار کن

ملفوظ خاطر پر ہے کہ یہاں اس تاریخی بیان کے پیارے میں دراصل کفار مکہ کو ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے، ذکر بظاہر پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کا ہے مگر چسپاں ہو رہا ہے وہ ان حالات پر جو اس سورۃ کے زمانہ نزول میں پیش کر رہے تھے اس مقام پر کفار مکہ کو بلکہ مشرکین عرب کو گویا صاف صاف متنبہ کر دیا گیا کہ تمہارا مستقبل اب اس رویہ پر منحصر ہے جو دعوتِ محمدیہ کے مقابلے میں تم اختیار کرو گے اگر اے قبول کرو گے تو عرب کی سرزمین میں رہ سکو گے، اور اگر اسے رد کرو گے۔ تو یہاں سے تمہارا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا چنانچہ اس بات کو بعد کے واقعات نے ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا اس پیشین گوئی پر پورے پندرہ برس بھی نہ گزرے تھے کہ سرزمین عرب میں ایک مشرک بھی باقی نہ رہا۔

خدا کا قطعی فیصلہ

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لَيُخْرِجَنَّكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا

يَلْبَثُونَ خِلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (نبی اسرائیل: ۷۶)

”اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس زمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔“

یہ صریح پیشین گوئی ہے جو اس وقت تو صرف ایک دھمکی نظر آتی تھی مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حروفِ بحرف سچی ثابت ہو گئی اس سورۃ کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفار مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور اس پر آٹھ سال سے ملحقہم القرآن۔

زیادہ نگزرے تھے کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمین عرب مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر وہاں نہ ٹھہر سکا۔

سُنَّہ مِّنْ قَدَرٍ مَّا رَسَلْنَا مِنْكَ مِنْ رَّسُولِنَا
وَلَا تَجِدُ لِمُسْلِمٍ تَحْوِيلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۷)

سنت اللہ کیا ہے

یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتنا ہے۔
جبہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے، یعنی
سارے انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ جس قوم نے ان کو قتل یا جلاوطن
کیا، پھر وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ نہ ٹھہر سکی پھر یا تو خدا کے عذاب نے اسے ہلاک کر دیا۔
یا کسی دشمن قوم کو اس پر مسلط کیا گیا، یا خود اسی نبی کے پیروں سے اسے مغلوب کر دیا گیا

(۱) ذہنی بے راہ روی اور

احسان فراموشی بدترین

نصرت الہی کی آمد کا اصول

جرائم ہیں۔

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِلَهُكَ جَٰلِمًا نَّجَّيْكُمْ
رَأَى الْكِبْرَ اعْرَضْتُمْ ط وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۷)
”جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا
کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو
تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو انسان واقعی ناشکر ہے۔“

سب گم ہو جاتے ہیں یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری اصلی فطرت ایک
خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اور تمہارے دل کی گہراہوں میں یہ شعور موجود ہے
کہ نفع و نقصان کے حقیقی اغبیارات کا مالک بس وہی ایک ہے ورنہ آخر اس کی
وجہ کیا ہے کہ جو اصل وقت دستگیری کا ہے اس وقت تم کو ایک خدا کے سوا کوئی
دوسرا دستگیر نہیں سوچتا؟ لیکن ہوائے نفس کی اتباع نے فطرت اصلی کو مسخ کر کے

لہ تعالیم القرآن -

رکھ دیا ہے کہ جب بھی اللہ رب العالمین اپنے احسانات سے نوازتے ہیں تو اللہ کی شکرگزاری کے بجائے اپنے عیش و آرام کے دوسرے اسباب تلاش کرتے ہیں کبھی اپنی عقل و تدبیر کو اس کا موجب گردانتے ہیں اور کبھی اپنے دیوتاؤں کی نظرِ کرم کو۔

لیکن اپنی بد اعمالیوں پر خدا کی گرفت سے بے خوف رہتے ہیں
 اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يَسِلَّ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا
 ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَاكِيلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۸)
 ”اچھا، تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زیر میں دھسا دے، یا تم پر پتھر اڑ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟“

اور اس کی لطیف تدبیروں بھی ہو سکتی ہے۔
 اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُعَيِّدَ كُمْ فِيْهِ تَارَةً اَوْ يُخْسِفَ عَلَيْنَا جِبَ بَدِيعًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۹)
 ”اور کیا تمہیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے اور تم کو ایسا کوئی نہ لے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟“

ج (حق سے ہانپنے کے لئے فریب کاریاں
 وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفُوْذُوْكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ لِتَقْتُلِيْ عَلَيْنَا
 غِيْرَكَ ۚ صٰلِحًا ۚ وَاِذَا لَا تَجِدُوْكَ حٰلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۳)

”اے محمدؐ ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو اگر تم ایسا کرتے تو وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے۔ یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

مکے میں پیش آ رہے تھے کنار مکہ اس بات کے وہ پہلے تھے کہ جس طرح بھی ہو آپ کو توجید کی اس دعوت سے ہٹا دیں جسے آپ پیش کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ ان کے شرک اور رسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت کر لیں اس غرض کے لئے انہوں نے آپ کو بیت میں ڈالنے کی ہر کوشش کی فریب بھی دئے لالچ بھی دلائے، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پردیگنڈے کا طوفان بھی اٹھایا بظلم و ستم بھی کیا، معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی منافع بھی کیا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لئے کیا جاسکتا تھا۔

ان مشکل حالات میں استقامت صرف اللہ کی نصرت سے ہوئی
وَلَوْلَا اَنْ تَبْتَئِنَا لَقَدْ كُنْتَ تَرْكُنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ (نبی اسرائیل: ۴۰)
اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ ہٹ جاتے۔
دعوت کے اس مرحلہ میں داعی حق کی سودے بازی اللہ کے غضب کو دعوت دینے سے
اِذَا لَا ذُقْنٰكَ ضَعْفَ الْعِيُوَّةِ وَضَعْفَ السَّمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِبُ
لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝ (نبی اسرائیل: ۵۵)

لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دھڑے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوسرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے ایک یہ کہ اگر تم حق جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر مجھڑک اٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت، دونوں میں دوسری سزا دی جاتی دوسرے یہ کہ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشش ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلاب بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

بسم تعظیم القرآن

دعوت حق کا نازک مقام | سالقہ دونوں آیات کی روشنی میں دو باتیں واضح ہو کر سامنے آئی ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ دعوت حق کس قدر اونچا مقام ہے اس کام کے کرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے بلکہ سوسائٹی میں سب سے اونچے، بلند ہمت اور اعلیٰ کردار کے لوگ ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ چونکہ یہ کام خدا کا اپنا کام ہوتا ہے اور اس کام کے کرنے والے جب بھی، جہاں بھی اور جس حال میں کام کر رہے ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے قدم قدم پر رہنمائی بھی فرماتا ہے اور قوت بھی بہم پہنچاتا ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایک نازک مقام بھی ہے کہ اگر دعوت حق دینے والے اپنی دعوت میں تھوڑی سی جھپک پیدا کریں اور باطل کے ساتھ سمجھوتے کی سورت پیدا کریں زندہ رہوں اور زندہ رہنے دو کے اصول پر عمل کریں تو دعوت کا کام کرنے والوں کی خیر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اہل حق دشوار گزار حالات میں بغیر کسی سودا بازی کے ڈٹ کر کام کریں تو اہل باطل کی خیر نہیں ہوتی۔ آخر انہیں مرٹ کر رہنا ہوتا ہے۔

اہل حق اور استقامت | وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لَيُخْرِجَنَّكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يُلْبِثُونَ

خَلَقْتُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (بنی اسرائیل، ۷۶)

”اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔“

باطل کے منصوبے اور اللہ کی سنت | اس کی ایک زندہ مثال موجودہ دور کی تحریک نفاذ شریعت اسلامی اور

اس وقت کا دور استبداد ایک زندہ مثال ہے جبکہ تحریک کے کارکنوں نے پوری استقامت سے یہ ثابت کیا کہ وہ جان و مال دے سکتے ہیں لیکن وہ اس استبدادی دور کو قبول کرتے کے لئے تیار نہیں تو حکومت وقت نے ایک ہی رات کو لکھنؤ افراد کو مروانے کا منصوبہ بنایا لیکن

۱۔ تفہیم القرآن

اللہ تعالیٰ نے اسکی اپنی ہی انتظامیہ کو اس پر مسلط کر دیا اور جس سپہ سالار کو اس نے کہتے ہی
سینئر کمانڈروں کی حق ماری کر کے آگے بڑھایا تھا اور اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد
اور اطاعت شعار کمانڈر انچیف اس کے خاتمے کا سبب بن گیا اور لوگوں نے اس غیر ناک
واقعہ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

اس راہ میں کام کرنے والوں کو اللہ کی ہدایت و نصرت پس طرح حاصل ہوتی ہے
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا
وَنَصِيرًا ۝ (الضہقان: ۳۱)

اے محمد! ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لئے تمہارا
رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔

”دشمن بنایا؟ یعنی آج جو دشمنی تمہارے ساتھ کی جا رہی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں
ہے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے جب کبھی کوئی نبی حق اور راستی کی دعوت دینے اٹھا
تو وقت کے سارے جرائم پیشہ لوگ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے یہ مضمون سورۃ
الانعام میں بھی گزر چکا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَٰطِطِينَ ۖ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ
إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ (الانعام: ۱۱۲)

اور ہم نے اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے
جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاء کرتے رہے ہیں۔
یعنی آج اگر شیاطین جن و انس متفق ہو کر تمہارے مقابلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا
رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمہارے ہی ساتھ
پیش آرہی ہو۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دنیا کو راہ راست دکھانے
کے لئے اٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مس کو ناکام کرنے کے لئے کمر بستہ ہو گئیں
”خوش آئند باتوں“ سے وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات، وائسرائے
ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اسلئے کا
سے تفہیم القرآن سے تفہیم القرآن

کام لیتے ہیں پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔
کیونکہ حق سے لڑنے کے لئے جو ہتھیار بھی مضامین حق استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں
کے لئے بلکہ خود ان کے لئے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ
بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دشمن بنایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانون فطرت
یہی کچھ ہے، لہذا ہماری اس مشیت پر صبر کرو، اور قانون فطرت کے تحت جن حالات سے
وہ چار ہونا ناگزیر ہے ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔ اس
بات کی امید رکھو کہ ادھر تم نے حق پیش کیا اور ادھر ایک دنیا سے قبول کرنے کے لئے
اُمید آئے گی۔ اور سارے غلط کاراہی غلط کاریوں سے تائب ہو کر اسے مانتوں ہاتھ لینے
لگیں گے۔

رہنمائی سے مراد صرف علم حق عطا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ تحریک اسلامی کو کامیابی کے ساتھ
چلانے کے لئے اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لئے برداشت صحیح تدبیریں سمجھنا
بھی ہے اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کھلیں ہر
ایک پر اہل حق کی تائید میں کمک پہنچانا اللہ کا کام ہے دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہل حق کو حجت بالغہ
عطا کرتا ہے اخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہل حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے نینیم کا
متبادل ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل بچا دیتا ہے اور اہل حق کے دل جوڑتا ہے انسانی طاقت
کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص اور گروہوں کو لاکر اہل حق کی جمیعت
بڑھاتا ہے۔ مادی وسائل کی ضرورت ہو، تو وہی اہل حق کے قصور سے مال و اسباب میں وہ
برکت دیتا ہے کہ اہل باطل کے وسائل کی فراوانی ان کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹش
ثابت ہوتی ہے غرض کوئی پہلو مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہل حق کے لئے اللہ
کافی نہ ہو اور انہیں کس دوسرے سہارے کی حاجت ہو۔ بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمانی و
اتحاد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق
کی سر بلندی کے لئے جانیں لڑائیں۔

یہ بات لگا دی ہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصہ نہ ہوتا تو پہلا حصہ انتہائی دل شکن تھا اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بوجھ کر تیرے سپرد ایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دنیا بھر کے کتے اور بھیڑیے تجھے لپیٹ جائیں گے لیکن اس اطلاع کی ساری خوفناکی یہ حرتِ تسلی سن کر دور ہو جاتی ہے کہ اس جان گسل کش مکش کے میدان میں اتار کر ہم نے تجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں ایمان دل میں ہو تو اس سے بڑھ کر ہمت دلانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم آپ ہماری مدد اور رہنمائی کا ذمہ لے رہا ہے اس کے بعد تو صرف ایک کم اعتقاد بزدل ہی میدان میں آگے بڑھنے سے ہچکچا سکتا ہے

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ
الْمُحْسِنِينَ ۝ (العنکبوت: ۶۹)

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔“

”مجاہدہ“ کے معنی کسی مخالف طاقت کے مقابلہ میں کشمکش اور جدوجہد کرنے کے ہیں اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشاندہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش ہے مومن کو اس دنیا میں جو کشمکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے اسے شیطان سے بھی لڑنا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا ہے اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے اپنے نفس سے بھی لڑنا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لئے زور لگاتا رہتا ہے اپنے گھر سے لے کر آفاق تک کے ان تمام انسانوں سے بھی لڑنا ہے جن کے نظریات، رجائات، اصول اخلاق، رسم و رواج، طرز تمدن اور قوانین ہمیشہ و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں۔ اور اس ریاست سے بھی لڑنا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد رہ کر اپنا فرمان چلائے اور نیکی کی بجائے بدی کو فروغ دینے میں لگے۔

لَقَدْ تَفَهَّمُوا الْقُرْآنَ

کام لیتے ہیں پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔
کیونکہ حق سے لڑنے کے لئے جو ہتھیار بھی منابین حق استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں
کے لئے بلکہ خود ان کے لئے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ
بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دشمن بنایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانون فطرت
یہی کچھ ہے، لہذا ہماری اس مشیت پر صبر کرو اور قانون فطرت کے تحت جن حالات سے
وہ چار ہونا ناگزیر ہے ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔ اس
بات کی امید رکھو کہ ادھر تم نے حق پیش کیا اور ادھر ایک دنیا سے قبول کرنے کے لئے
آمنہ آئے گی۔ اور سارے غلط کار اپنی غلط کاریوں سے تائب ہو کر اسے باہتصوں ہاتھ لینے
لگیں گے۔

رہنمائی سے مراد صرف علم حق عطا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ تحریک اسلامی کو کامیابی کے ساتھ
چلانے کے لئے اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لئے برداشت صحیح تدبیریں سمجھنا
بھی ہے اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کھلیں ہر
ایک پر اہل حق کی تائید میں کمک پہنچانا اللہ کا کام ہے دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہل حق کو حجت بالغہ
عطا کرتا ہے اخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہل حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے تنظیم کا
متبادل ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل بچاڑتا ہے اور اہل حق کے دل جوڑتا ہے انسانی طاقت
کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص اور گروہوں کو لاکر اہل حق کی جمیعت
بڑھاتا ہے۔ مادی وسائل کی ضرورت ہو تو وہی اہل حق کے تنھوں سے مال و اسباب میں وہ
برکت دیتا ہے کہ اہل باطل کے وسائل کی فراوانی ان کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹس
ثابت ہوتی ہے غرض کوئی پہلو مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہل حق کے لئے اللہ
کافی نہ ہو اور انہیں کس دوسرے سہارے کی حاجت ہو۔ بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمانی و
اتحاد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق
کی سر بلندی کے لئے جانیں لڑائیں۔

یہ بات نکال دی ہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصہ ہوتا تو پہلا حصہ انتہائی دل شکن تھا اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بوجھ کر تیرے پر دایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دنیا بھر کے کتے اور بھیڑیے تجھے لپٹ جائیں گے لیکن اس اطلاع کی ساری خوفناکی یہ حرف تسلی سن کر دور ہو جاتی ہے کہ اس جان گسل کش مکش کے میدان میں اتار کر ہم نے تجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں ایمان دل میں ہو تو اس سے بڑھ کر ہمت دلانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم آپ ہماری مدد اور رہنمائی کا ذمہ لے رہا ہے اس کے بعد تو صرف ایک کم اعتقاد بزدل ہی میدان میں آگے بڑھنے سے ہچکچا سکتا ہے

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (العنکبوت: ۶۹)

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔“

”مجاہدہ“ کے معنی کسی مخالف طاقت کے مقابلہ میں کشمکش اور جدوجہد کرنے کے ہیں اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشاندہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش ہے مومن کو اس دنیا میں جو کشمکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے اسے شیطان سے بھی لڑنا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا ہے اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے اپنے نفس سے بھی لڑنا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لئے زور لگاتا رہتا ہے اپنے گھر سے لے کر آفاق تک کے ان تمام انسانوں سے بھی لڑنا ہے جن کے نظریات، رجحانات، اصول اخلاق، رسم و رواج، طرز تمدن اور قوانین ہمیشہ و معاشرت دین حق سے متصادم ہوں۔ اور اس ریاست سے بھی لڑنا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد رہ کر اپنا فرمان چلائے اور نیکی کی بجائے بدی کو فروغ دینے میں

اپنی قوتیں صرف کرے یہ مجاہدہ ایک دن دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر لمحہ کا ہے، اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے اسی کے متعلق حضرت حسن بصری فرماتے ہیں

ان الرجل ليجاهد ما ضرب يوم من الدهم بسيف -

” آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی تلوار نہ چلائے“

” مجاہدہ“ اسی سورۃ تکوین آیت ۶ میں بھی مذکور ہے وہاں اس کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا وہ اپنی ہی بھلائی کے لئے کرے گا یہاں یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دنیا بھر سے کشش کشش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر نہیں چھوڑے گا، بلکہ وہ ان کی کوششیں و رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لئے کھول دیتا ہے وہ قدم قدم پر انہیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر ہر موڑ پر انہیں روشنی دکھاتا کہ راہ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں جتنی نیکی اور خیر طلبی ان میں ہوتی ہے اتنی ہی اللہ کی مدد اور توفیق اور معاذرت بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ
فِرْعَوْنَ وَمَلَأْتَ زِينَتَهُ وَأَمْوَالًا

راہ حق کے راستے کی رکاوٹیں

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ رَبَّنَا لِيُضِلُّهُنَّ عَنْ سَبِيلِكَ ج (یونس : ۸۸)

موسیٰ نے دعا کی ”اے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے ہٹا دے؟“

”زینت“ یعنی ٹھانڈے، شان و شوکت اور تمدن و تہذیب کی وہ خوشنمائی جس کی وجہ سے دنیا ان پر اور ان کے طور طریقوں پر رکھتی ہے اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ دیس ہاں بن جائے جیسے وہ ہیں۔

”اموال“ یعنی ذرائع اور وسائل جن کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنی تدبیروں کو عمل میں

لانے کے لئے ہر طرح کی آسانیاں رکھتے ہیں اور جن کے فقدان کی وجہ سے اہل حق اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

یعنی جن لوگوں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور تمدن و تہذیب کی خوشنمائی حاصل ہو جاتی ہے اور جنہیں دنیا کے ذرائع و وسائل میسر آ جاتے ہیں تو وہ صرف دعوت حق کا انکار ہی نہیں کرنے بلکہ انہیں دوسرے لوگوں کو بھی دعوت حق کے قبول کرنے سے روکتے ہیں۔

دعوت حق میں صبر کی اہمیت | قَالَ قَدْ أُجِيبْتُ دُعَوْتُكُمْ فَاستَقْبِلُوا وَلَا تَبْغِ عَنْ سَبِيلِ الْذِّينِ لَا

يَعْلَمُونَ ۝ (یونس: ۸۱)

موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”تم دونوں کی دعا قبول کی گئی ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی کمزور اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور آخر باطل کے ٹکڑے اور ان کی دنیوی سرفریزیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اس کے باغی دنیا پر چھانٹے رہیں اور شاید حضرت حق خود باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید کرتا نہیں چاہتے چہرہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامت حق کی سعی لا حاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذرا سی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ رہ جائے جس کی اجازت کفر و فسق کی سطحاتی میں مل رہی ہو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروں کو اس غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہی ناموافق حالات میں کام لے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِيَّاكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ صُلْحًا وَهُوَ خَيْرُ

الْحَاكِمِينَ ۝ (یونس: ۱۰۹)

لَهُ تَفْهِيمُ الْقُرْآنِ سَهْلٌ تَفْهِيمُ الْقُرْآنِ

”اے نبی! تم اس ہدایت کی پیروی کئے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“
یعنی جس طرح موسیٰ اور ان کے پیروں کو صبر کی تلقین کی گئی اور ناموافق حالات میں کام کئے جانے کی تاکید کی گئی اور جابلوں اور نادانوں کے طرز عمل سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان ناموافق حالات میں صبر کی تلقین فرمائی گئی اور مسلسل کام کرنے اور حکم اللہ کی اتباع کا دیا گیا۔

محافلین دعوت حق کا چھوڑنا

وَلَمَّا أَذْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَكَيْفُوسٌ كَفُورٌ وَلَمَّا أَذْنَا لِعِبَادٍ لَّعْنَةً بَعْدَ صَدَقَاتٍ مَتَّسِعَةً كَبُورًا فَذُكِّرُوا كَثُورًا لَّعَلَّهُمْ لَبُّورٌ (هود: ۱۰-۹)

”اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کرتے ہیں تو وہ یابوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے اور اگر مصیبت کے بعد ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دلہن پار ہو گئے، پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔“
یہ انسان کے چھوڑے پن، سطح بینی اور قلت تدبر کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں آج خوشحال اور زور آور ہیں تو اکڑ رہے ہیں، فخر کر رہے ہیں، سادن کے اندھے کی طرح ہر طرف ہل رہے ہیں نظر آ رہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزاں بھی آ سکتی ہے کل کسی مصیبت کے پھیر میں آگئے تو بلبلا اٹھے، حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے اور بہت تلملے تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدائی پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے پھر جب برا وقت گزر گیا اور بھلے دن آئے تو وہی اکڑ، وہی ڈینگیں اور نعمت کے نشے میں وہی سرمستیاں چھڑ شروع ہو گئیں۔

انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبر ﷺ

تمہیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب آئے گا، اور تم اس کی یہ بات سن کر ایک زور کا ٹھٹھا مارتے ہو اور کہتے ہو کہ ”دیوانے دیکھتا نہیں کہ ہم پر نعمتوں کی بارشیں ہوس رہی ہیں، ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریرے اڑ رہے ہیں۔ اس وقت تجھے دن دھاڑے یہ ڈراؤنا خواب کیسے نظر آگیا کہ کوئی عذاب ہم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے تو دراصل پیغمبر کی نصیحت کے جواب میں تمہارا یہ ٹھٹھا اسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل و خفاہ ہے۔ خدا تو تمہاری لگاریوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمہاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ، مگر تم اس مہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کہ ہماری خوشحالی کیسی پائیدار بنیادوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چین کیسا صدمہ ہمارے کہ اس پر خزاں آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔

وَعُوتُ حَقِّ صَبْرِ وَشُكْرِ كَارِ اسْتِ

اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (هود : ۱۱)

اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکو کار ہیں اور وہی ہیں جن کے لئے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔

یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے صبر کی صفت اس چھوڑ پین کی ضد ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویہ پر ہر حال میں قائم رہے اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولت مند، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے میں مست ہو کر مہکنے نہ لگے اور اگر کسی دوسرے وقت مصائب و مشکلات کی چکی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی بھٹی یا بڑی مقدار سے

چھلک نہ پڑے۔

دعوتِ حق اور سکونِ قلب

وہ دعوتِ حق صبر و ثبات اور سکونِ قلب کا ایک ایسا پختہ مینار قائم کریں کہ منہ الفتوں کی آندھیاں اور رفتوں کے سیلاب بھی ٹکرا ٹکرا کر گزر جائیں تو ان کے سکونِ قلب پر داغ نہ لگے۔

لَقَدْ عَلَّمْتُمْ تَارِكًا بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقًا بِهِ صُدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كُتُبٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۖ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَمِّدٌ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝ (ہود: ۱۲۱)

اے پیغمبر! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جارہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کر وہ کہیں گے ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ آمارا گیا“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا“ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔“

اس ارشاد کا مطلب سمجھنے کے لئے ان حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مکہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دب و بے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے عین اس حالت میں جبکہ یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں اس بستی کا ایک آدمی اٹھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گھٹا اور سٹرا ہوا نظام ہے، خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تلاکھڑا ہے اور تمہارے لئے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اس مذہبِ حق اور اس نظامِ صالح کو قبول کر لو جو میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس شخص کے ساتھ اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے سوا کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے عام لوگ اسے مامور بن اللہ سمجھیں اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تعلق کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری

علامت نہیں ہے جو نزول عذاب کی نشاندہی کرتی ہو بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں
 علامتیں یہی ظاہر کر رہی ہیں کہ ان لوگوں پر خدا کا (اور ان کے عقیدے کے مطابق)
 دیواؤں کا برا فضل ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں تمسک ہی کر رہے ہیں ایسے حالات میں یہ
 بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا کہ چند نہایت صحیح الدماغ
 اور حقیقت رس لوگوں کے سوا بستی کے سب لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کوئی ظلم و ستم
 سے اس کو دباننا چاہتا ہے کوئی جھوٹے الزامات اور اوچھے اعتراضات سے اس کی ہوا
 اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی منہ باندھے رنجی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے اور کوئی
 مذاق اڑا کر، آواز سے اور پھبتیاں کس کر اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑا دینا چاہتا
 ہے یہ استقبال جو کئی سال تک اس شخص کی رعوت کا ہوتا رہا ہے، جیسا کہ دل شکن اور مایوس
 کن ہو سکتا ہے ظاہر ہے، بس یہی صورت حال ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی ہمت
 بندھانے کے لئے تاقین فرماتا ہے کہ اچھے حالات میں پھول جانا اور برے حالات میں مایوس
 ہو جانا چھوڑے لوگوں کا کام ہے ہماری نگاہ میں قیمنی انسان وہ ہے جو نیک ہوا در نیکی
 کے راستے پر عیوضات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہذا جس تعصب سے جس
 بے رنجی سے، جس تضحیک و اسٹہز سے اور جس جاہلانہ اعتراضات سے تمہارا مقابل کیا جا
 رہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے جو صلاقت تم پر
 بذریعہ وحی مشکف کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے
 میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گورز تک نہ ہو کہ فلاں بات
 کیسے کہوں جبکہ کوئی باک نہ ہو تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گورز تک نہ ہو کہ فلاں بات
 کیسے کہوں جبکہ کوئی اس کے سننے تک کار و ادار نہیں ہے کوئی ماننے یا نہ ماننے، تم جسے حق پاتے
 ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کئے جاؤ، آگے سب معاملات اللہ کے حوالہ ہیں
 وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ
 فَأَخْلَفَ فِيهِ ط (ہود: ۱۱۰)

راہ حق میں بدلی اور دل شکستگی گناہ ہے

دہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف پیدا کیا تھا (جس طرف آج اس کتاب کے بارے میں کیا جارہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے)۔
یعنی یہ کون سی بات نہیں ہے کہ آج اس قرآن کے بارے میں مختلف لوگ مختلف قسم کی چیمکیاں کر رہے ہیں بلکہ اس سے پہلے جب موسیٰ کو کتاب دی گئی تھی تو اس کے بارے میں بھی مختلف ایسی ہی رائے زبیاں کی گئی تھیں۔ لہذا اے محمد! تم یہ دیکھ کر بد دل اور شکستہ خاطر نہ ہو کہ ایسی سیدھی اور صاف باتیں قرآن میں پیش کی جا رہی ہیں اور پھر بھی لوگ ان کو قبول نہیں کرتے۔

مجرمین کی طویل مہلت پر بے صبری

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط (ہود: ۱۱۰)

”اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔“
یہ فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کیلئے فرمایا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کے لئے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ جلد ہی سے چکا دیا جائے اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ فیصلہ وقت مقرر سے پہلے نہ کیا جائے گا اور یہ کہ دنیا کے لوگ فیصلہ چاہتے ہیں جو جلد بازی کرتے ہیں اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

فیصلے کی گھڑی کا انتظار

وَأِنَّ السَّاعَةَ لَا تَكُونُ إِلَّا نَفْثَ فَاصِّحَةٍ الصَّفْحَةِ الْجَمِيلَةِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ (العنکبوت: ۸۵-۸۶)
”فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے محمد! تم (ان لوگوں کی بے ہودگیوں پر) شریفانہ و رگزر سے کام لو، یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔“
یعنی خالق ہونے کی جہت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے کسی مخلوق کی

یہ طائفہ نہیں ہے کہ اس کی گزرت سے بچ سکے اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے، جو کچھ ان لوگوں کو اصلاح کے لئے تم کو رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن تھکنوں سے یہ تمہاری سعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ لہذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی ضرورت نہیں مطمئن رہو کہ ذلت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
إِلَّا بِالْحَقِّ (الحج: ۱۷۵)

باطل کا غلبہ ایک عارضی دور

”ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے، یہ آیت سابقہ آیت ہی کا جزو اول ہے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی جا رہی ہے مطلب یہ ہے کہ اس وقت بظاہر باطل کا غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستے میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آرہا ہے اس سے گھبرائو نہیں یہ ایک عارضی کیفیت ہے مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے اس لئے کہ زمین اور آسمان کا یہ پورہ نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر، کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ، لہذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لئے ہے نہ کہ باطل کے لئے اس کی مزید تشریح سورۃ ابراہیم حاشیہ ۲۵-۲۶ میں اس طرح مذکور ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِجْرُ بَعْضِهِمْ آمَنًا مِّمَّا كَرِهُوا ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
الْيَوْمَ فِي يَوْمٍ عَصِيفٍ ۖ لَا يَكْفُرُونَ وَمَا كَسَبُوا غَيْرَ شَيْءٍ ۖ ذَٰلِكَ هُوَ
الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (ابراہیم: ۱۸)

”جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس رکھ کی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھ نے اڑا دیا ہو وہ اپنے کئے کا کچھ بھی پھیل نہ پاسکے گی یہی پرے درجے کی گم گشتگی ہے۔“

یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ نعمت حرامی، بے وفائی، خود مختاری

اور نافرمانی و سرکشی کی روش اختیار کی اور اطاعت و بندگی کا وہ طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے کر آئے ہیں ان کا پورا کارنامہ حیات اور زندگی بھر کا سارا سرمایہ عمل آخر کار ایسا لا حاصل اور بے معنی ثابت ہوگا جیسے ایک راکھ کا ڈھیر تھا جو اکٹھا ہو ہو کر مدت دراز میں بڑا بڈ سا بن گیا تھا، مگر صرف ایک ہی دن کی آندھی نے اس کو ایسا اڑایا کہ اس کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو کر رہ گیا ان کی نظر فریب تہذیب۔ انہما شائد ارمندن، ان کی حیرت انگیز صنعتیں، ان کی زبردست سلطنتیں ان کی عالیشان یوتھ رستیاں، ان کے علوم و فنون اور ادب لطیف و کثیف کے اتھاہ وغیرے، خنی کہ ان کی عبارتیں اور ان کی ظاہری نیکیاں اور ان کے بڑے بڑے خیراتی اور رفاہی کارنامے بھی، جن پر وہ دنیا میں فخر کرتے ہیں، سب کے سب آخر کار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے جسے یوم قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی اور عالم آخرت میں اس کا ایک ذرہ بھی ان کے پاس اس لائق نہ رہے گا کہ اسے خدا کی میزان میں رکھ کر کچھ بھی وزن پا سکیں۔

اَلَمْ خَلَقْنَا اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ جَالِحِقَط (ابراہیم ۱۹۱)

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان اور زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟“ یہ سابقہ آیت کے ساتھ کی آیت ہے اور دلیل اس دعویٰ کی جو اوپر کیا گیا تھا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سن کر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ زمین و آسمان کا عظیم انسان کا نامہ تخلیق حق پر قائم ہوا ہے نہ کہ باطل پر؟ یہاں جو چیز حقیقت اور واقعیت پر مبنی نہ ہو، بلکہ محض ایک بے اصل خیال و گمان پر جس کی بنیاد رکھ دی گئی ہو اسے کوئی پائیدار سی نسبت نہیں ہو سکتی اس کے لئے قیام و ثبات کا کوئی امکان نہیں ہے اس کے اعتقاد پر کام کرے والا کبھی اپنے اعتقاد میں کامیاب نہیں ہو سکتا جو شخص پانی پر نقش بنائے اور ریت پر نقش تعمیر کرے وہ اگر یہ امید رکھتا ہے کہ اس کا نقش باقی رہے گا اور اس کا قصہ کھڑا رہے گا تو اس کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ پانی کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ نقش جنوں کرے اور ریت کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ عمارتوں کے لئے مضبوط بنیاد بن سکے۔ لہذا سچائی اور حقیقت کو نظر انداز کر کے جو شخص باطل امیدوں پر

اپنے عمل کی بنیاد رکھے اسے ناکام ہونا ہی چاہیے یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ سن کر تمہیں حیرت کس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی اس کائنات میں جو شخص اپنے آپ کو خدا کی بندگی و اطاعت سے آزاد فرض کر کے کام کرے گا یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان کر (جس کی فی الواقع خدائی نہیں ہے) زندگی بسر کرے گا اس کا پورا کا نام زندگی ضائع ہو جائے گا؟ جب واقعہ یہ نہیں ہے کہ انسان یہاں خود مختار ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا بندہ ہو تو اس جھوٹ پر، اس خلافت و اقتدار مفرد نے پر، اپنے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد رکھنے والا انسان تمہاری رائے میں پانی پر نقش کشیے ولے احمق کا سا انجام نہ دیکھے گا تو اس کے لئے اور کس انجام کی تم توقع رکھتے ہو؟

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ صَرَّبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ط (ابراہیم: ۲۴)

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جڑی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔“
دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہو کہ زمین سے لے کر آسمان تک چونکہ سارا نظام کائنات اسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اثر ایک مومن اپنے کلمہ طیبہ میں کرتا ہے، اس لئے کسی گوشے میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکرائے کسی شے کی اصل اور جہت اس سے وابہ نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اس سے متصادم نہیں ہوتی، اسی لئے زمین اور اس کا پورا نظام اس سے تعاون کرتا ہے اور آسمان اور اس کا پورا عالم اس کا خیر مقدم کرتا ہے

تَوَدُّ بَنِي الْكَافَّةِ كُلَّ بَنِي آدَمَ رَاجِعًا ط (ابراہیم: ۲۵)
”ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔“

یعنی وہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے، اس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پاکیزگی پیدا کرتا ہے اس کے مقابلے میں کلمہ خبیثہ تباہ کن و درخت ہے جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے کوڑے کیسے، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھنڈکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

کلمہ طیبہ اور کلمات خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص باسانی محسوس کر سکتا ہے جو دنیا کی مذہبی، اخلاقی، فکری اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرے وہ دیکھے گا کہ آغاز تاریخ سے آج تک کلمہ طیبہ تو ایک ہی رہا ہے، مگر کلمات خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں کلمہ طیبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جاسکا۔ مگر کلمات خبیثہ کی فہرست ہزاروں مردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ آج تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا اپنے زمانہ میں جن کلمات کا بڑا زور شور رہا ہے آج ان کا ذکر کیا جائے تو لوگ حیران رہ جائیں گے کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے۔

پھر کلمہ طیبہ کو جب، جہاں جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنا یا اس کی خوشبو سے اس کا ماحول مسطر ہو گیا اور اس کی برکتوں سے صرف اسی شخص یا قوم نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے گرد و پیش کی دنیا بھی ان سے مالا مال ہو گئی مگر کسی کلمہ خبیثہ نے جہاں جس انفرادی یا اجتماعی زندگی میں بھی جڑ پکڑی اس کی سڑاند سے سارا ماحول متعفن ہو گیا اور اس کے کانٹوں کی چھن ہے نہ اس کے ماننے والا امن میں رہا نہ کوئی ایسا شخص جس کو اس سے سابقہ پیش آیا ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں اسی مضمون کو سمجھایا گیا ہے جو اوپر بوں بیان ہوا تھا کہ ”اپنے رب سے کفر کرنے والوں کے اعمال کا مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو“ یہی مضمون اس سے پہلے ایک دوسرے انداز سے سیلاب اور پگھلائی ہوئی رصاوتوں کی تمثیل میں بیان ہو چکا ہے۔

يَتَّبِعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي

الْاٰخِرَۃِ ط وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ قُلْ (ابراہیم، ۲۰)

”ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ جھٹکا دیتا ہے۔“

یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک پائیدار نقطہ نظر، ایک مستحکم نظام فکر، اور ایک جامع نظریہ ملتا ہے جو ہر عقدے کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے، سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے جسے زمانہ کی گردشیں متزلزل نہیں کر سکتیں۔ زندگی کے ایسے محسوس اصول بنتے ہیں جو ایک طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انہیں سعی و عمل کی راہوں میں جھٹکنے، ٹھوکرین کھانے اور تلخوں کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں پھر جب وہ موت کی سرحد پار کر کے عالم آخرت کے حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی اور سراسیمگی و پریشانی ان کو لاحق نہیں ہوتی کیونکہ وہاں سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق ہوتا ہے وہ اس عالم میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ گویا اس کی راہ درم سے پہلے ہی واقف تھے وہاں کوئی حائل ایسا پیش نہیں آتا جس کی انہیں پہلے خبر نہ دے دی گئی ہو اور جس کے لئے انہوں نے قبل از وقت تیاری نہ کر رکھی ہو۔ اس لئے وہاں ہر منزل سے وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ ان کا حال وہاں اس کافر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے مرتے ہی اپنی توقعات کے سراسر خلاف ایک دوسری ہی صورت حال سے اچانک سابقہ پیش آتا ہے۔ اور ظالموں کو جھٹکا دیتا ہے یعنی جو ظالم کلمہ طیبہ کو چھوڑ کر کسی کلمہ جہنمہ کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی مساعی کو پریشان کر دیتا ہے وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پاسکتے ان کا کوئی تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتا۔

حالات کی ناگواری پر صبر

وَيَذَرُ الْاِنْسَانَ بِالْشَّرِّ عَادًا بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا (مریم، ۶۵)

سبحہ تعالیٰ القرآن

سبحہ تعالیٰ القرآن

”انسان خیر مانگنے کے بجائے شر مانگتا ہے۔ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ یہ جواب ہے کفار مکہ کی ان احمقانہ باتوں کا جو وہ بار بار بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ بس لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈرایا کرتے ہو۔ اوپر کے بیان کے بعد معاذیہ فقرہ ارشاد فرمانے کی غرض اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ تو تو خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگتے ہو؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ خدا کا عذاب جب کسی قوم پر آتا ہے تو اس کی کیا گت بنتی ہے؟ اس کے ساتھ اس فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مسلمانوں کے لئے بھی تھی جو کفار کے ظلم و ستم اور ان کی ہٹ دھرمیوں سے تنگ آکر کبھی کبھی ان کے حق میں نزول عذاب کی دعا کرنے لگتے تھے، حالانکہ ابھی انہی کفار میں بہت سے وہ لوگ موجود تھے جو آگے چل کر ایمان لانے والے اور دنیا بھر میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے تھے اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان بڑا بے صبر واقع ہوا ہے ہر وہ چیز مانگ بیٹھتا ہے جس کی بردقت ضرورت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ بعد میں اسے خود تجربہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی دعا قبول کر لی جاتی تو وہ اس کے حق میں خیر نہ ہوتی

فَاغْبُذْ ۖ وَاَصْطَبِرْ ۚ لِعِبَادٍ هُمْ ط
تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ۝ (مزمم: ۶۵)

صبر کی اہمیت و ضرورت

”پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔ کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟“

”ثابت قدم رہو“ یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یا دفرائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو لہجے پر گہراؤ نہیں ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیئے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمہارے سپرد کی گئی ہے۔

”اس کا ہم پایہ“ اصل میں لفظ سَمِيًّا - استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ”ہم نام“

کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو الٰہ ہے، کیا کوئی دوسرا اللہ بھی تمہارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے تو پھر تمہارے لئے اس کے سوا اور راستہ ہی کونسا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے بندے بن کر رہو۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاجِلٌ مَّا سَمِيَ ۚ فَاصْبِرْ
عَلَىٰ مَا يَأْتِيكَ وَوَسِّحْ بِحِمْمِهِ لَيْلَكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غَدُوءِهَا ط
وَمِنْ أَمَّا اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ۝ (طہ: ۱۲۹-۱۳۰)

”اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک رات مقرر نہ کی جاتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا پس اسے صبر جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔“

”جو باتیں بتاتے ہیں ان پر صبر کرو“ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا اور ان کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے، اس لئے اس کی دی ہوئی اس مہلت کے دوران میں یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کریں اس کو تمہیں برداشت کرنا ہوگی۔ اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ و ترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضہ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمہیں نماز سے ملے گی جس کو تمہیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔

”شاید کہ تم راضی ہو جاؤ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمہیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں اور اللہ کے اس فیصلہ پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی وہ داعی حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندناتے بھی پھریں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے

کا۔ جس سے تمہارا دل خوش ہو جائے گا یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا / عَسَىٰ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝ ۱۰ تو توقع ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر پہنچا دے گا، (رکوع ۹) اور سورۃ صغی میں فرمایا وَلَلَّائِي لَیْسَ لَہُمْ شَرٌّ مِّنَ الْغَیْثِ ۝ ۱۰ ”تمہارے لئے بعد کا دور اَلْاَوْفٰی ۝ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ۝“ یقیناً پہلے دے رہے ہیں اور پھر دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے“

دعوت حق والگی اور ہم گیر صبر

”اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔“ یہاں صبر بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدود کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کئے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اس لاپرواہ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لئے سامنے آئے، ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اس نقصان اور رنج اور اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے، اور عمر بھر کا صبر۔

۵۵۔ مومن ایک دوسرے کو تلقین بالصبر بھی کریں (صبر کی تلقین کریں)

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَلَّوْا صَوَابًا صَابِرِينَ وَكَانُوا مِنَ الْمُهْتَمِّينَ ۝

(البلد: ۱۷۱)

”پھر اس کے ساتھ) یہ کہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور خلق خدا پر رحم کرنے کی تلقین کی۔“

جہاں تک نفس صبر کا تعلق ہے وہ تو قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے، اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سلسلے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ چڑتا ہے۔ اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک اور قوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن و انس کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے اب یہ ظاہرات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا بھلاں اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جن کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانی اس معاشرے کے قدم چومیں گی بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی انسانی معاشرے

کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لئے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔
 ”انبیاء علیہم السلام کو دعوت حق کے مصائب صبر سے جھیلنے کی تلقین کی گئی ہے۔“

۱۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ
 پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور پھیلی والے (یونس)

علیہ السلام کی طرح نہ ہو جاؤ، لکھ

صبر کرو، یعنی وہ وقت ابھی دور ہے جب اللہ تعالیٰ تمہاری فتح و نصرت اور تمہارے
 ان مبینہ شکست کا فیصلہ فرما دے گا اس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی
 اس تبلیغ میں پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔ اور پھیلی والے کی طرح
 نہ ہو جاؤ۔ یعنی یونس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری کی وجہ سے
 مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے یعنی پتپا دیئے گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا فیصلہ
 آنے سے پہلے بے صبری سے کوئی کام کیا تھا جس کی بنا پر وہ عتاب کے مستحق ہو گئے تھے

۲۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (۵۰۔ المعارج) اے نبی صبر کرو مثلاً صبر

یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایان شان ہے لکھ

۳۔ وَكَذَٰلِكَ فَاصْبِرْ (الموتر) اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔ لکھ

یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جو کموں کا کام ہے اس میں سخت
 مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا تمہاری اپنی قوم تمہاری
 دشمن ہو جائے گی سارا عرب تمہارے خلاف صفت آرا ہو جائے گا اگر جو کچھ بھی اس راہ میں
 پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثبات قدمی اور مستقل
 مزاجی کے ساتھ انجام دینا اس سے باز رکھنے کے لئے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی
 محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہوگی ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ
 اپنے موقف پر قائم رہنا۔

۴۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ اثِمًا أَوْ كُفُورًا

رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو، لکھ تفہیم القرآن

لکھ تفہیم القرآن لکھ تفہیم القرآن لکھ تفہیم القرآن لکھ تفہیم القرآن

”رب کے حکم پر صبر کرو یعنی تمہارے رب نے جس کا عظیم پر تمہیں مامور کیا ہے اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پاموشی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے نباتات میں لغزش نہ آنے دو۔“

”بات نہ مانو“ یعنی ان میں سے کسی سے وہ کر دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ اور کسی بد عمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی تراشیم و تغیر کرنے کے لئے تیار نہ ہو جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے بر ملا حرام و ناجائز کہو خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو اور جو عقائد باطل ہیں انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں علانیہ حق کہو، چاہے کفار تمہارا منہ بند کرنے، یا اس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لئے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

مخالفوں کے مقابلے میں اللہ کو وکیل بنائیں

”اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ“
الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو بالکل نظر انداز کر دو اور ان کی کسی بد تمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ احتراز بھی کسی غم اور غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سن کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور دل پر میل تک نہیں آتے دیتا، اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس سے مختلف تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور کو یہ ہدایت فرمائی اصل میں تو آپ پہلے ہی سے اسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لئے دی گئی کہ کفار کو بتلا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے ایسی باتوں کے جواب میں اپنے رسول کو بھی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے اور دوسرے مبلغ بھی ایسا ہی کریں

سَلِّمُ التَّسْلِيمِ (التَّوَّابِ)

”تمام مخالفتوں کے مقابلے میں اللہ کو رکیل بنا لینے کی تاقین“
 رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ ۞ وَاصْبِرْ عَلَىٰ
 مَا يَقُولُونَ ۚ وَاصْبِرْ لَهُمْ حُجْرًا جَمِيلًا ۞ (المزمل: ۹-۱۰)
 ”وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہذا اسی کو رکیل بنا لو۔“
 رکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے۔
 قریب قریب اسی معنی میں ہم اردو زبان میں رکیل کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال کرتے
 ہیں جس کے حوالہ اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی
 طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ
 ہے کہ اس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمہارے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے
 اور جو مشکلات تمہیں پیش آرہی ہیں ان پر کوئی پریشانی تم کو لاحق نہ ہونی چاہیے تمہارا رب
 وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے
 اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں، تم اپنا معاملہ اسی کے حوالہ کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ
 اب تمہارا مقدمہ وہ لڑے گا تمہارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمہارے سارے کام
 وہ بنائے گا۔

وَمِنْ أَحْسَنَ تَوَلَّاهُ مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَنَحْمِلُ صَلَاحًا
 قَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (آل عمران: ۳۲)

دعوت حق غفلت کا مقام

”اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی۔“
 جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں (۲۳) ختم السجدہ (۲۳)
 اس سے پہلے کی آیات میں اہل ایمان کو بتایا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو
 جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجلئے خود وہ بنیادی
 نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے اب ان کو بتایا جا رہا ہے
 کہ آگے کا وہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں ہے یہ ہے کہ تم خود نیک
 عمل کرو اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی

جہاں اسلام کا اظہار اعلان کرنا اپنے اوپر مضبوطی کو دعوت دینا ہے ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے اس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے بیکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے دُندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اسے چھاٹکھانے کو دوڑ رہا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان کھولی اس نے تو گویا ان دُندوں کو پیکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھینسوڑ ڈالو ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجہ کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں اور تناسخ سے بے پرواہ ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

رَاضِی بَرَضَارِیْمِ | فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (۴۵) مریمؑ تم اس کی بندگی کرو اور

اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟
یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یا دفرمائی اور مذ اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیتے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمہارے سپرد کی گئی ہے

دَعْوَتِ حَقِّ میں سمجھ بوجھ کی اہمیت | قَالَ قَدْ أُجِيبْتُ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْطُونَ

۱۹۱۔ یونسؑ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا ”تم دونوں کی دعا قبول کی گئی

ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے“

سَلِّمُوا عَلَى الْمُرْسَلِينَ

سَلِّمُوا عَلَى الْمُرْسَلِينَ

جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں، اور اکثر باطل کے ٹھانڈے اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید حضرت حق خود ہی باطل کے مقابلے میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامت حق کی سعی لا حاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذرا سی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ جائے جس کی اجازت کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہی ناموافق حالات میں کام کئے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلطی نہی ہو جائے جو ایسے جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

وَدَعَوْتَ حَقٍّ فِي مَنَازِكِ الْاَيْمِ
اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُ السَّيِّئَاتِ ط

ذَلِكَ ذِكْرٌ لِّلَّذِي لَمْ يَكُنْ لَكَ

(هود: ۱۱۳)

”اور دیکھو، نماز قائم کر دین کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرتے پر، درحقیقت نیکیاں براہیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔“

یعنی جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، اس سب کو رفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور انہی نیکی سے اس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عمل خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے

وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّكَ يَصِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۚ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۚ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝ (الحجر: ۹۴-۹۸)

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ

”ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے، یعنی تبلیغ حق اور دعوت اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی تم میں صبر بھی پیدا کرے گی تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور فحشوں اور ملامتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضایہ۔

اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشُّبْحِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقِرْآنَ الْفَجْرِ طِبْ
قَدْ إِنَّ الْفَجْرَ كَانَ مَشْهُودًا هِ مِنْ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ مَا خَلَّتْ لَكَ صَلَاتُكَ
أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا هِ (بنی اسرائیل ۷۸-۷۹)

”نماز قائم کرو“۔ زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمہارے لئے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر نازل کر دے۔

”نماز قائم کرو“۔ یہ حکم اسی سورۃ میں مشکلات و مصائب کے اس طوفان کا ذکر کرنے کے بعد فوراً دیکر اللہ تعالیٰ نے یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ثابت قدمی جو ان حالات میں ایک مومن کو درکار ہے انامت صلوٰۃ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

اور آخری فقرہ میں مقام محمود کی خوشخبری دی ہے یعنی وہ ثابت قدمی جو اس انامت صلوٰۃ سے حاصل ہوگی اس کا پھل آپ کو مقام محمود کا حصول ہوگا یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے گا جہاں تم محمود خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو، اور تمہاری ہستی ایک قابل تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری

رہنوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے مدد میں ہو کر رہو گے قیامت
 کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محدودیت کا ایک حصہ ہے
 وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّءَ لِقَوْمِكَ مَقَامًا مَّيْمَنًا وَ

دعوت حق میں نماز باجماعت کی اہمیت

اجْعَلُوا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ قُبُلًا مَّقَامًا مَّيْمَنًا وَ
 (۸۷- یونس) ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی
 قوم کے لئے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرا لو اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو
 بشارت دے دو۔

اس آیت کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے غور
 کرنے سے یہ سمجھ میں آئے کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدد سے اور خود نبی اسرائیل کے
 اپنے ضعف ایمانی کی وجہ سے اسرائیل اور مصری مسلمانوں کے ہاں نماز باجماعت کا نظام
 ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہو
 جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سر نو قائم
 کریں۔ اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لئے تعمیر یا تجویز کریں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی
 جایا کرے کیونکہ ایک جگہ ہی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ
 کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی
 جائے گی اس کا پہلا قدم لازماً یہی ہو گا کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے ان
 مکانوں کو قبلہ ٹھہرانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز اور مرجع ٹھہرایا
 جائے اور اس کے بعد ہی ”نماز قائم کرو“ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی
 جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقررہ مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ
 قرآن کی اصطلاح میں ”اقامت صلوٰۃ“ جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نماز
 باجماعت بھی شامل ہے۔

اور مسلمانوں کو بشارت دینے کے معنی یہ ہیں کہ اہل ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور

چزمِ دگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دور کرنا انہیں پر امید بناؤ ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ "بشارت دینے" کے لفظ میں یہ سب معنی شامل ہیں نماز اہل ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا کرتی ہے کہ جو دعوتِ حق کی خدمت کے لئے مطلوب ہے۔

وَأَمَّا أَهْلُكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طہ ۱۳۲) اُنہیں اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند ہو،

یعنی تمہارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کے مقابلہ میں ان حرام خوردوں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں یہ چیز ان کے زادیہ نظر کو بدل دے گی ان کے معیارِ قدر کو بدل دے گی ان کی توجہات کامرکز بدل دے گی وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا

دینِ اسلام حق سے جڑنے کا مضبوط رشتہ

الشَّهَوَاتِ كَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيَاةً (مریم ۵۹) پھر ان کے بعد وہ خلف لوگ جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔

”ضائع کیا“ یعنی نماز پڑھتی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پرواہی برتنے لگے یہ ہر امت کے زوال و انحطاط کا پہلا قدم ہے، نماز وہ ادبین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شرب و رز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محور سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندہ من ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دور اور دور تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدہ کیلئے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی امتوں

لَهُ تَقْسِيمُ الْقُرْآنِ

نہریوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے مدمرح ہو کر رہو گے قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّءَ لِقَوْمِكَ مَقَامًا مِّنْ دُونِنَا ۚ

دعوت حق میں نماز باجماعت کی اہمیت

اجْعَلُوا دِينَكُمْ قِبْلَةً ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ وَكَثِيرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ه

(۱۸۷- یونس) ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لئے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرا لو اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔

اس آیت کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدد سے اور خود نبی اسرائیل کے اپنے ضعف ایمانی کی وجہ سے اسرائیل اور مصری مسلمانوں کے ہاں نماز باجماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہو جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سر نو قائم کریں۔ اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لئے تعمیر یا تجویز کریں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جاسکے کیونکہ ایک بگوسی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم لازماً یہی ہوگا کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز اور مرجع ٹھہرایا جائے اور اس کے بعد ہی ”نماز قائم کرو“ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقررہ مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں ”اقامت صلوٰۃ“ جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نماز باجماعت بھی شامل ہے۔

اور مسلمانوں کو بشارت دینے کے معنی یہ ہیں کہ اہل ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور

تفہیم القرآن

پنہ دگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دور کرو، انہیں پر امید بناؤ ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ ”بشارت دینے“ کے لفظ میں یہ سب معنی شامل ہیں نماز اہل ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا کرتی ہے کہ جو دعوت حق کی خدمت کے لئے مطلوب ہے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طہ: ۱۳۲) اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند ہو۔

یعنی تمہارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کے مقابلہ میں ان حرام خوردوں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں یہ چیز ان کے زادیہ نظر کو بدل دے گی ان کے معیارِ قدر کو بدل دے گی ان کی توجہات کامرکز بدل دے گی وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے خوفِ حق و غور اور دنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا

دین اسلام حق سے جڑنے کا مضبوط رشتہ

الشَّهَوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيَاةً (۵۹- مریم) پھر ان کے بعد وہ خالف لوگ جا نشتین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دو چار ہوں۔

”ضائع کیا“ یعنی نماز پڑھتی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پرواہی برتنے لگے یہ ہر امت کے زوال و انحطاط کا پہلا قدم ہے، نماز وہ ادبِ رباط ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شرب و روزِ جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محور سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندہ صحت سے ہی آدمی خدا سے دور اور دور تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی امتوں

کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شرمسار ہوا ہے۔

در خواہشات نفس کی پیروی کی: یہ تعلق باللہ کی کمی اور اس کے فقدان کا نتیجہ ہے نماز کی اصافات سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی، خواہشات نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے اخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکام الہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہو کر۔

وَمَنْ أَحْسَنُ مَقَالًا مِّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَارًا حَسْبِيَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (لحمہ السجدہ ۳۳)

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں:

اس سے قبل اہل ایمان کو تسکین دینے اور ہمت بندھانے کے بعد ان کو ان کے اصل کام کی طرف رغبت دلانی جا رہی ہے۔ گزشتہ آیت میں ان کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے۔ خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا درجہ اور جنت کا مستحق بناتی ہے اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ جس سے بلند کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں، اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے اس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہوئے گا اظہار کرتا تھا اسے یکایک محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے دوزخ کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان کھولی اس نے تو گویا دوزخ کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھجھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر مینہ بھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجہ کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں اور نتائج سے بے پروا ہو کر

اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے اور اس کام کو کرتے ہو اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

فَلَا تُطِيعُ الْمُكْذِبِينَ
وَدُّوا الْوَقْدَ هَبْ

دعوتِ حق میں مابہنت و مصالحت کی گنجائش نہیں

فَيُذْهِبُونَ ۝ الْقَلَمُ ۸۱۔ ۹۰ تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مابہنت کرو تو یہ بھی مابہنت کریں۔

یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں لچہ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کریں۔ یا تم ان کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کریں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَتَّبِعُ عِبَادُكُمْ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَدْعَاكُمْ مَعَابِدُكُمْ ۝ وَلَا أَتَّبِعُ عِبَادُكُمْ مَا أَعْبُدُ ۝ كَلَّمَ دُجَيْنَكُمُ وَبَنِي دِينَ ۝

(۴۱، ۵۱، ۴۱، ۵۱، ۴۱، ۵۱) الکافرون (۴۱، ۵۱، ۴۱، ۵۱، ۴۱، ۵۱) عبادت تم کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرتے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب بنی اکرم

عزیمتِ حق کا تائیدی پس منظر

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے خلاف قریش

کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رد و نما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کئے دیتے ہیں ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی، حضور نے پوچھا وہ کیا ہے انہوں نے کہا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزلی کی عبادت کریں۔ اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضور نے فرمایا اچھا بھرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی **قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْاَكْفَرُوْنَ** **قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَعْبُدُوْنَ فِىْ مَا كَفَرْتُمْ اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ ۝ (الزمر آیت ۲۴) اِنْ** سے کہو، اے نادانوں! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی) ابن عباس کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضور سے کہا "اے محمد، اگر تم ہمارا معبود بتوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی (عبد بن حمید)

سجید بن میناء (ابو البختری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ (عاص بن ہاشم، اسود بن المطلب اور امیر بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ سے کہا اے محمد، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کئے لیتے ہیں اور اگر وہ چیز جو تم لے آئے ہو اس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے یا ہماری چیز اس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پا لو گے" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ **قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْاَكْفَرُوْنَ** (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ہشام نے بھی سیرت میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔)

وہب ابن منبہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حمید، ابن ابی حاتم)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفار قریش نے حضور کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو لوگ جواب دے کر ہمیشہ کے لئے ان کی اس امید کو ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دوا کر کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کو پس گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی برادری، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتدائے قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ انہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں دمج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے قول اور عمل میں برائت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا مؤثر علیت کہہ دینا چاہیے۔ اگر دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداخلت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ سورۃ اس وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مرکب گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانہ میں کافر و مشرک تھے، اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔ یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ، میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے معبود کی بندگی کے لئے تیار نہیں ہو اس

لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے برادرت، بیزارى اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر بالوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا یہی اعلان برادرت اور اظہار بیزارى اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے چنانچہ سورۃ یونس میں فرمایا ”اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں“ (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا ”اے نبی، کہہ دو کہ لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (سن لو کہ) کہ اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمہاری موت ہے“ (آیت ۱۰۰) سورۃ شعراء میں فرمایا ”اے نبی اب اگر یہ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں“ (آیت ۲۱۴) سورۃ سبا میں فرمایا ”ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی کہو، ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان جھیک جھیک فیصلہ کر دے گا“ (آیت ۱۲۵، ۱۲۶) سورۃ نمر میں فرمایا ”ان سے کہو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ملنے والی نہیں“ (آیت ۳۹، ۴۰) پھر یہی سبق سورۃ طہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ”تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے (جن کو تم خدا کو جھوٹ کر پوجتے ہو) قطعی بے زار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور تمہارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہو گئی اور بیڑ لگ گیا۔ جب تک تم اللہ واحد

برایمان نہ لاؤ“ (الممتدہ آیت ۴) قرآن مجید کی ان پے درپے توضیحات سے اس شبہ کی کھجانش
نک نہیں رہتی کہ **لَا تَدْعُوْا مَعَٰلِمَكُمْ** کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور ہتھیار اپنے
دین پر چلنے دو، بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورۃ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ **لَا تَدْعُوْا**
ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے نالوں کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اسے چھوڑ
کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو“ (آیت ۱۴)

اس کی تفصیل بھی لفظ تفصیلات جو سورۃ الکافرون
مومن کا کفر سے اعلان براءت کے ضمن میں عنوان بالا میں گزر چکی ہیں۔ وہیں

ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں جس بات پر توجہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

مخالفت تو قیس خواہ کتنی طاقت ور ہوں اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جائے۔

اور ان کی بالکل پروا نہ کی جائے

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْهُ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْهُ (المذثر ۱، ۲، ۳) اے اور ٹھہرا ہوا
کر لیٹے دلے، اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو،

یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اس دنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے اس کا پہلا کام
ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان سبے میں ان سب کی نفی کر دے اور ہانک
پکاسے دنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں
ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے آذان کی
ابتداء ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل
ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے
تو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرہ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ
نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امرت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع
کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ ان
آیات کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے برادرت، بیزارسی اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلان برادرت اور اظہار بیزارسی اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے چنانچہ سورۃ یونس میں فرمایا ”اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں“ (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا ”اے نبی، کہہ دو کہ لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (سن لو کہ) کہ اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمہاری موت ہے“ (آیت ۱۰۴) سورۃ شعراء میں فرمایا ”اے نبی اب اگر یہ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں“ (آیت ۲۱۶) سورۃ سبا میں فرمایا ”ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا، ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی کہو، ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا“ (آیت ۱۲۶، ۱۲۵) سورۃ نمر میں فرمایا ”ان سے کہو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ملنے والی نہیں“ (آیت ۳۹، ۴۰) پھر یہی سبق سورۃ طہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ”تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بے زار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور تمہارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہو گئی اور یہ بڑھ گیا جب تک تم اللہ واحد

براہیمان نہ لاؤ“ (الممتحنہ آیت ۴) قرآن مجید کی ان پے درپے توضیحات سے اس فقہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ **كَلِمَةً مِّنْكُمْ** کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو، بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورۃ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ **لَا تَنفِرُوا**، ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو“ (آیت ۱۴)

اس کی تفصیل بھی لفظ تفصیلات جو سورۃ الکافرون
مومن کا کفر سے اعلان برأت کے ضمن میں عنوان بالا میں گزر چکی ہیں۔ وہیں

ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں جس بات پر توجہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

مئی لفت قوتیں خواہ کتنی طاقت ور ہوں اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جائے۔

اور ان کی بالکل پروا نہ کی جائے

يَا أَيُّهَا الْمَدَنِيُّ قُمْ فَأَنْذِرْهُ وَذَكَرْهُ فَاذْكُرْهُ (المذکر ۱، ۲، ۳) اے اور طوطی
 کر لیتے دے، اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو،

یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اس دنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے اس کا پہلا کام
 ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کر دے اور ہانکے
 پکارسے دنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں
 ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر کو رب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے آذان کی
 ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل
 ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے
 تو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرہ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا رب سے زیادہ
 نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امرت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع
 کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ ان
 آیات کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

نبوت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ مشرک سا گڑھ تھا بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام غلوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تہذیبی گڑھ تھا اور تشریش کے لوگ اس کے بنیاد پر تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تنہا اٹھنا اور مشرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند کر دینا بڑے جان جو کموں کا کام تھا۔ اسی لئے ”اٹھو اور خبردار کرو“ کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ”اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو“ اپنے اندر یہ فہم بھی رکھنا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں ان کی ذرہ پرواہ نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب ان سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کیلئے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی جاسکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو۔ وہ اللہ کی خاطر کیلکساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

دعوت حق کے کارکنوں کو خدا پرستی کی راہ میں کیا کچھ کرنا چاہیئے وہ یہاں سے کہ خدا کی بندگی کے مقابلے میں وطن اور قوم کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اَرْضِيْكُمْ وَاَرْضِيْكُمْ حٰثِيَ حٰثِيَ فَاَلْعَبُدُوْا ۝
اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔

یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف، مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے جہاں تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ، تم کو تو مروجہ وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہونا ہے جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا

اور قوم و وطن اور ملک کو لات مار دے گا جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چٹا رہے گا یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محب قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

۱۔ اللہ کی بندگی کے مقابلے میں جان کی پرواہ نہ کی جائے گی۔
 مَوْلَا نَفْسٍ وَآيَةُ الْعُقُوبَةِ قَدْ خَمَرَ اَلَيْسَا تَزْجَعُونَ (۵۸، النعوت)
 وہ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔
 یعنی جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے ہمیشہ رہنے کے لئے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہذا تمہارے لئے فکر کے لائق مسئلہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے بلکہ اصل لائق فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کئے جائیں۔ ہر کار تمہیں پٹ کر ہماری طرف ہی آئے ہے اگر دنیا میں جان بچانے کے لئے ایمان کھو کر آئے اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا اور ایمان بچانے کے لئے جان کھو کر آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا، پس فکر جو کچھ بھی کرتی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہو ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

بندگی، سلامتی کا راستہ
 وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
 لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا
 (۵۸، النعوت)
 ایمان لائے ہیں اور جہتوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، دلیان وہ ہمیشہ رہیں گے؛ کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لئے۔
 یعنی اگر ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گے

اور دنیوی نقطہ نظر سے سراسر ناکام بھی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہوگی اور تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔

بندگی کی راہ پر چلنے والوں کے صفات یہ بیان کیے گئے ہیں :-

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ (العنکبوت: ۵۹)

ان لوگوں کے لئے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

(الف) صبر کیا ہے یعنی جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں

کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہیں۔ جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جانوں

پر پھیلا ہے اور منہ نہیں موڑا ہے نہ کہ ایمان کے غامضوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے اور ان کی طرف ذرا برابر التفات نہیں کیا ہے۔ کفار و فاسق کو اپنے سامنے پھیلتے پھولتے

دیکھا ہے اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی ہے۔

(ب) اُزب پر بھروسہ کرتے ہیں، یعنی جنہوں نے بھروسہ اپنی جائیدادوں اور اپنے

کاروبار اور رہنے کے لئے مکانات پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا جو اسباب دنیوی سے قطع نظر

کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ پہنچنے اور ہر طاقت سے ٹکر جانے

کے لئے تیار ہو گئے اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے جنہوں نے اپنے رب

پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہوگا اور یقین

رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں

بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

وَكَايْنِ مِّنْ دَآئِبِهِ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ
يُرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ہجرت ترقی درجات کا ذریعہ

(۱۰۶۰) المکبوت آیت ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رزق بھی وہی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

یعنی ہجرت کرنے میں تمہیں فکر جان کی طرح فکر و نگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے

آخر یہ بے شمار چرند پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور

پانی میں پھر رہے ہیں ان میں سے کون اپنا رزق اٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل جاتا ہے لہذا تم یہ سوچ سوچ کر بہت نہ مارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کیا میں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمہیں بھی دے گا ٹھیک یہی بات ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمائی تھی، انہوں نے فرمایا:

”کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے مل رہے گا اور دوسرے کو ناچیز بنائے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بولتے ہیں نہ کاتے ہیں، نہ کوٹھڑیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے دھتوں کو نور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اسے کم اعتقاد تو تم کو کیوں نہ پہناتے گا اس لئے مکر مند نہ ہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے یا کیا پہنیں گے ان سب چیزوں کی تلاش میں تو فیر تو میں رہتی ہیں۔ تمہارا آسمانی باپ جاننا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ تم پہلے اس کی بلو شاہی اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو۔ یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی کل کے لئے فکر نہ کرو کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا آج کے لئے آج ہی کا دکھ کافی ہے“ (تسی باب ۶- آیات ۲۳، ۲۴)

قرآن اور انجیل کے ان ارشادات کا پس منظر ایک ہی ہے دعوت حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آ جاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالم اسباب

کے تمام سہاروں سے قطع نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جو کھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں درحقیقت اس طرح کے حالات بدستے ہی ان لوگوں کی طاقت سے ہیں جو مستقبل پر بے گراٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو اٹیکر کرنے کے لیے بے معرک تیار ہو جائیں انہی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حکمت تبلیغ

ابتدائیہ

اسلامی تحریک انسانیت کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کے لئے آہستی ہے یہ خالص ایک نظریاتی تبلیغی تحریک ہوتی ہے اور اپنے نظریے کو پوری حکمت و دانشمندی اور عزیمت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

چند اصولی پہلو | اس طرح ہر اسلامی تحریک انسان کی پوری زندگی میں بندگی رب کے نفاذ کی دعوت لے کر آہستی ہے وہ خدائی احکام کے نفاذ و ترویج کی دعوت دیتی ہے چونکہ احکام کا تعلق انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے اس لئے وہ بنیاد پر وقت، فرد، معاشرے اور حکومت کی اصلاح کے لئے اقدامات کرتی ہے۔ فرد کی اصلاح کے لئے اسے بنیادی طور پر برکات ہوئے معاشرے میں سے صرف وہی افراد چیلنے ہوتے ہیں جو اصلاح کو قبول کر کے اپنی عملی زندگی میں اسے نافذ کریں، اس لئے اس کی رکنیت کے لئے اصلاح قبول کرنے والے اور اصلاح نہ قبول کرنے والوں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے تاکہ جس نوعیت کے معاشرے کی تشکیل کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس کا ملکا سامونہ اس کی اجتماعی زندگی میں نظر آئے اور بندگی رب کے اثرات تحریک میں شامل افراد کی زندگیوں میں نمایاں ہوں پھر انہیں افراد کی مدد اور تنظیم سے وہ معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور معاشرے کی اصلاح کے تناسب سے ہی حکومت کی اصلاح کی کوشش ممکن ہوتی ہے۔

اسلامی تحریک ایک باطل نظام کے غلبے کی حالت ہی میں نمودار ہوتی ہے۔ تاکہ اس غلبے کو توڑ سکے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں اقامت دین کی کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی خود اسلامی حکومت اور اس کے کارپرداز ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کا کام کرتے ہیں۔ باطل نظام کے غلبے کی حالت کا فرانہ معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے

بلغ ابتدائہ از سید اسعد گیلانی

ابتدائیہ

اسلامی تحریک انسانیت کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کے لئے آہستی ہے یہ خالص ایک نظریاتی تبلیغی تحریک ہوتی ہے اور اپنے نظریے کو پوری حکمت و دانشمندی اور عزیمت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

چند اصولی پہلو | اس طرح ہر اسلامی تحریک انسان کی پوری زندگی میں بندگی رب کے نفاذ کی دعوت لے کر آہستی ہے وہ خدائی احکام کے نفاذ و ترویج کی دعوت دیتی ہے چونکہ احکام کا تعلق انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے اس لئے وہ بیک وقت فرد، معاشرے اور حکومت کی اصلاح کے لئے اقدامات کرتی ہے۔ فرد کی اصلاح کے لئے اسے بنیادی طور پر گھر سے ہوئے معاشرے میں سے صرف وہی افراد چیلنٹے ہوتے ہیں جو اصلاح کو قبول کر کے اپنی عملی زندگی میں اسے نافذ کریں، اس لئے اس کی رکیزیت کے لئے اصلاح قبول کرنے والے اور اصلاح نہ قبول کرنے والوں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے تاکہ جس نوعیت کے معاشرے کی تشکیل کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس کا ملکا سامنہ اس کی اجتماعی زندگی میں نظر آئے اور بندگی رب کے اثرات تحریک میں شامل افراد کی زندگیوں میں نمایاں ہوں پھر انہیں افراد کی مدد اور تنظیم سے وہ معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور معاشرے کی اصلاح کے تناسب سے ہی حکومت کی اصلاح کی کوشش ممکن ہوتی ہے۔

اسلامی تحریک ایک باطل نظام کے غلبے کی حالت ہی میں نمودار ہوتی ہے۔ تاکہ اس غلبے کو توڑ سکے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں اقامت دین کی کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی خود اسلامی حکومت اور اس کے کارپرداز ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کا کام کرتے ہیں۔ باطل نظام کے غلبے کی حالت کا فرانہ معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے

بجہ ابتدائیہ از سید سعید گیلانی

اور بگڑے ہوئے ام نہاد مسلم معاشرے میں بھی۔

خالص کافرانہ معاشرے میں باطل نظام کے خلاف جدوجہد کرنے میں تحریک اسلامی کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کے نتیجے میں معاشرے کا جو فرد بھی اسلامی دعوت کو قبول کرتا ہے اپنی ذات، اندازان اور معاشرے سے پہلے مرحلہ پر ہی الگ کر اپنا مخلص جانشین یا نیا پیشہ اور بہادر ہونا ثابت کر دیتا ہے اور دعوت کو قبول کرنے کے اولین مرحلے پر ہی اس تحریک کے بہترین کارکنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ تحریک کے سکھاتی ہے وہ تن میں دھن سے قبول کرتا چلا جاتا ہے قیمتی قیمتی مفاد کو وہ تحریک کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور بڑی سے بڑی آزمائش کی بھٹی سے گزر جاتا ہے خواہشات نفس سے لے کر غالبان محلات تک کوئی اس کی راہ کا روڑا نہیں بن سکتے۔ لیکن بگڑے ہوئے مسلم معاشرے میں جہاں باطل نظام مسلط ہو گیا ہو وہ مدعیان ایمان کی بڑی تعداد کو اپنے غالب اثرات کے ساتھ مصالحت کرنے کے نتیجے میں اس مقام پر لے آتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لئے محض آزار و دعوت کافی نہیں ہوتا اس لئے کہ انحطاط کے جس مقام تک وہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ افراد ایمان کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے ہوئے ہوتے ہیں تحریک اسلامی کو ایسے ایک مسلم معاشرے میں کام کرنے کی یہ ابتدائی سہولت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ اسے اسلامی دعوت کے مشکوین سے سابقہ پیش نہیں آتا اور کافی عرصہ کڑی آزمائش کے مراحل آنے تک لگ جاتا ہے لیکن ایسے معاشرے میں مخلص کارکنوں کی چھانٹی اور تیاری کے کام میں بہت دیر لگ جاتی ہے اس لئے کہ افراد ایمان کے ساتھ جو منہا ایمان اخلاقی بنیادیں نہیں ملتی ہوتی ہوتی ہیں انہیں جن جن کنگان نہایت مشکل اور طویل کام ہوتا ہے۔

اسلامی نظام صرف اسی معاشرے میں قائم مقصور ہوتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے احکام اپنی پوری روح اور تفصیلات کے ساتھ نافذ ہوں اور اسے چیلانے والے کسی سرپرست یا ناظمین اس کے پابند اور کاربند ہوں اور باطل نظام وہاں قائم ہوتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ دوسروں کے احکام و قوانین کا

نفاذ ہوں چاہے انہیں ملانے والے نام نہاد مسلمان ہی کیوں نہ ہوں تحریک اسلامی کا مقصد وجود ہی یہ ہو تب ہے کہ وہ اللہ کے احکام و قوانین کا اجرا کرے۔ یہی مقصد ہر مسلمان کی زندگی کا فردا فردا بھی متعین کیا گیا ہے۔

لیکن ہمارے پیش نظر ایک اسلامی تحریک **دعوتِ دین کے طریق کار کا مسئلہ** کے اس طریق کار سے جو وہ اصلاح فرد

اور اصلاح معاشرہ کے لئے اختیار کرتی ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنی دعوت کے لئے راستہ بناتی ہے، ظاہر ہے کہ جو طریقہ عام دنیوی طاقتیں اختیار کرتی ہیں وہ طریقہ ایک اسلامی تحریک اختیار نہیں کر سکتی۔ جو اخلاق کی پابندی سے بے نیاز اور مخاطب میں اطمینان حق پیدا کرنے کی بجائے اس کی حرص و ہوا اور خواہش مفاد پرستی کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے انداز اختیار کر کے تحریک اسلامی کی کامیابی ایک تحریک اسلامی کی کامیابی شمار نہ ہوگی، اور ظاہر ہے اس طور طریقے کو اختیار کرنے کے بعد پھر تحریک اسلامی کی ضرورت رہے گی۔ باقی نہ رہے بلکہ دنیا کی عظیم ترین تحریک اسلامی کو جو خدائی ہدایت دی گئی تھیں اور جن ہدایت کی پابند ہو وہ اسلامی تحریک بے جو قیامت تک دنیا میں نمودار ہوان کی روشنی میں تو کافروں تک کو فتنہ مٹا دینا، اسے میری قوم۔ اسے قوم کے اکابر، کہہ کر خطا کرتا ہے اور اسے واضح ہدایت ہے کہ

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ
بِجَاوِلِهِمْ بِأَلْسِنَتِهِمْ أَحْسَنُ

(النحل ۵۱: ۱۲)

”اے رب کے راستے کی طرف دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ

اور لوگوں سے مباحثہ کر ویسے طریقے پر جو بہترین ہو“

ظاہر ہے کہ تحریک اسلامی جس اسلامی دعوت کی علمبردار ہے اس دعوت کو ذہنیہ قرار دینے والے ملک الملک نے اس دعوت کو پیش کرنے کا طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے اور اس مخصوص طریقے کے سبب اسلامی تحریک دوسری جماعتوں سے ممتاز اور نمایاں قرار پاتی ہے یہ طریقہ چھوڑ دیا جائے تو پھر دین دار قسم کے لوگوں کا ایک جھنجھلا ہوا گروہ

تو باقی رہ جاتا ہے جو غم و غصہ سے بھرا ہوا جملہ منہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے مزاج اور طریقہ کار کے لحاظ سے تحریک اسلامی نہیں رہ جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ تو دعوت اسلامی کو بٹہ کٹنے کے مترادف ہے خدا کے ہاں اپنی کہی ہوئی ایک ایک بات کی جواب دہی سے بے خوف مقررین کے گردہ کو اسلامی تحریک کے کارکن کہنا مشکل ہے ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو دعوت اسلامی کہنا دشوار ہے اور ان کے لاتے ہوئے نظام کو اسلامی نظام سمجھ کر اس سے فلاح انسانیت کی امیدیں وابستہ کرنا بھی خیال خام ہے۔

دعوت اسلامی صبر کا طویل راستہ

درحقیقت اسلامی دعوت کا راستہ صبر آزما اور طویل ہے اور جسے عجلت ہو اور اس کے لئے صبر مشکل ہو اسے یہ راستہ راس نہ نہیں آتا ہے۔ ہر راستے کے لئے زاد راہ ہوتا ہے اور اسلام کے راستے کا زاد راہ ہی صبر اور توکل علی اللہ ہے جن البنا شہیدؒ نے اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتے ہوئے کیا خوب بات کہی تھی۔

”آپ کا راستہ ایک متعین راستہ ہے۔ مجھے یوں اطمینان ہے کہ یہ منزل تک پہنچنے کا سب سے زیادہ محفوظ راستہ ہے۔ اسی میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح آپ کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے سوا دوسری کوئی صورت بھی نہیں ہے مردانگی تو صبر کو نشا اور مسلسل اور خاموش کام میں ہے جو کوئی پہنچنے سے پہلے ہی پھل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے وہ دفت سے پہلے ہی پھول توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس جلد بازی کے حق میں نہیں ہوں جس کو جلدی ہو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اس صبر آزما دعوت کو چھوڑ کر دوسری جماعتوں کا رخ کرے جہاں اس کے جذبہ عجلت پسندی کی تسکین کا سامان ہو سکتا ہے جو ہمہ ملے ہوئے صبر سے کام لیتا ہے اس کا اجر اس کے اللہ کے پاس ہے جو ضائع ہونے والا نہیں ہے پھر یا تو کامیابی و کامرانی قدم چومے گی یا ہم مرتبہ شہادت و سعادت سے بہرہ مند ہوں گے۔“

دعوت کے اس سارے کام میں جو بات کسی لحاظ فراموش نہیں کی جاسکتی وہ یہ

ہے کہ ہم کس کا کام کر رہے ہیں اور جس کا کام کر رہے ہیں وہ ہمارے اس کام سے باخبر ہے یا بے خبر ہے اور باخبر ہے تو وہ غالب، ملکوں کا مالک، ابرو بہن پر قادر ہے یا نہیں ہے۔ اگر غالب وہی ہے تو پھر وہ جب ہمارے کام کی کامیابی کا راستہ کھول دے گا، مزدور کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کا کام اپنی مزدوری کی نعمانت کے ساتھ بڑا کرے اور اس نظام پر ہے کہ مالک، ملک کا کام کرنے والوں کے لئے مزدوری کی نعمانت موجود ہے۔

سیر کے اس طویل راستے کی طرف خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رہنمائی فرمائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے کربلا کی طرف صوبت ماحول میں کئی برس سے دعوت اسلامی پیش فرما رہے ہیں اور ہر طرف سے انکار و تکویر پر اسرار ہے۔ حضور دیوار کعبہ سے ٹیک لگاتے تشریف لے رہے ہیں۔ اتنے میں حضور کے ایک جانثار ساتھی جن کے مصائب زبان زد عام ہیں تشریف لائے ہیں اور اسلامی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے ایک مشہور و معروف سوال کرتے ہیں۔ وہ رخصوں سے چور گریبان چاک، تشدد کا نشانہ مجسم سوالیہ نشان بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ حضور اسلامی نظام کب آئے گا، معیشت کے یہ دن کب گئیں گے؟

یہ سوال سن کر حضور کا چہرہ متماٹھتا ہے جیسے حضور کو اپنے جانثار ساتھی کا یہ کلمہ ناگوار گزرا ہے۔ حضور دیوار کعبہ کی ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں "ارت کے بیٹے خباب، ابھی سے گھبرا گئے تم سے پہلے جن لوگوں نے یہ کام کیا ان میں سے بعض کو تو لوگوں نے گڑھے کھود کر زمین میں گاڑ دیا اور پھر آ رہے سے حیر کر دوڑ گئے۔ کر دیا اور بعض کو گاڑ کر لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت اور ہڈیاں الگ کر دیئے گئے اور تم ابھی سے گھبرا گئے ہو۔"

اور پھر وقفہ کے بعد فرمایا۔

"ایک وقت آئے گا جب اللہ کا دین سر بلند ہوگا اور ایک معمولی عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سونا اٹھاتی چلی جائے گی۔ لیکن تم تو بے سبری کرتے ہو۔"

سیر۔ مسلم کا کام آزمائش میں ثابت قدمی
راہِ حق کا زور اور صبر و حکمت مخالفین کے مقابلے میں شرافت گالیوں کے بدلے

میں رہائیں۔ اللہ کے دین کی اس راہ میں پہلے ہی یہ زور اور راہ لے کر ہر مسافر و پیادہ رہائیں اور رخ
 کے ہر دور میں جس کسی نے دعوتِ اسلامی کو اپنی منزل بنایا اور رضا سے الہی کو اپنا مقصود زندگی
 ٹھہرایا۔ اس کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

حضرت انس بن مالک سے ترمذی نے روایت کی ہے کہ:

نبی سلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آزمائشِ نبی سخت ہوگی۔ اتنا ہی بڑا انعام ملے گا بشرطیکہ
 آدمی مصیبت سے گھبرا کر راہِ حق سے ہٹا نہ کھڑا ہو اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت
 کرتا ہے تو اس کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لئے آزمائشوں میں ڈالتا ہے پس
 جو لوگ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں اور سیر کر پیں تو اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور جو
 لوگ اس آزمائش میں اللہ سے ناراض ہوں تو اللہ بھی ان سے ناراض ہوتا ہے۔

اس راستے میں تو بدی کو نیکی سے روکنے کی تلقین کی گئی ہے فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ (دَقِّعَ بِالسَّيِّئَةِ حَتَّىٰ أَحْسَنَ) (ترمذی ۳۴)

”نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں تم بدی کو اس نیکی سے دفع کر دو جو بہتر ہے۔“

صبر و حکمت اسلامی تحریک کا بنیادی طرز عمل ہے تحریک کا دورِ بنیادی سخت آزمائشوں
 سے بھرپور ہوتا ہے اور اس دور میں تحریک کے ہر رکن کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ مصیبت
 کے مقابلے میں سیر سے کام لے اور مستقل مزاجی سے اپنے طریقے پر قائم رہے۔ حضور نے
 اپنے ایک ساتھی سے خود فرمایا کہ اسلام کے سلسلہ میں سب سے جامع بات یہ ہے کہ:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مشکوٰۃ)

”وہ آمنت باللہ کہو اور پھر اس پر جم جاؤ۔“

حضور کی اسلامی تحریک کا کئی دور اس کی بہترین مثال ہے وہ بڑے بڑے جوان
 مروانِ اسلام جنہوں نے بعد میں روم و ایران کو فتح کیا اور قلعہ خیبر کے دروازے کو اپنی قوت
 بازو سے اکھاڑ دیا جنہوں نے بدر کے اندر کفار کے ہتھیاروں کو ٹکڑی کر دیا اور کھیرے کی طرح

کاٹ کر رکھ دیا وہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹے مارے اور لہو لہان کئے گئے لیکن سیر کی مہران ان کے لمبوں پر دراستقامت کی توت ان کے قدموں میں قائم رہی اس لئے کہ انہیں ابھی راست اقدام کا حکم نہ ملا تھا اور نہ ابھی تحریک برون کے لئے بوری طرح تیار تھی۔ ابھی تو سونے کو تپا کر گندن کیا جا رہا تھا۔ ابھی تصادم کے لئے متوازن اور مناسب توت جمع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ انہی دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ساتھی کو گوشہ ددر کے ایک بنی کا قصہ سنایا جس قصے میں خود حضور کی اپنی قبیل موجود تھی حضور نے فرمایا۔

”وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دعوت دینے کے جرم میں ایک بنی کو انسانا لگایا کہ لہو لہان کر دیا اور بنی کا سال یہ تھا کہ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جلتے اور یہ کہتے جاتے تھے اے اللہ میری قوم کے اس جرم کو معاف کرے یہ نا نافع لوگ اصل حقیقت کو نہیں جانتے۔“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکے سے مدینے کی نقل مکان نے اس عظیم لاپی تحریک کے سامنے دور ضعف اور دور قوت اور سرے الفاظ میں عدم مزاحمت اور مزاحمت یا قوت کے عدم استعمال اور استعمال قوت کے فرق کو بوری طرح نمایاں کر دیا اور مدینہ کی فصل مکانی راست اقدام کے لئے واضح علامت بن کر سامنے آگئی۔ لیکن جب اپنی فوجی تاسخ علامت کسی تحریک کے سامنے موجود نہ ہو تو اسے راست اقدام کرنے کے لئے ہزار بار سو جلازم ہے اس لئے کہ تحریک اس کی کوئی حصہ نہیں ہوتی جسے کسی طرح جب پاس نہ ملے مگر اسے کر کے نور بھوڑ دیا جائے اور جب دل جلتا بنا لیا جائے یہ ایک ایسا امانت ہے جو صدیوں بعد کسی مجلس سم گم کے حوالے ہوتی ہے۔

تحریک کے ساتھ چلنے پر تھے خدا کی راہ میں سبر و استقامت کی تلقین کرنے پر تھے خود خالق کائنات نے فرمایا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُدْخِلُوْا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَقُوْا
مَنْ تَبْكُم مِّنْهُمْ اَوْ رَاٰ الْيَامِسَاءَ وَالْجَسْرَاءَ وَذُلُّوا حَتّٰی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَعَاذَ اللَّهِ إِنَ الْإِنسَانَ أَفْكَارًا

(البقرة ۲۱۴)

(اللہ قریب)

”کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پردہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں۔ مہینہ نہیں آئیں۔ ہمارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چنچ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔“

ہمارے دور کی تحریک اسلامی کے عظیم رہنما سید محمد دوہیؒ نے ۱۹۶۳ء میں، ایک باہر حکومت کے جبروت کی جلیق ہوئی گولیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا خوب کہا تھا۔

”میرے عزیز ساتھیو! اللہ کے دین کے لئے جس کو کام کرنا ہو اس میں دو سفیق ضرور ہونی چاہئیں ایک صبر و دوسرے حکمت۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رکاوٹ بھی ڈالی جائے اس پر نہ تو متشعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو بیٹھیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد کے بجائے رکاوٹ ڈالنے والے کا مقصد پورا کریں۔ بلکہ ہر رکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جوں کا توں قائم رہنا چاہیے اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جو حکمت کے مطابق ہو۔ پھر آگے چل کر حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں بلکہ آپ میں یہ سلاحت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دوسرے راستے بروقت نکال لیں جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پا کر بٹخ جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر بے صبر بھی ہو تو پھر اتنا اس رکاوٹ سے اپنا سر بھوڑ لیتا ہے بارہا روئی ہے یہ باز آتا ہے مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح جوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی بھٹوئی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں جمنہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور

دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہ نکلتا ہے۔
بھرنے والے راستوں کے مقابلے میں کام کے دوسرے راستوں کی وضاحت کرتے
ہوئے کہا۔

”ہمارے لئے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی دعوت پھیلانے کی بس یہی ایک صورت
نہیں ہے کہ ہم جلسوں میں تقریریں کریں اور ہزاروں آدمی انہیں سنیں یہ تو کام کی ایک
صورت ہے آپ نین نین چار چار آدمیوں کے دھوکے کی شکل اختیار کر کے غلطی میں
بھیل جائیں گھر گھر اور دکان دکان اور مسجد مسجد جائیں، فرداً فرداً لوگوں سے ملے ایک
ایک شخص کو بتائیے کہ تحریک اسلامی کیا ہے اس کا نظام کیا ہے اس کا مقصد کیا ہے
اس کا طریق کار کیا ہے وہ کن چیزوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے اور کن چیزوں کو قائم
کرنا چاہتی ہے جو لوگ بحث میں الجھنے کی کوشش کریں ان سے اچھے بغیر گزر جائیں
آپ کا طریقہ اُدْعِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کی رہائی ہدایت
کے مطابق ہونا چاہیئے آپ کی زبان شیریں ہو آپ کے انشائے پاکیزہ ہوں، آپ کا ہر تاؤ
شریفانہ ہو۔ آپ کو جواب بھی بھلائی سے دیں اور اپنی زبان ہی سے نہیں اپنے
روئے سے بھی یہ ثابت کر دیں کہ آپ فی الواقع بدی کی جگہ نیکی قائم کرنے والے ہیں اس
کے بعد یقین رکھئے کہ اللہ کی رحمت آپ کے ساتھ ہوگی اور جتنا کام آپ کریں گے اس
سے زیادہ کام اللہ کے فرشتے آپ کے ساتھ مل کر کریں گے۔“

اب آپ دوبارہ نبوت کی اسلامی تحریک میں سے حکمت کی مثال لیجئے یہ مثال صلح حدیبیہ
کی ہے۔ کفار نے مزاحمت پر آمادہ ہیں مسلمانوں کی نفی اپنی تعداد و حالات، محل وقوع اور قوت
کے لحاظ سے ناکافی ہے اور تبلیغ دین کے لئے نئے نئے راستے نکالنے کی ضرورت ہے
تاکہ تحریک کفار کی مزاحمت پر طرح دے جاتے ہیں۔ بعض شرائط صلح ہر مسلمانوں کو
ناپسند ہیں اور کمزوری کا نشان نظر آتی ہیں، لیکن تاکہ تحریک آئندہ کے وسیع تر تبلیغی امکانات
پیدا کرنے کے لئے صلح اور مصالحت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قرآن صلح و مصالحت کی
اس کا دروازی کو فتح مبین قرار دیتا ہے اور واقعی وہ فتح مبین ہی بن کر رہتی ہے۔ تحریک کو

ایک بڑے دشمن کے ساتھ مستقل تصادم سے چند دنوں کے لئے تہات مل جاتی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر متعدد چھوٹی بڑی فتوحات، قبائل سے معاہدات اور تبلیغ کے ذریعے تحریک کے لئے کامیابی کے بے شمار دوسرے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ جوش و جذبہ اور حکمت کا رکابا ہی نعلین متوازن اور معقول ہو تو تحریک کا کام بڑھتا ہے۔ جوش و جذبہ نہ ہو صرف حکمت ہو تو راستہ طویل اور سفر لمبہ ہو جاتا ہے صرف جوش و جذبہ ہو اور حکمت نہ ہو تو تحریک راستے میں آنے والی کسی بھی جہان سے سر جھوڑ کر خستہ ہو جاتی یا میلوں دور پیچھے چلی جاتی ہے۔ جوش و جذبہ کی مثال پٹرول کی سی ہے۔ پٹرول کے ڈرم کو بیک وقت آگ لگا لیجئے تو وہ تباہی کا سامان ثابت ہوگا اور گاڑی کے انجن میں ڈال کر تھوڑے تھوڑے کنٹرول کے ساتھ استعمال کیجئے تو طویل منزلیں بھی مختصر ہوتی چلی جائیں گی۔

غرض دعوت دین میں حکمت تبلیغ ایک بنیادی ضرورت ہے جو اسلامی تحریک کے ہر کارکن کے لئے جاننا ضروری ہے اگر کارکن حکمت تبلیغ سے محروم ہوں تو دعوت دین کا کام ممکن نہیں رہ جاتا۔

اسلام ایک تحریک | اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانے سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈروہ لوگ تھے جن کو رسول اللہ اللہ کے فرستائے، کہا جاتا ہے کہ یہیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لا محالہ ان ہی لیڈروں کے طرز عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرز عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لئے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

واحد راستہ۔ اسوۂ حسنہ | جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لئے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی وقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں۔ مگر ان سے مکمل الحکم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے مہد صید NEW TESTAMENT میں مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال ملتے ہیں، جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کیسے ماحول سے اسے سابقہ پیش آنا ہے لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیحؑ کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہی عقیقت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لئے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں صرف ایک

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا ایڈریس جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے نیا ملک اور پھر دنیا کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل و صورت داخلی و خارجی بالسی اور نظم مملکت کے سبج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مفید تفصیلات ملتی ہیں لہذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر سامنے آئے تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے

آغاز کار دعوت توحید

اخلاقی تمدنی معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ اجائز معاشی انتفاع

بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذلت بھی پھیلے ہوئے تھے خود آپ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے ساری قوم جمالت، اخلاقی پستی، افلاس طوائف المنکر کی اور غارتگی میں مبتلا تھی۔ بحرین سے یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایلانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سورت خوری کے بادل میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل افریقہ میں حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی اس کے ہم مذہبوں اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی اتحاد رکھنے والوں کا ایک جھٹھا خود حجاز اور یمن کے درمیان بحران کے منہام پر موجود تھا یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اہم ترین مسئلہ توحید | اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنمائی نگاہ میں دوسرے مسائل

صرف اسی ایک گونہ پایا ہے۔ یہاں کوئی ہر لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلہ اسی ایک کا حصہ ہے یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار سردار ہے یہاں کوئی سرکار کوئی ان دانا، کوئی راجہ مہاراجہ، کوئی دلی یا کار ساز کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں کسی کو بدترن و فحش حاصل نہیں ہے کہ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں رب اور مولیٰ صرف ایک ہے لہذا نو بر غلامی، اطاعت، ہر باندن سے انکار کرنے اور اسی ایک کا نظام، طبع اور پابند حکم بن بابہ تمام اسلحہ کی جڑ اور بنیاد ہے اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی ہر عمارت اُدھیر کرانہ صرف ایک نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انہ فی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں

بجز توحید ہر مسئلے سے صرف نظر | محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیاد پر اسلحہ کی دعوت کو بغیر کسی سابقہ تباہی اور بغیر کسی

تمہیدی کارروائی کے براہ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی مہر بھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لئے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹے ہی اس نے لا الہ الا اللہ کا اعلان کر دیا اس سے کم کسی چیز پر اس کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ پیغمبرانہ جرات اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اسلحہ کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید

ہو سکتے ہیں۔ جو آپ کی طرف لا الہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آمین۔ اسی چیز میں ان کے لئے کنش ہو۔ اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں اور اسے اساس پر وہ کام کرنے کے لئے اٹھیں لہذا اسلامی تحریک چلانے کے لئے جس خاص قسم کے تدبیر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید تصور حیات | توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہوا جڑ بنیاد سے اکٹڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے آج دنیا آپ کے مؤذنوں کو اشلہد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والو کہ اس میں کوئی مسئلہ اور کوئی منصف نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات ————— مجھ تک نہیں پہنچتے کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے۔ کوئی قانون مجھے تسلیم نہیں کسی کے امتیاز و حقوق کسی کی ریاست کسی کا تقدس کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجلے گی یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ بکا ایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لئے سانپ، بچھو، اور درندے ہی درندے ہیں۔

توحید کی کشمکش | یہی صورت اس وقت پیش آتی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے

یہ آواز بند کی پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے اس لئے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا اسامہ کاروں کو اپنی سامراج کاری کا نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق

کا۔ قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا۔ اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا اس لئے الکفر ملۃ واحدة کے بمصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک لڑنے کے لئے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا جو تہذیب کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق راءن لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لئے تیار ہو جائیں ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لئے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور گٹھ جوڑ رہے تھے۔ کسی کا روزگار چھوٹا کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز و دوست آتشبار جھوٹ گئے، کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو پتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر ازار پھردوں اور گالیوں سے تو اضعی گئی۔ کسی کی آنکھ بھسوری گئی کسی کا سر میاڑ دیا گیا۔ کسی عورت، ال حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دیے کر خریدنے کی کوشش کی گئی یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا۔ ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ منظم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور
آزاد باش برائے تربیت کردار | ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی
 نہ سکتے تھے جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا۔ جس کی دراصل ضرورت تھی کوئی
 دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے
 سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھی میں سے گزر کر آئے۔

بھرجو لوگ اسے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے یا کسی خاندانی یا دوسری مقصد کے لئے
 مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا بلکہ صرف حق اور صداقت کے لئے، خدا اور اس کی رضا کے لئے
 اسی کے لئے وہ بپٹے، اسی کے لئے جھوٹے، اسی کے لئے دنیا بھر کی جنگااریوں
 کا تختہ مشق بنے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوئی جلی گئی
 جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص
 آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت کا، اس کیفیت اسلامی کا طاری ہونا
 ایک طبعی امر تھا جب کوئی شخص کسی مقصد کے لئے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کٹمنکشن،
 جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، ناز، جلا وطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے
 تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی
 ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے اس چیز کی تکمیل میں مدد
 دینے کے لئے نماز، ان پر فرس کی گئی تاکہ نظریہ پرانگی کی کامرماکان دور ہو جائے، اپنے
 نصب العین پران کی نگاہ جمی رہے جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار
 بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا
 میں کام کرنا ہے اس کا عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَةِ ہونا، اس کا مَالِکِ یَوْمِ الدِّینِ
 ہونا، اس کا قَاہِرُ کُلِّ عِبَادٍ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال
 میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال نہ کہ ان کے دلوں میں نہ آئے پائے
 ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور

ابلاء حق شناسی کا ذریعہ | دوسری طرف اسی کٹمنکشن کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل
 بھی رہی تھی جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان بٹھے جا رہے ہیں۔ قید کئے جا رہے ہیں۔ گھروں
 سے نکلے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر
 یہ سارا ہنگامہ کس لئے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، مرد، زمین کسی چیز
 کے لئے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لئے
 پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوتی ہے تو ان کے دلوں میں آپس سے

آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں۔ آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لئے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھتے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ ان کے دلوں پر قبضے پر پڑے ہوئے گھسے ہوئے چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیری طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہجران لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھینچنے چلے گئے کوئی جلدی کھینچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اس کی طرف کھینچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لئے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی روح بکلی نکلنے لگی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

قائد تحریک کا ایشیاء ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجازی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنالینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار بلوہت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار کہلاتا تھا اس کی ساری کے لئے ایک گدھا تک بیکار نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا کہہا کہ ہم آپ

کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، عرب کی حین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے، بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں، مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لئے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گایاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

مقصود مساوات فریش کے عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد اہم تمہارے پاس کیے اگر مجھیں اور تمہاری بائیں سنس جب کہ تمہاری مجلس میں ہر دفت خدام مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں، ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد پریش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں، مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

فلاح انسانیت کی پکار اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک اپنی قوم اپنے قبیلے، اپنے خاندان کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ فی الحقیقت انسان کی فلاح کے لئے آئے ہیں اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کبنا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لئے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں۔ تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لئے اٹھے تو حبش کے بلالؓ روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مسک دینتاری مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا، دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا

ہے لے کر چل دیتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کو مال بھی نہیں واپس پہنچانے کی کوشش کی اور اس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے یہ وہ اعلان تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ ڈنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد میدان بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑنے کوڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اس زہر شہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوئے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے بھیج رہے ہوں گے عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

اسلامی طرز حیات کا منظر | تیرہ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے کارکن فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی کام کرنے کا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی آئینہ یا لوحی کے ایک مجرد تجلّی ہے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کے انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے لئے اصول بنے ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا۔ اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کئے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیلے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ یوے

عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں ادھر اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے قاتل حمزہ وحشی قائل ہوئے۔ منہج جگرہ جو ایک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زبردہ نمایاں کر دیا **غیر فونی انقلاب** ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ پانچ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرہیں کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ انقلاب غیر فونی انقلاب کہلاتے جلنے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں نقطہ ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنی تبدیلیاں گئیں۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ زندگی کا طرز بدل گیا۔ اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے۔ بغرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ ہو کر رہ گئی۔

جوزانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے **نظریاتی انسان کی تشکیل** جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچکے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دسوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں جو ڈاکو اور لیٹھے تھے وہ اتنے مند بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو بایہ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کر دڑوں کی قیمت کا تاج شاہی

ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے بیویاں لگے ہوئے کھل بس لے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لئے پہنچاتا کہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ بوجھے اور اس کے خوس پر رہا کہ اس کا بس نہ آجائے وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرنے لے ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہونے نہ دیکھ سکتے تھے وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوائ تک نہ لگی تھی۔ ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیشمار تزار رنم اس غرض کے لئے پیش کی کہ وہ سرکاری معاملہ میں کچھ کمی کرے۔ مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بندناں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے بازاروں میں پیدل پھرتے تھے۔ دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا۔ ان سے انٹر دیو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاسمی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ ایچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ان ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہر کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برہمیل تنقید کی کہ اندر جانے کتنے ایرانی

سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہو گا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے ہیں کہ انہیں اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ ان کا اقبال خود آ کر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش نہ ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر حوالہ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا سپہ سالار کے سامنے لا کر رکھ دیتے تھے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعات و جمہیت کا اتنا زبردست تئیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح بدل ڈالا ہو؟

منظریاتی تبلیغی انقلاب درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں توکل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے۔ مگر بعد کے دس سال میں سارا ملک مسلمان ہو گیا اس معے کو لوگ حل نہیں کر سکتے، اس لئے عجیب عجیب توجہیں کرتے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ زوالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنا نا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی اسے محض خیالی آدمی۔ قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کرتا تھا اس وقت صرف غیر معمولی ذہانت اور سمجھ رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت میں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیان آ گئے، تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جس کو بنانے کے لئے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد خدا اور

ہٹ دھرمی کے لئے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی بنیادی پرور آنکھیں
تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لئے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا
غیر ممکن ہوگا۔

اسلامی نظام ایک طبعی واقعہ | ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ
جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے یہی اس کا راستہ
ہے۔ اسی دھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس
کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے اس میں
غلت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط نہیں نظر آتا ہے آج ہم اس دھنگ
پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لئے ایمان
شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں
کی سخت قربانی درکار ہے اس کے لئے جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق
پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جمادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ
نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ
نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی
امیدوں کا اور اپنے والدین کی متناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں
کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے
نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے رہنمائی۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے ہی اللہ
کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کھتے
سے ہو سکتا ہے۔

طریق تبلیغ | جہاں تک تبلیغ مسدک کا تعلق ہے عام طور پر مسلمانوں کی جماعتیں اس سے کام لیتی ہیں اور تمدنی جذبات اور مناظرانہ داؤ پیچ اور تیزی زبان کے مظاہر سے لوگوں کو اپنے اندر جذب کر دیتی ہیں۔ لیکن ہمارے مسدک کی تبلیغ کے لئے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے اس معاملہ میں بے حد صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے یہ تحریری اور تقریری مناظرے اور بحثیں جو عام طور پر مروج ہیں ان میں مبلغ غیر محسوس طور پر غلبہ النفس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور محسوس تک نہیں کر سکتا کہ میں خود اپنے محبوب نسب النین کی جڑوں پر کلہارا رکھ رہا ہوں۔ بخلاف اس کے ہمیں ایک ڈاکٹر کی طرح کام کرنا ہے جو آخر دم تک کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو تندرست ہو جائے اور اگر اسے کاٹ کر جسم سے الگ کرنا ہے تو اس وقت جب کہ وہ دوسری تمام تدابیر کو آزما چکے کے بعد اس کی علاج پذیری سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں حال ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سب سے پہلے بیمار عضو کو کاٹ پھینکنے پر تیار ہو جاتے ہیں یاد رکھنے کہ یہ عوام کا جوانوہ آپ کے گرد بھیلنا ہوا ہے ان میں سے جو لوگ کفر و شرک یا فسق کے مریض ہیں ان کا علاج غفۃ اور تلخی سے کرنے کے بجائے صبر اور تہجد سے کرنا ہے ان بیمار اعضاء کو معالجاٹ کر نہیں پھینک دینا ہے بلکہ ان پر تمام دوسری بہتر تدابیر کو آزمالینا ہے۔

عوام کی معذوری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان لوگوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد اور رسوم خود مذہبیت ہی کے مقدس دروازے سے داخل ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصلاح کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس مہم کو صبر و تحمل ہی سے سر کیا جاسکتا ہے، عرب میں بھی یہی حالات تھے اور وہاں بھی ٹھنڈے طریقوں سے تبلیغ

کا کام کیا گیا۔

ہماری تبلیغی پالیسی | سب سے پہلے تبلیغی پالیسی کے متعلق یہ سمجھ لیجئے کہ ہماری دعوت کا اصول الا قدم فالاقدم ہونا چاہیئے جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی تعرض کرنا چاہیئے اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اسی طرح جس چیز کی دینی اہمیت کم ہے اس پر بعد میں توجہ دی جانی چاہیئے اور اس کی قدر و قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جدا جدا زور دینے کے بجائے اس اصل الاصول کی فکر کرنی چاہیئے جس کی اصلاح سے فردوع کی اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے فرض کیجئے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل جل کر گر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روک دینے کے لئے الگ الگ تدابیر نہیں اختیار کی جائیں گی۔ بلکہ براہ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی فکر کی جائے گی یا مثلاً اگر کسی شخص کا خون خراب ہو اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو رہے ہوں تو ایک ایک پھوڑے پر بیشتر چلانے اور ایک ایک ناسور پر پھیالہ رکھنے کی جگہ اصلاح خون کی تدبیر کی جائے گی۔ اس اصول پر ہماری تبلیغین کو مقامی حالات پر غور کر کے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ لوگوں کی جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا؟ اور پھر ہر ضرب اسی اصل علت کو دور کرنے کے لئے لگائی جانی چاہیئے اس کام کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیئے اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیئے یہ جڑ اگر قائم ہوگئی تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے۔

جماعت کا پورا لٹریچر اسی اصول پر لکھا گیا ہے آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی اصول کے استحکام کے لئے پورا زور استدلال صرف کیا گیا ہے مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا

سے، شاخوں کی کٹائی چھٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قصر حیات کے ٹٹے ہوئے نقوش زینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں بلکہ اس کی بنیادوں کی تسکیر کریں۔ ورنہ دیواروں کی خوبصورتی تو ترقی کر جائے گی۔ مگر اس تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت کو کھنڈر بننا چاہیں گے۔

عماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھرجاتا ہے اور پھر ہر فنر اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلا یا جاتا ہے لیکن جزئیات پر حملہ کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی دیواروں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس طرز پر کام کرنے سے خواہ مخواہ جذبات مشغول ہو رہے ہیں۔ طرح طرح کے چھبے واسے انقلاب ختم ہو جاتی ہیں اور بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں۔ جنہی کہ سر پھول تک سے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریق تبلیغ کو دور لانے سے نکلنا اجتناب کیجئے۔

اگر آپ حضرات غور کریں تو معلوم ہو گا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے یا عقیدہ معاد کی نادانیت سے۔ علاوہ بریں کچھ خرابیاں ایسی ہیں جو اصول و فروع دین کی صحیح ترتیب کو الٹ دینے سے نمودار ہوتی ہیں۔ خود بگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں اور وہ ہے کتاب سنت سے بے تعلقی۔ یہ سب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ بکثرت علما تک کتاب و سنت سے براہ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے اب اگر ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہئے۔ جب تک بنیادی معتقدات کی اصلاح نہیں ہو جاتی، لوگوں کی فروعی گرامیوں کو صبر سے گولا کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فروعیات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ ہرگز زور دیا جائے۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو شرارت اور خبیثت کی بنا پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام عیسائی محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوئے ہیں

”ت ہلے دراز کی غلط تعلیم و تربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اتر گئی ہے کہ جن طور طریقوں کو وہ اختیار کئے ہوئے ہیں، انہی کا نام دین ہے۔ ان بیچاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صبر و تحمل سے تدریج توحید، نبوت اور معاد کے اسلامی تصورات کو ان کے دلوں میں راسخ کیا جائے۔ ان کے عقائد کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف ”دہائی و ہائی“ پکار کر بھیڑ جمع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلاب عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوے کی صداقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے رد گردانی کرنے والوں میں بالکل مختصر سا ذکر ایسا تھا جو ذاتی اغراض کی بنیاد پر مخالفت کر رہا تھا۔ باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے جب تک یہ پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آ گیا تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لئے انکار کے رستے مسدود ہو گئے، ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اغراض کی بنیاد پر لڑ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ میدان میں تمنا رہ گئے ہیں، اس لئے وہ مرجھکا دینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی دعوت حق کی کامیابی کا راستہ یہی ہے اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عریاں کر دیں تو ان میں سے نیک نیت فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے اپنے کبرا کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آئیں گے، پھر جو لوگ غرض کی بنیاد پر سدا رہ بنے ہوئے ہیں وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری جلتی ہوئی گاڑی ان کے رد کے نہ رک سکے گی۔

یہ پروگرام اگر اختیار کرنا ہو تو پھر آئین بالجہر اور بیخبر اور قل کے جھگڑے ختم کیجئے۔ غور تو کیجئے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصب العین بس اتنا ہی کچھ ہے؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ ان مہمات امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی جن کے لئے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مظالم

کا تختہ مشق بنے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھا دی گئی ہے انا مت دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ فکر تو اس کی کیجئے کہ لوگ خدا کے دین کو برصاوت و غبت تسلیم کریں اور سنت نبویہ کا اتباع کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ چیز پیدا ہو گئی تو پھر جس کو جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہوئی نظر آئے گی، وہ اسے اختیار کرے گا اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہ ملے گا۔ اسے ترک کر دے گا۔ زور تو اسی ایک بنیادی اصلاح پر دنیا چاہیے۔ اصول سے فروغ کی طرف چلنے کی جو تدریج اسوہ جوہی میں پائی جاتی ہے اگر اسے نظر انداز کر کے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کر دیا جائے تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہوگا۔ اسوہ نبوی کا اتباع نہ ہوگا۔

دور اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم فراموشیاں نہیں تھیں۔ جتنی آج ہمارے دور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت سب پرچوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا اصلاح کی وادی کو ایک ہی جست میں طے کر ڈالا گیا تھا نہیں بلکہ اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئیں پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی۔ پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو صفیہ کا سلسلہ بتدریج کٹی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرات بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نبی کے طریق کار کو خوب سمجھ لیجئے پھر آگے قدم بڑھائیے ایک اور چیز یہی ہے یہ محسوس کی ہے کہ ہمارے رفقاء میں کام کو مبالغہ سے پیش کرنے کا جذبہ بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جذبہ کو ختم کر دیا جائے۔ صرف یہ کہ اپنی کارگزاری بتانے میں مبالغہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ اپنی جگہ اپنے کام کو تسلی بخش بھی نہ سمجھا جائے۔ بہتر سے بہتر طریقہ پر کام کرنے کے بعد بھی مطمئن نہ ہو جائیے اور اس کے اچھے پہلوؤں پر قانع ہونے کے بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو دیکھ دیکھ کر بے چین رہیے۔ جو کام صحیح ہوا ہو اس پر خدا کا شکر بجالائیے اور جو کمی رہ گئی ہو اسے پورا کرنے کی توفیق بھی اس سے طلب کیجئے پھر مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ دوسری جماعتوں کے لوگوں میں کام کرتے وقت آپ پر مناظرہ کی روح چھا جاتی ہے اور مغافروہ و مکارات کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بہت اچھا ہے اور اگر درحقیقت یہ شبہ

صبح ہے تو ان بلاؤں سے نجات حاصل کیجئے۔
 اس سلسلہ میں اپنے طرز عمل اور اپنے اندازِ گفتار سے دوسری جماعتوں پر یہ واضح کر دیجئے
 کہ ہم کسی سے جماعتی کش مکش نہیں کرنا چاہتے، ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے
 اور ہمارا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے جو بھی حق سے منحرف ہے۔ ہم بس اس کی غلطی
 کو صاف بتا دیں گے اس کے بعد ہمارا خاص طہ پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہوگا بہر حال
 کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیئے کہ آپ
 اس کے حریف بن کر اٹھے ہیں ہمیں تو صرف نظامِ کفر و جاہلیت کا حریف بن کر رہنا ہے
 اسی سے مقابلہ کرنا ہے اور اس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہوگی۔ اسی تناسب
 سے ہماری اس کی دشمنی میں بھی شدت ہوگی۔

بعض اصحاب کی طرف سے پوچھا گیا ہے کہ آیا ہم ان جلسوں اور ان تقریبات میں
 شریک ہو کر تقریریں کر سکتے ہیں جو عام انجمنوں کی طرف سے منعقد ہوا کرتی ہیں؟ اس میں شک
 نہیں ہیں اس ذریعہ سے اپنے خیالات کو پھیلانے کے مواقع ملتے ہیں مگر میرا مشاہدہ ہے کہ
 یہ طریق کار مفید نہیں ہے ایک ایسٹج پر جب قسم قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور انہی کے
 دوران میں ہماری دعوت بھی پیش کی جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ان بولیوں میں
 سے ایک بولی ہے جو ہمیں خوش کرنے کے لئے سنائی جاتی ہیں یہ جلسہ ایک دماغی و ترغیبی
 ہے جس پر جہاں اور طرح طرح کے مربے اور اچار رکھے ہیں وہاں ایک نئی قسم
 کا یہ اچار بھی رکھ دیا گیا ہے انجمن بازی کے نقار خانہ میں اگر بالفرض آپ نے بوجہ آسن
 اپنا پیغام پیش بھی کر دیا تب بھی نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ لوگ داد دیتے ہوئے یہ کہہ
 دیں کہ فلاں صاحب خوب بولے ہماری قوم کا حال آج کل اس بگڑے ہوئے رئیس کا
 سا ہو گیا ہے جس کے گرد و پیش بہت سے خوشامدی مصاحب لگے ہوئے ہوں اور
 اسے خوش کرنے میں منہمک ہوں ان خوشامدیوں کے زمرے میں شامل ہو کر آپ
 حکمتِ دین اور حقائقِ زندگی کو خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کریں۔ بہر حال
 یہ رئیس المزاج قوم آپ کی باتیں انہی کانوں سے سنے گی جس سے وہ دوسرے

مصاحبوں کا باقی رہتا ہے۔ ان وجوہ سے میں جماعت کے مقررین کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے انفرادیت اور سرے لفظوں میں اپنی امتیازی حیثیت کو خوب محکم کر لیجئے اور بالکل جداگانہ طور پر اپنے نظریات پیش کرتے رہیں۔ البتہ اگر یہ ممکن ہو کہ مارکٹ میں جو خوش تقریریں پکار رہے ہیں ان کے اندر آپ اپنا اندر بھریں تو یہ صورت مفید ثابت ہوگی، مختلف اندازوں اور مقررین پر اپنا اثر اس حد تک پھیلا دیجئے کہ ان کی تقریریں میں خواہ مخواہ آپ ہی کے خیالات آنے لگیں جب وہ کچھ عرصہ تک محض تو لاہمارے نظریات کو بیان کرتے رہیں گے تو بعید نہیں کہ ایک روز ان میں اپنے ضمیر کی آواز اور رائے عام کے دباؤ سے اپنی عملی روش کو بھی بدلتا پڑے۔ بہرہ اسکیم اگر خوب وسعت کے ساتھ عمل میں لائی جاتے تو آخر کار اجرت پر تقریر کرنے والے مقررین جنہوں نے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رکھا ہے ایسی شے سے ہٹا دینے چاہئیں گے اور کام کے آدمیوں کو بیک خود سامنے لے آئے گی۔

ناقص علم و عمل کا فتنہ

بلغ دین کیلئے لازم ہے کہ مبلغ مرید کا نام لے بغیر اس کے مرض کے بڑے انجام کا متنبیل کے پیرائے میں ذکر کرے۔ قرآن میں ایسے شخص کی مثال بیش کی گئی ہے جو آیات الہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا، اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس رویے سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا، وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے، اسی عمل کے مطابق علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا، لیکن وہ دنیا کے فائدہ لائقوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشات نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے ان کے آگے سپر ڈال دی مالی امور کی طلب میں دنیا کی حرص و طمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص و طمع سے ایسا منسوب ہوا کہ اپنے سب اونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا، اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا۔ جس کی نگاہ دانست کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ شخص اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب ہی اس کی نگاہات میں لگا ہوا تھا اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر سے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف اسے لے جاتا رہا یہاں تک کہ ظالم نے اسے ان لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ ہوش گم کر چکے تھے۔

وانزل علیہم نارا الذی اقیمنہ ایتنا فانسلخ منها فاتبعہ الشیطن فکان من الغویین ولوشئنا لوفعنه بھاد فکنہ اخلد الی الارض واتبعہ ہومہ (الاعراف: ۱۴۵-۱۴۶)

ترجمہ: اے محمد ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا، مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا،

آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ جھگنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آدمیوں کے ذریعے باندھی عطار کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا۔ اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو کئے سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہر وقت لنگی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بچھنے والی آتش حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو دینا کا کتنا کہتے ہیں۔ کتے کی جبلت کیا ہے؟ حرص و آرزو، چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آجائے، اسے پھر ماریے تب بھی اس کی یہ توقع دور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز چھو پہنکی گئی ہے کوئی بڑی ہے یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو، پیٹ کا بندہ بس ایک دفعہ تو پک کر اس کو بھی دانوں سے پکڑ ہی لیتا ہے، اس سے بے انتفا کیے تب بھی لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لے، زبان ٹکائے اپنا کاپٹا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو بس وہ پیٹ کی نگاہ سے دیکھتا ہے، کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو، جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو بھی اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لئے مخصوص رکھنا چاہے گا۔ اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس نہ چھلکنے دے گا۔ اس شہرت شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ شہرت فرج ہے، اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے، اور اسی کو سونگھنے اور چاٹنے میں مشغول رہتا ہے، پس تشبیہ کا مدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ماتھے میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

فَبَشِّرْهُ بِمَثَلِ الْأَكْبَثِ إِنَّهُ يَخْجُلُ عَلَيْهِ يَوْمَئِذٍ وَتُزَكَّرُ لَهُ يَوْمَئِذٍ

ترجمہ: ”لہذا اس کی حالت کتنے کی سی ہوگی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان
لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔“
ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَانْقَضَىٰ الْقَصَصُ لَهُمْ
يَوْمَ تَكُونُ السُّورَةُ (القرآن)

ترجمہ: ”ایسی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تم
یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔“

برائی کا مقابلہ جیلائی سے

دعوت دین میں برائی کے مقابلے میں جھلائی سے جواب دینے کی ہدایت کی گئی
ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ النَّسِيئَةِ ۖ عَنْ أَصْلَافٍ مَّا يَلْمِزُونَ ۚ وَذُوقْ ذَوْبَ
أَعُوذِكَ ۚ مِنَ الْهَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ وَاعُوذْ بِكَ أَنْ يَخْفَضَ رُؤُوسَ (المقرآن)

ترجمہ: ”اے محمد برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو، جو کچھ
باتیں وہ تم پر نہاتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں، اور دعا کرو کہ ”پروردگار“
میں شیطان کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اے میرے رب
میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔“

بدکلامی کا مقابلہ خوش کلامی سے | سورہ انعام (۱۰۸) میں فرمایا گیا ہے
لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (المقرآن)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں
گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر
اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔“

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں کی گئی ہے کہ وہ تبلیغ کے جو شہر
میں اتنے بے تاب نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و منکر اسے معاملہ بڑھنے پڑے۔

غیر مسلموں کے غنائم پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے کیونکہ یہ چیز ان کو حق کے قریب لانے کی بجائے دور چھینک دے گی۔

اسی لئے سورہ آل عمران کی آیت ۹۷-۹۸ میں شیطان کی اکساہٹ سے اپنے رب کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ فریق مخالف کی بدکلامی اور درشتی سے کبھی ردِ عمل کے طور پر آدمی مشتعل ہو کر کالم گلوٹح پر بھی اتر آتا ہے اور نوبت اٹھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔

بدی کائنیک سے ازالہ

سورہ حم السجدة (آیت ۳۴) میں فرمایا گیا ہے
 وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْنُ عَنِ السَّيِّئَةِ حَتَّىٰ أَحْسَنُ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ بَيْنَا وَعَدَاؤُهُ كَأَنَّهَ ذِي حَسِيمٍ ۝ (حم السجدة) القرآن
 ترجمہ: ”اے نبی نیک اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے
 دفع کرو جو بہتر بن ہو، تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت
 پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔“

اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لئے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہئیں
 جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو یہ ہدایت
 دی گئی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ دعوت حق کا مقابلہ انتہائی بڑے دھرمی اور سخت
 جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا۔ جس میں اخلاق، السانیت اور شرافت کی ساری
 حدیں توڑ دی گئیں تھیں۔ ہر جھوٹے حضور اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا
 رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ کو بدنام کرنے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان
 کرنے کے لئے استعمال کئے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپ پر چسپاں کئے
 جا رہے تھے۔ اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپ کے خلاف
 دلوں میں دوسرے ڈالتی چھ رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں
 کو دی جا رہی تھیں۔ جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر

نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی، پھر آپ کی تبلیغ کو روک دینے کے لئے پروگرام یہ بنایا گیا تھا، کہ ہلڑ چانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ کی تاک میں لگا رہے اور جب آپ دعوت حق کے لئے زبان کھولیں تو انتہائی شور مچا کر دیا جائے کہ کوئی آپ کی بات نہ سن سکے، یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے، اس وقت مخالفین کو توڑنے کے لئے یہ نسخہ حضور کو بایا گیا۔

قرآن کی اس تفہیم پر پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ نیکی اور باری یکساں نہیں ہیں یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوش فہم طوفان اٹھالائے ہیں جس کے مقابلے ہی نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا جھوٹا بھٹا دیتی ہے، کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اس کی فطرت بدی سے نفرت کے بغیر نہیں رہ سکتی، بدی کے سامنے ہی نہیں، خود اس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لئے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں، یہ چیز دوسروں کے دلوں میں ان کا دُعا پر پیدا کرنا تو رکنا نہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور ان کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے۔ جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے، اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آکر رہتی ہے۔ کیونکہ اول تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہو اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروف پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں، بلکہ اس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بڑائی کرے اور تم اس

کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے، اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بڑا سلوک کرے تم کو منع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے، گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان نہ بند کر سکے گی۔ لیکن آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں۔ تو بڑے سے بڑا بے جفا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لئے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ ملے گا۔ نہ جانے دیتا ہو اور اس کی نیادیتیاں آپ برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے، اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو تو آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا۔ کیونکہ کوئی شرارت منسلک ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے، تاہم اس قاعدہ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے غیثِ النفس بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی برائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے شیشِ عقرب کا زہر بلا پن ذوقِ برابر بھی کم نہیں ہوتا، لیکن اس طرح کے شرِ مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسم انسان کیاب ہیں۔

تینلیخ اور صبر لازم وملزوم | مبلغ کے لئے بدی کے بدلے نیکی کرنے کے مقام کا حصول

ایک عظیم کام ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ هَبُوا جَهَنَّمَ (النسجہ)

ترجمہ: ”یہ صفت نصیب نہیں ہوتی، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔“

یعنی بدی کو نیکی سے دفع کرنے کا نسخہ ہے تو بڑا کارگر مگر اسے استعمال کرنا

لے تفہیم القرآن

نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپ کی تبلیغ کو روک دینے کے لئے پروگرام یہ بنایا گیا تھا، کہ بڑے چانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ کی تاک میں لگا رہے اور جب آپ دعوت حق کے لئے زبان کھولیں تو انتہائی شور مچا کر دیا جائے کہ کوئی آپ کی بات نہ سن سکے، یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے، اس وقت مخالفوں کو توڑنے کے لئے یہ نسخہ حضور کو بایا گیا۔

قرآن کی اس تفسیر پر پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ نیکی اور باریکدستی نہیں ہیں یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوب فتنہ طوفان اٹھالائے ہوں جس کے مقابلے ہی نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا جھڑ بٹھا دیتی ہے، کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اس کی فطرت بدی سے نفرت کئے بغیر نہیں رہ سکتی، بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لئے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں، یہ چیز دوسروں کے دلوں میں ان کا ذہن پیدا کرنا تو درکنار انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور ان کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے۔ جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے، اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آکر رہتی ہے۔ کیونکہ اول تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہو اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروف پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گردیدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ غصہ نیکی سے نہیں، بلکہ اس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بڑائی کرے اور تم اس

کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے، اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بڑا سلوک کرے تم کو منع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے، گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان نہ بند کر سکے گی۔ لیکن آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں۔ تو بڑے سے بڑا بے جفا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لئے کھل سکے گی۔ سوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا موقع مانتا ہے نہ جانے دیتا ہو اور اس کی زیادتیاں آپ برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے، اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو تو آپ اسے سچائیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا۔ کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے، تاہم اس قاعدہ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے غیث النفس بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی برائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عقرب کا زہر بلا پن ذوقِ برابر بھی کم نہیں ہوتا، لیکن اس طرح کے شرِ مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسم انسان کیاب ہیں۔

تنبیخ اور صبر لازم وملزوم | مبلغ کے لئے بدی کے بدلے نیکی کرنے کے مقام کا اصول

ایک عظیم کام ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ج (النسجہ)

ترجمہ: ”یہ صفت نصیب نہیں ہوتی، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔“

یعنی بدی کو نیکی سے دفع کرنے کا نسخہ ہے تو بڑا کارگر مگر اسے استعمال کرنا

لے تبہیم القرآن

کوئی سنسی کھیل نہیں ہے اس کے لئے بڑا دل گروہ چاہیے، اس کے لئے بڑا دل بڑا احساس، بڑی قوت برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے، وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک ان باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو چھانڈ جانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے لئے میں بھی بدست ہو رہے ہوں، وہ ان کی بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے، یہ کام وہی آدمی کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سر بلندی کے لئے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقام بلند سے نیچے اتارنے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ۔

وَمَا يَكْتُمُهَا إِلَّا ذُو خَيْطٍ عَظِيمٍ (۳۵) (السجده)

ترجمہ؟ اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔

یہ قانون فطرت ہے اور بڑے ہی بلند مرتبہ کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچے سے نہیں روک سکتی، یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ گھٹیا درجے کے مخالفین اپنی کمینی چالوں ذلیل مہکمٹوں اور دیگر حرکتوں سے اس کو شکست دے سکیں۔

فرمایا گیا - وَمَا يَكْتُمُهَا إِلَّا ذُو خَيْطٍ عَظِيمٍ
الشَّيْطَانُ نَزَّاعٌ نَّاسُتَعْذِبُ لَلّٰهِ (تفہیم القرآن)

نزعِ شیطان سے پناہ کا اہتمام

ترجمہ: اور اگر تم شیطان کی طرف سے اکساہٹ محسوس کرنا شروع کرو گے تو:

مانگ لو۔“

شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق دبا مل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لئے لڑنے والوں کو خصوصاً ان کے ذمہ دار لوگوں اور سب سے بڑھ کر ان کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کرا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جاسکے کہ دیکھئے صاحب برائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی بہت اور اپنے درجے کے انسان نہیں ہیں۔ فلاں گھٹیا حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے، عامۃ الناس میں یہ صلت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیاں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں، وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالف ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی اور راست بازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اس وقت وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے بے جا حرکت یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی کوئی ایک حرکت ہی سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب میں کیوں نہ ہو، تو ان کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے، اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو، وہ بڑا دروند و خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلانے لگا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیئے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیئے، اور اس حملے کے جواب میں تو اڑ جانا چاہیئے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو ضرور دار ہو جاؤ، کہ یہ شیطان کی اکساہٹ ہے، جو غصہ دلا کر تم سے غلطی کراتا چاہتا ہے اور ضرور دار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا

قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوت فیضانہ اور قوت ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمد نے اپنی سند میں حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بے ستا شاگایاں دینے لگا، حضرت ابوبکر خاموشی کے ساتھ اس کی گایاں سنتے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مسکراتے رہے، آخر کار جناب صدیق کھامیانہ میر لہریز ہو گیا، اور انہوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی، ان کی زبان سے وہ بات نکلتی ہی حضور پر نغید القیاض طاری ہوا جو چہرہ مبارک پر نمایاں ہونے لگا، اور آپ فوراً اٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی اٹھ کر آپ کے پیچھے ہوئے، اور راستے میں عرض کیا کہ کیا ماجرہ ہے۔ وہ مجھے گایاں دیتا رہا اور آپ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو گئے، فرمایا "جب تک تم خاموش تھے ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آگیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

عرض مخالفوں کے طوفان کے درمیان یہ بات ذہن میں راسخ رہے کہ اللہ

بے خبر نہیں۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (سجۃ ۳۶)

ترجمہ: "وہ سب کچھ جانتا ہے۔"

مخالفوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سکون اور اطمینان کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔

لے تفہیم القرآن

چونکہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے، ہمارے اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سن رہا ہے اور دونوں کا طرز عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے اسی اعتماد میں ایک بندہ مومن دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے خود پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

حکمتِ تبلیغ کے چار نکات

قرآن نے تبلیغ کی حکمت کے چار نکات بیان کئے ہیں۔ ۱۔ نرمی اور درگزر کا طریقہ ۲۔ نیکی کی تائید مسلسل ۳۔ جہاد کے ساتھ الجھنے پر سہیز ۴۔ اکساہٹ پر خدا کی پناہ طلب کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

نَحْذِرُ الْعَصَاةَ وَالْمُكَرَّهَاتِ الْعَرُوفَاتِ رَأَيْتُ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۱۶ وَإِنَّمَا يَنْبَغُ أَنْ
مِنَ الشَّيْطَانِ اسْتَعِذْ نَاسْتَعِذُ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَيُّدُ الْعَالَمِينَ

(آلۃ الاعراف ۱۶۴-۲۰۰) اے

پھر تبلیغ کے طرز عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔
إِنَّ الدِّينَ الْقَوَامُ إِذَا مَسَّيْهِمْ طَمَعٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّنبِهُونَ ۲۰
وَأَنصُوا لَنَفْسِكُمْ زَنَاحٌ فِي الْغَيْثِ
شَعْرًا لَّيْلٍ صُرُوتَ ۲۱

ترجمہ: حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریقہ کار کیا ہے، رہے شیطان کے بھائی بند تو وہ انہیں کچ روٹی میں کھینچے لئے جاتے ہیں اور انہیں جھٹکاتے ہیں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضور کو تعلیم دنیا نہیں ہے بلکہ حضور کے ذریعہ سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضور کے مشن کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اٹھیں، ان نکات کو اب سلسلہ وار دیکھتے یہ وہ صفات ہیں جو داعی میں ہونا نہایت ضروری ہیں

داعی حق کے لئے جو صفات سب سے زیادہ
تحمل، بردباری اور اعلیٰ ظرفی
 نرم خو، متحمل مزاج اور اعلیٰ ظرف ہونا چاہیئے، اس کو اپنے ساتھیوں کے لئے شفیق، عامۃ الناس کے لئے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لئے حلیم ہونا چاہیئے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیئے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی، اتنے شدیداً اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیئے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیئے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شہرہ برائہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیئے، سخت گیری درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقامہ اشتعال طبع اس کام کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے، اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رخصا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے ہیں اس سے جڑوں جو مجھ کو میرے حق سے مروم کرے میں اس کا حق دوں جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں" اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو کرتے تھے جنہیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے، کہ **بَشِّرُوا وَلَا تَعْنَبُوا وَلَا تَقْتَدُوا** یعنی جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لئے مشرودہ جائزہ ہو کہ باعث نفرت، اور لوگوں کے لئے تم سہوت کے موجب بنو، نہ کہ تنگی و ستمی کے، اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ: **بِمَا رَزَقْتُكُمْ تَعْبَتُمُ اللّٰهَ لَا تَعْبُدُوْهُ دَاوًا وَكَأَنْتُمْ نَفْسًا اَخْلَیْتَ الْقُلُوْبَ لَا اَنْتُمْ وَاَمِنْ كُذِّبَ**

ترجمہ :- "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم خو ہو، اگر تم وراثت خو ہوتے اور سنگدل تو ہر سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

فلسفہ طرازی کی بجائے راست گوئی

دعوت حق کی کامیابی کا گریہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ بینی کی بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف مہلاتیوں کی تلقین کرتے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان مہلا جانتے ہیں۔ یا جن کی مہلائی کو سمجھنے کے لئے وہ عقل عام (COMMON SENSE) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔

اس طرح داعی حق کا اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتا ہے، ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شرارتیں برپا کرتے ہیں، وہ خود اپنی ماکھی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں، کیونکہ عام انسان خواہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی مہلاتیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے بھرتے اور داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار میدان مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظام باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلید اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی، اور پھر آپ کے بعد تقوڑی مدت میں

اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں سو فیصد اور کہیں ۹۰ فیصد اور ۹۰ فیصد باشندے مسلمان ہو گئے۔

جاہلوں سے اجتناب | اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبین خیر کو معروف کی تلقین کی جائے، وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے زائجا جائے، خواہ وہ الجھنے اور الجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں، داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو عقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لئے تیار ہوں اور جب کوئی شخص جہالت پر اتر آئے اور حجت بازی، جھگڑا پون اور طعن و تشنیع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے، اس لئے کہ اس جھگڑے میں الجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت و دعوت اور اصلاح نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

اشتعال میں صبر کا اہتمام | مخالفین کی شدت اور شرارتوں پر اگر اشتعال پیدا ہو تو اسے شیطانی وسوسہ سمجھیں، چنانچہ جب کبھی داعی حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نیرخ شیطانی (یعنی شیطان کی اکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں نہ پھنسنے دے، بجائے اور ایسا بے قابو ہونے دے کہ اس سے دعوت حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے، دعوت حق کا کام ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور دی دم صبح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب صبح سمجھ کر اٹھایا جائے، لیکن شیطان جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہمیشہ اس کو شش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعی حق پر طرح طرح کے حملے کر لے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے، یہ اپیل جو شیطان داعی

کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُر فریب نامویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں پیٹیا ہوا ہوتا ہے، لیکن اس کی تہہ میں بھر نفاذیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی، اسی لئے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی اخلاقیات اور بدی سے بچنے کے خواہشمند ہیں، وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بڑے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوت دین کا مفاد کس طرز عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے، رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفاذیت کی لاگ لگی ہوتی ہے اور اس سے جن کا شیا طین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہوتا ہے یا تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے، اور ان سے مغلوب ہو کر غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں اور پھر جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انہیں لئے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رکتے، مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

واعلیٰ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ وقتی تقاضوں کے پیچھے لگ کر دعوت حق کو کسی حال میں ترک نہ کرے

دعوت میں استقامت

ارشاد ہوا ہے۔

وَإِذْ لَوْ أَنَّا أَلَيْنَا بِالْأُولَىٰ الْأَجْبِيَّتَاطَ لَآلِ إِنَّمَا اتَّبَعْنَا مَا يَدْعِي إِلَىٰ
مِنْ رَبِّي جَ هَذَا بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَلَهُ يَوْمَ حَسْبٌ لِّمَن رَّبُّهُ مُنَوِّنٌ
ترجمہ: ”اے نبی جب تم ان لوگوں کے ساتھ نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں
کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کیوں نہ کوئی نشانی انتخاب کر لی؟“
ان سے کہو ”میں تو صرف اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری
طرف بھیجی ہے، یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت
اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔“

آیت کے ابتدائی حصہ میں کفار کے جس سوال کا ذکر ہے اس میں صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لئے بنا لائے ہوتے، اس کے جواب میں آپ کا جواب کس نشان کا ہے۔ کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس چیز کی میں خود ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کروں، میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں، معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے، اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الہی کے آثار صاف ہویدار ہونے لگتے ہیں۔

وَإِذَا تَوَلَّى الْقَوْمَ نَسِيتُمْ مَوَالِدَهُ دَانِيَتْكُمْ
شُرَكَائِكُمْ ۝ الْأَعْرَافُ ۲۰۴

حکمتِ تبلیغ اور حسنِ خلق

ترجمہ :- جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔

یعنی یہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور و غل برپا کرتے ہو نہ کہ نہ خود سنو اور نہ کوئی دوسرا سن سکے، اس روش کو چھوڑ دو اور غور سے سنو، تو سہی کہ اس میں تعلیم کیا دی گئی ہے کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اسی رحمت کے حصہ دار بن جاؤ، جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے، مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف و شیریں اور سیاہ دلوں کو مسخر کرنے والا انداز تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی قمتل نہیں ہو سکتی جو شخص حکمتِ تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں برائے سبق پا سکتا ہے۔

ذکر خدا کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ۔
 رَاَوْكُمْ رَبَّكَ فِيْ لَفِيْظٍ لَّفِيْظٌ عَادٍ نِّفِيْظٌ دَوْنِ الْجَهْرِ
 مِنْ الْقَوْلِ بِالْعَدُوِّ وَالْاِلَٰهِ اِلَٰهٍ دَلَّ اَنَّكَ مِنَ الْعَاذِيْنَ

ترجمہ :- اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو، دل ہی دل میں ناری
 اور خوف کے ساتھ، اور زبان سے بھی آواز کے ساتھ، تم ان لوگوں میں سے
 نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ۔

یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی، خواہ وہ زبان سے
 ہو یا خیال سے، صبح و شام سے مراد یہی دو وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ
 کی یاد سے مقصود نماز ہے، اور صبح و شام کا لفظ دایم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا
 ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد، مشغول رہنا ہے، یہ آخری نصیحت ہے جو قطب
 کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارا
 حال کہیں غافلوں کا سانہ ہو جائے، دینا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و
 اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو مبھوں
 جانتے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اس کو آزمائش
 کے لئے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہو
 گا، پس جو شخص راہ راست پر چلنا اور دنیا کو اس پر چلنا چاہتا ہو اس کو سنت
 اہتمام کرنا چاہیے، کہ یہ مبھوں کہیں خود اس کو لاحق نہ ہو جائے، اسی لئے نماز اور ذکر الہی
 اور دائمی تعلق الی اللہ کی بار بار تائید کی گئی ہے۔

حکمت اور عمدہ نصیحت

اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے ۔

اَوْءَا اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ دَالِمًا مَّا عَظُمَ
 الْحُسْنَةُ وَجَبَلُوْهُمْ بِاللَّيْنِ فَاِذَا اَخْسَرُوْا

ترجمہ :- اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرٹ دعوت و حکمت اور عمدہ

اسے تفہیم القرآن اور حرف آیت ۲۰۵ - ۲۱۱ تفہیم القرآن ائل ۱۲۵

نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہتر رہے ہو۔

دعوت دین میں در چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں، ایک حکمت دوسرے عمدہ نصیحت (۱) حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر مایہ ناز موقع و مل کو دیکھ کر بات کی جائے، ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ لٹکا جائے، جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

۲۔ عمدہ نصیحت :- کے در مطلب ہیں ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گناہوں کا محض عقلی حیثیت سے ہی ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں برائی سے جو پیدا کشتی نفرت پائی باقی ہے اسے بھی ابھارا جائے، اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقائد ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے کی جائے جس سے دل سوزی اور غیر خواہی شکستی ہو، مخاطب یہ نہ سمجھ کہ ناسخ اسے حقیر سمجھ رہا ہے، اور اپنی بندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے بلکہ اسے غمگین ہو کر ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لئے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

طریق بحث کی عمدگی اور خوبی | دین کی دعوت دیتے ہوئے داعی کی گفتگو کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشمشی

اور ذہنی جنگل کی نہ ہو اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوڑیاں اور پھبتیاں ہی نہ ہوں، اس کا مقصد و حریف مقابل کو چپ کر دینا اور زبان آدمی کے دھوکے سے بھا دینا نہ ہو، بلکہ اس میں شیریں کھادی ہو، اعلیٰ درجہ کا شربنا، اخلاق ہو، معقول اور

دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر خفا اور بات کی پہچان اور بٹ دھری نہ پیدا ہونے دی
جلتے۔ سب سے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ
وہ کچھ بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ گمراہی میں اور
زیادہ دور نہ نکل جائے۔

بحث مباحثہ میں جذباتیت سے پرہیز
اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَلِلْعِبَادِ يُقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا الْحَسَنُ

ترجمہ: اور اے محمد! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات
نکالا کرو جس پر بہتر میں ہو۔

یعنی کفار و مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثہ میں تیز کشی
اور مبالغہ اور غناوت سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں، مسلمانوں کو
نہ تو کوئی بات خلاف حق زبان سے نکالنی چاہیے، اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر
بے ہودگی کا جواب بے ہودگی سے دینا چاہیے، انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی
چاہیے، جو سچی بتلی ہو، برحق ہو اور ان کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

غصہ اور شیطان کی اکساہٹ سے اجتناب
یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بحث میں اگر
غصہ آجائے تو اسے شیطان کی اکساہٹ

سمجھا جائے۔ فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْتِي بَيْنَهُمْ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝۵۳

یعنی دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈولانے کی کوشش
کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اس لئے جب ہمیں مخالفین
کی بات کا جواب دیتے وقت غصے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو، اور طبیعت بے اختیار
جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اکسا رہا ہے تاکہ دعوت

اسے تنہم القرآن - بنی اسرائیل ۵۳

دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوع النسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

عَلَيْكُمْ زِيَارَةُ سَعَةِ حَقِيقَاتِ | وَاللَّهُ يَوْمَئِذٍ عَلِيمٌ
وَلَا تَبْذُرُوا آيَاتِ اللَّهِ مَذْمُومًا مِثْلَ بَذْرِ الَّذِينَ يَنفَعُونَ سَعَةً

ترجمہ :- اور اے ایمان لانے والو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر وہ اللہ کو گالیاں نہ دینے لگیں۔
یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں کو کہی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔

مخالفت پر فتویٰ بازی سے پرہیز | وَاللَّهُ يَوْمَئِذٍ عَلِيمٌ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذِهِ السُّبُلَ الَّتِي يَتَّبِعُونَ فَتَكُونُوا مِنَ الْخَالِفِينَ

ترجمہ :- تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے۔ اے
یعنی اہل ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے نہ آنے چاہئیں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے، اس چیز کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے، وہی سب انسانوں کے ظاہر و باطن اور ان کے حال و مستقبل سے واقف ہے، اس کو یہ فیصلہ
۱۔ تفہیم القرآن - بنی اسرائیل

کرنا ہے کہ کس پر رحمت فرمائے اور کسے عذاب دے، انسان اصولی حیثیت سے تو یہ کہنے کا ضرور مجاز ہے کہ کتاب اللہ کی روستے کس قسم کے انسان رحمت کے مستحق ہیں اور کس قسم کے انسان عذاب کے مستحق ہیں مگر کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں شخص کو عذاب دیا جائے گا اور فلاں شخص بخشا جائے گا۔

غالباً یہ نصیحت اس بنا پر فرمائی گئی ہے کہ کبھی کبھی کفار کی فریادیتوں سے تنگ ہو کر مسلمانوں کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے ہوں گے کہ تم لوگ دوزخ میں جاؤ گے یا تم کو خدا عذاب دے گا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحِيمًا ۝۵۴ - بنی اسرائیل

ترجمہ: ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

یعنی بنی کا کام دعوت دینا ہے۔ لوگ کی قسمیں اس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئیں ہیں کہ وہ کس کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ کرنا پھرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی بنا پر اللہ آپ کو تنبیہ فرماتا ہے بلکہ دراصل اس سے مسلمانوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے ان کو بتاتا جا رہا ہے کہ جب بنی تک کا یہ مضرب نہیں ہے تو تم جنت اور دوزخ کے ٹھیکیدار کہاں بنے جا رہے ہو۔

تضہیک پر علیحدگی کا رویہ | جب کفار اور مخالفین کی طرف سے

غیض و غضب کے وقت دعا کرتے ہوئے الگ ہو جانا چاہیے، فرمایا گیا ہے۔

نَاصِحَ عَنْهُمْ وَلَوْلَا آلُكُمْ مَا فَسَدَتِ يَهُودُ أَسْرَفَ

ترجمہ: اچھا۔ اے بنی۔ ان سے درگزر کریں اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں

عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

یعنی ان کی سمت باتوں اور تضہیک و استہزا پر نہ ان کے لئے بد دعا کرنے والا

ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہو، بس سلام کر کے ان سے الگ ہو جاؤ اور نہ الگ ہونے میں اپنی ہار سمجھو، کہ لوگ کہیں گے کہ دیکھئے، مقابلہ نہیں کر سکے اور میدان چھوڑ دیا۔

اسی طرح سورہ الباقیہ آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے: **كُلُّ لَئِذٍ اٰمَنُوْا يَغُوْدُوْا لِّلْاٰثِمِيْنَ اِيْثَامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قُلُوْبًا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ** ترجمہ: ”اے نبی، ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بڑے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے، ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔“

اس آیت کے دو مطلب بیان کئے جاتے ہیں، اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے، ایک یہ کہ اہل ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں، تاکہ اللہ ان کو اپنی طرف سے ان کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہ خدا میں جو اذیتیں انہوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اسے دے۔

اس آیت میں عضو اور درگزر کا حکم ان عام حالات کے لئے ہے جن میں اہل ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سابقہ پیش آئے اور وہ انہیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں، اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے الجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بے ہودگی کا جواب دینے پر نہ اتر آئیں، جب تک شرافت اور معصومیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مداخلت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات ان حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چپ سا رہنی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے، مسلمان ان سے خود الجھیں

کے توالد ان سے منٹے کے لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا، درگزر سے کام لیں گے
تو خود ظالموں سے منٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

یہاں قرآن ایک حکمت کی بات کا نمونہ پیش کرتا
حکمت کی بات عمدہ مثال ہے، قرآن میں اس مقام پر سورہ سجادہ آیت ۴۲

میں پہلے سوال و جواب سے مخاطبین کو ایک ایسے منطقی نتیجہ پر پہنچا دیا گیا ہے کہ جو
اللہ ہی کی بندگی و پرستش کرتا ہے وہ ہدایت پر ہے اور جو اس کے سوا دوسروں کی
بندگی بجا لاتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہے، اس بنا پر نظام ہر تو اس کے بعد کہنا ہی چاہیے
تھا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہ ہو، لیکن اس طرح دو ٹوک بات کہہ دینا حق گوئی کے
اعتبار سے خواہ کتنا ہی درست ہو تا حکمت تبلیغ کے لحاظ سے درست نہ ہوتا، کیونکہ جب کسی
شخص کو مخاطب کر کے آپ صاف گمراہ کہہ دیں اور خود اپنے برسر ہدایت ہونے کا دعویٰ کریں
تو وہ ضد میں مبتلا ہو جائے گا اور سچائی کے لئے اس کے دل کے دروازے بند ہو جائیں
گے، اللہ کے رسول چونکہ مجرد حق گوئی کے لئے نہیں بھیجے جاتے، بلکہ ان کے سپرد یہ کام بھی
ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ حکیمانہ طریقے سے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کریں، اس لئے
اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نبی، اس سوال کے جواب کے بعد اب تم ان لوگوں سے
صاف کہہ دو کہ تم سب گمراہ ہو اور ہدایت پر صرف ہم ہیں، اس کے بجائے تلقین یہ فرمائی
گئی کہ انہیں اب یوں سمجھاؤ اور ان سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ فرق تو کھل گیا
کہ ہم اسی کو معبود مانتے ہیں جو رزق دینے والا ہے، اور تم ان کو معبود بنا رہے ہو جو
رزق دینے والے نہیں ہیں، اب یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور تم دونوں بیک وقت
راہ راست پر ہوں، اس صریح فرق کے ساتھ تو ہم میں سے ایک ہی راہ راست پر ہو
سکتا ہے، اور دوسرا لامحالہ گمراہ ٹھہرتا ہے اس کے بعد یہ سوچنا تمہارا اپنا کام ہے
کہ دلیل کس کے برسر ہدایت ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے اور کون اس کی رُو سے گمراہ ہے
وَاِنَّا اَوْثَقْنَاكَ لِلْعَلٰی حُدُودِ اَرْضِ الْمَدٰیْنِ مَبْنٰی

اب لامحالہ ہم ہیں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں

پڑا ہوا ہے۔ یہاں یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ اس بات پر سوچنا کہ راہ ہدایت کیا ہے یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے کہ اس پر غور کریں۔ فرمایا گیا ہے۔

قُلْ لَا أَتَّبِعُكُمْ نَتَّبِعْ مَا تَنذَرُ ۚ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْلِمُونَ

ترجمہ: ”ان سے کہہ دو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کئی باز پرس تم سے نہ ہوگی، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی سے ہمیں کی جائے گی۔“
 اوپر کی بات سامعین کو پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر چکی تھی، اس پر مزید ایک فقرہ فرمایا گیا: تاکہ وہ اور زیادہ تفکر سے کام لیں، اس سے ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ہدایت اور گمراہی کے اس معاملے میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا ہم میں سے ہر ایک کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے، فرض کر دو کہ ہم گمراہ ہیں تو اس گمراہی کا فیازہ خود ہی بھگتیں گے، تم پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لئے یہ ہمارے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں جا رہے ہیں، اسی طرح تم کو بھی ہماری کسی غرض کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی ہی خیر خواہی کی خاطر ایک عقیدے پر چھٹنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ کہیں تم باطل نظریے پر تو اپنی زندگی کی ساری پونجی نہیں لگا رہے ہو، اس معاملے میں اگر تم نے تھوکر کھائی تو تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا، ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔

حکمت تبلیغ کا ایک اعلیٰ نمونہ | قرآن پاک میں سورہ یسین - آیت ۲۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدَ الَّذِي فَطَرَنِي وَالَّذِي بِهِ حَبَّرَتْ ۝ ۱۲۵

ترجمہ: ”آخر کیوں نہ میں اس مہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے؟“

یہ دو جملے ایک صاحب ایمان کے ہیں جو تم کو دعوت دین دیتا ہے، اس میں پہلا فقرہ استدلال کا شاہکار ہے۔ اور دوسرے فقرے میں حکمت تبلیغ کا کمال دکھایا گیا

ہے۔ پہلے فقرے میں وہ کہتا ہے کہ خالق کی بندگی کرنا تو سر اسر غفل و غفلت کا تقاضا ہے، نامعقول اگر بات کوئی ہے تو وہ یہ کہ آدمی ان کی بندگی کرے جبکہ انہوں نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے، جس نے اسے پیدا کیا ہے، دوسرے فقرے میں وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ مرنے کا آخر تم کو بھی ہے اور اسی خدا کی طرف جانا ہے جس کی بندگی اختیار کرنے پر تمہیں اعتراض ہے، اب تم خود مسیح کو کہ اس سے منہ موڑ کر تم کس بھلائی کی توقع کر سکتے ہو۔

دیکھئے اس بندہ خدا کی دعوت کے ان گفتگو میں ہمدردی کا اہتمام

اور پھر حضرت موسیٰ سے فرمایا گیا ہے۔
 اذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰ ۚ نَقَلْ هَلْ لَّكَ اِلٰی اَنْ تَذَكَّرَ ۚ اِنَّ دَاوُدَ يَكُنْ
 اِلٰی رَبِّكَ نَجْتٰی

ترجمہ: ”فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ دیا تو اس کے لئے تیار رہے کہ پاکیزگی اختیار کرے، اور میں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تاکہ (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو،“
 حضرت موسیٰ کو مزید ہدایت فرمائی گئی کہ۔

فَقُولْ لَّہٗ قَوْلًا لَّیْسَ لَہٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۚ
 ترجمہ: ”تم اور ہارون دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے“ (طہ، آیت ۴۴)
 اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو ان آیات میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لئے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیئے، دوسرا نمونہ سورہ طہ آیت ۹۴ تا ۵۲، موسیٰ اور فرعون کے مکالمہ میں ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَجَعُكُمَا إِلَىٰ ۝ ۴۹ - فرعون نے کہا " اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے موسیٰ؟ "

دونوں بھائیوں میں اصل صاحب دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے اس لئے فرعون نے انہی کو مخاطب کیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ خطاب کا رخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارون کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہوا اور خطابت کے پہلو میں وہ حضرت موسیٰ کے صنف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو، جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہل مصر کا رب تو میں ہوں، سورہ نازعات میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ -

أَنَّا رَبُّكَ الْأَعْلَىٰ لَمَّا أَهْلَ مِصْرَ - تمہارا رب اعلیٰ میں ہوں؛ سورہ زخرف میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ لَيَقُولُ الْكَافِرُ الَّذِي يَرَىٰ ظُهُورَ الَّذِينَ هُمُ الْمُحْسِنُونَ تَجَرُّنَا مِنَ الْحَدِيدِ " اے قوم کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں؟ اور یہ نہیں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ (رکوع ۵) سورہ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں ہنکا کرتا ہے - يَا أَيُّهَا الْمَلَأَ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ غِيْرٌ فَاذْكُرُوا يَوْمَ إِدْعَاكُمْ عَلَىٰ الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّي صَوْرًا نَعْلَىٰ أَطْلَعُ إِلَى اللَّهِ مُوسَىٰ " اے سرداران قوم " میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور بھی الہ ہے۔ اے ہامان ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لئے تیار کرنا کہ میں ذرا اوپر چڑھ کر یہ دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کے الہ بنا رہا ہے " (رکوع ۴) سورہ شعراء میں وہ حضرت موسیٰ کو ڈانٹ کر کہتا ہے - لَئِنْ أَتَاكَ الْهَٰغِيْرُ لَا يَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمُسْجُوْدِيْنَ ، اگر تو نے میرے سوا کسی کو الہ بنا یا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا " (رکوع ۲)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا اور وہاں اور کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی، یہ بات ثابت ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رع یا راع) کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استعاق جانتا تھا، اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ

سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لئے فرعون کا دعویٰ "واحد مرکز پرستش ہونے کا نہ تھا" بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے واصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ربوبیت کا مدعی تھا اور یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرمانروا ہو جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔ اس کے اس سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے فرمایا جسے قرآن نے اس طرح نقل کیا ہے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ أَشْتَهَىٰ ۝۵
یعنی "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا"

ہمارا رب وہ ہے سے مراد یہ ہے کہ ہم ہر معنی میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار۔ آقا۔ مالک۔ حاکم سب کچھ ہمارے نزدیک وہی ہے کسی معنی میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔
"جس نے ہر شے کو اس کی ساخت بخشی"

یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اس کے بنانے سے بنی ہے، ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل، صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اس کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے، ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لئے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی اور پاؤں کو مناسب تریں ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا پانی غرض ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورت خاص عطا کر کے جو اسے کائنات میں اپنے حصے کا کام چھیک چھیک انجام دینے کے لئے مطلوب ہے۔

پھر اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کو رہنمائی بھی کرتا ہے، دنیا کی کوئی

چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینا اور دینے والے بقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہے، کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اسی نے سکھایا ہے، پھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے، درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے، غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں۔ ہادی اور معلم بھی ہے۔

اس بے نظیر جامع و مختصر مجلے میں حضرت موسیٰؑ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لئے اس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جاسکتا، دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی جھوٹے سے فقرے میں آگئی ہے، ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجود خاص کے لئے اللہ کا ممنون احسان ہے اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتا، جب تک اس کا دل اور پیٹھ پڑے اور اس کا معدہ و جگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کئے جائیں تو فساد و خون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں اسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی، جس کے ماننے سے فرعون کو انکسار تھا، ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے اور جو ہر چیز کو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالمگیر منصب ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لئے بھی رہنمائی کا انتظام کرے اور انسان کی شعوری زندگی کے لئے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہو سکتی جو پھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لئے موزوں ہے، اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوا اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتائے۔

حضرت موسیٰ کے اس مدلل جواب پر فرعون نے پھر دوسرا سوال کیا، کہنے لگے
 قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ (۵۱) اے ”اور پہلے جو نسلیں گزر چکی
 ہیں، ان کی پھر کیا حالت تھی۔“

یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشتی اور زندگی میں کام
 کرنے کا راستہ بتایا اس کے سوا اور کوئی دوسرا رب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ
 واداجو صدائیل سے نسل در نسل دوسرے ادبائے بندگی کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کی
 تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ عذاب کے مستحق تھے؟
 کیا ان سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟۔ یہ تھا فرعون کے پاس موسیٰ کی اس دلیل کا
 جواب، ہو سکتا ہے کہ یہ جواب اس نے برنائے جہالت دیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ برنائے
 شرارت، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی وہ خود اس
 بات پر جھٹلا گیا ہو کہ اس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے اور
 ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہل دربار اور عام اہل مصر کے دلوں میں
 حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے، اہل حق کی تبلیغ کے خلاف
 یہ ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لئے بڑا مؤثر
 ثابت ہوا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوتی ہیں، مکہ میں
 بنی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچا دکھانے کے لئے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے
 کام لیا جاتا رہا۔ تھا، اس لئے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی اس حکمرانی کا ذکر
 یہاں بر عمل تھا۔ حضرت موسیٰ نے کمال تدبیر سے اس کے شرارت آمیز سوال کا جواب دیا۔
 قَالَ عَلِمْتَ مَا فِي كِتَابِ لَا يُفْضِلُ رَبِّي وَلَا يَنْسِي (۵۲) اے
 ”ترجمہ:-“ اس کا علم تو میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے، میرا
 رب نہ چھوٹتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔“

قرآن نے یہ حکیمانہ جواب حضرت موسیٰ کی طرف سے پیش فرمایا ہے، ہمیں حضرت

موسیٰؑ کے جواب سے حکمت تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے، فرعون کا مقصد نظام سامعین سے اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا اگر اس آیت میں حضرت موسیٰؑ یہ کہتے کہ میں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنم کا اندھن نہیں گئے تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰؑ کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا، اس لئے آنجناب نے کمال و انانیت کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیئے، آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں، میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی بیعتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں، ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے، ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے حرکات کو خدا جانتا ہے، خدا کی نگاہ سے بچی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظہ سے کوئی شے محو ہوئی ہے، ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا نے کرنا ہے اس کو وہی جانتا ہے، مجھے اور تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا موقف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا، ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے اس جواب میں ضدی مخاطب کی ہٹ دھرمی کو توڑنے کا ایک حکیمانہ طریقہ موجود ہے۔ جب مخاطب خدا اور ہٹ دھرمی پر اتر آتے تو اس کا حق کو قبول کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے، اس وقت داعی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں ایسا رنگ اختیار کرے کہ مخاطب کے سامنے یہ بات نہ رہے کہ متکلم کی بات کو مجھے ماننا ہے یا اسے رد کرنا ہے بلکہ اسے ایسے میلے پرے آئے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ میرا مفاد کس میں ہے اس کو قبول کرنے میں یا اسے رد کرنے میں۔

سورہ الفرقان آیت ۱۶ میں اسی حکیمانہ طرز عمل کا ایک بہترین رنگ پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۴ تا ۱۰ میں کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے ان صوبے جا الزامات کا ذکر فرمایا ہے، جو ایک ضدی انسان بغیر سوچے سمجھے لگایا کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ محمدؐ کیسے نبی ہیں، وہ کھانا کھاتے ہیں، بازاروں میں ان خود سودا سلف خریدنے کے لئے جاتے ہیں۔ اگر کسی انسان کو نبی بنانا ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ لگا دیتا جو ہر وقت کوڑا ماتھے میں لئے لوگوں کو دھمکاتا پھرتا اور کہتا کہ مانو اس رسول کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب پر سادیتا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت میں حکمت تبلیغ کا ایک اور بے مثل نمونہ قابل ملاحظہ ہے سورہ الشعراء آیت ۲۳ تا ۲۸ میں جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ -

فَوَهَّابِ رَبِّي رَبِّي حَكَمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا ہے اور مجھے رسولوں میں شامل کر دیا ہے۔

اس پر فرعون نے کہا - وَمَا رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا

قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنَّ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ۝

ترجمہ:- کہ آسمانوں اور زمین کا رب، اور ان سب چیزوں کا رب جو

آسمان اور زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لائے والے ہو۔

گویا حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ میں زمین پر بسنے والی کسی مخلوق اور فانی مدعی ملکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے، اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک فرمانروا ہے۔ تو تمہیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہونی چاہیئے کہ سارے جہان کا رب کون ہے۔

اس پر فرعون کہنے لگا قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَكَا تَسْتَعْجِلُونَ (۲۵) فرعون نے اپنے

گرد و پیش کے لوگوں سے کہا ”سنئے ہو؟“۔

گویا وہ انہیں حضرت موسیٰؑ کے ان باغیانہ کلمات کی متوجہ کر رہا تھا، حضرت

موسیٰ نے جواب دیا۔

قَالَ رَبُّكُمْ ذَرَبْ اَبْنَاءَكُمْ اَلَا ذَلِكُنَا (۲۳) موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔"

گویا حضرت موسیٰ نے اسے یہ اطلاع دی کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے اور کل نئے مگر آج نہیں ہیں، تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں، میں صرف اس رب کی حاکمیت و فرمان روائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں ان سب کا بھی رب تھا۔"

حضرت موسیٰ کے اس سوال و جواب پر فرعون نے لاچار ہو کر کہا

قَالَ اِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ه (۲۴) فرعون نے (حاضرین سے کہا) "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، پاگل معلوم ہوتے ہیں۔" اس پر حضرت موسیٰ نے سابقہ دلیل کی تکمیل کی اور اضافہ کرتے ہوئے فرمایا۔
قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (۲۵) موسیٰ نے کہا۔ "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔"

گویا مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچئے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارہ فرعون ہے جو زمین کے ذرا سے رتبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مہرسمیت ہر چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے، میں تو فرمان روائی اس کی مانتا ہوں اور اس کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

دلیل کے میدان میں لاچار ہو کر فرعون کے لئے تسلیم و رضا کا مسک بھی ہو سکتا تھا لیکن تکبر و غرور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لئے پھر اس نے سینہ زوری

کا راستہ اختیار کیا اور کہنے لگا۔

قَالَ لَيْسَ اَتَّخَذْتُ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَا جُعَلْنٰكَ مِنَ الْمُسْجُوْنَۙ (۲۹)

ترجمہ :- اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل

کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے مڑ رہے ہیں۔

اس گفتگو کو سمجھنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی ”معبود“ کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا یعنی یہ کہ بس اسے پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس کے استمداد و انتفاعات کے لئے دعائیں مانگیں لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق نہ بنتا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کو قانون برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمان رواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں، وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم متاثر مطلق ہیں کسی معبود کو ہماری سیاست، ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ حکومتوں اور بادشاہوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے، انہوں نے ان سے خداوند عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں، بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھہرایا ہے جو اس کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے، اس تشریح سے فرقوں کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے، اگر مبالغہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک

موسیٰ نے جواب دیا۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (۲۷) موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی

اور تمہارے آباء اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔"

گویا حضرت موسیٰ نے اسے یہ اطلاع دی کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں، تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں، میں صرف اس رب کی حاکمیت و فرمان روائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں ان سب کا بھی رب تھا۔

حضرت موسیٰ کے اس سوال و جواب پر فرعون نے لاچار ہو کر کہا

قَالَ إِنِّي رَسُولُكُمْ إِلَهِ الَّذِي أُرْسِلُ إِلَيْكُمْ لَتَجْعَلُنَّ ۖ (۲۷) فرعون نے (حاضرین سے کہا) "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، پاگل معلوم ہوتے ہیں۔"

اس پر حضرت موسیٰ نے سابقہ دلیل کی تکمیل کی اور اضافہ کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنَّ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (۲۸) موسیٰ نے کہا۔ "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔"

گویا مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچئے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارہ فرعون ہے جو زمین کے ذرا سے رقبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مہرسمیت ہر چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے، میں تو فرمان روائی اس کی مانتا ہوں اور اس کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

دلیل کے میدان میں لاچار ہو کر فرعون کے لئے تسلیم و رضا کا مسک بھجھ ہو سکتا تھا لیکن تکبر و غرور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لئے پھر اس نے سینہ زوری

کا راستہ اختیار کیا اور کہنے لگا۔

قَالَ لَئِنْ آتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَجُعَلَنَّكَ مِنَ الْمُنْجُذِينَ (۲۹۱) اے

ترجمہ :- اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس گفتگو کو سمجھنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی ”معبود“ کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا یعنی یہ کہ بس اسے پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس کے استمداد و استغاثات کے لئے دعائیں مانگیں لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق بدرجہا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کو قانون برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمان رواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں، وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختار مطلق ہیں کسی معبود کو ہماری سیاست، ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ حکومتوں اور بادشاہوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے، انہوں نے ان سے خداوند عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں، بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھہرایا ہے جو اس کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے، اس تشریح سے فرقوں کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھو طرح سمجھ میں آسکتا ہے، اگر مبالغہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک

اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں، اگر صرف اسی معنی میں توحید العبادت کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضب ناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دین آبادی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا کہ میرے مذہب کے پندتوں سے مناظرہ کر لو لیکن جس چیز نے اسے غضب ناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ وہ گویا ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آکر اس سے اطاعت امر کا مطالبہ کر رہا ہے، اس معنی میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری ماننے کے لئے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم برتر مانے، اس لئے پہلے رب العالمین کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبودیت کا نہیں بلکہ گھلا گھلا سیاسی اقتدار اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا، پھر جب حضرت موسیٰؑ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العالمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف دھمکی دے دی کہ ملک مصر میں تم نے میرے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

اس کے اس لالین جواب پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ کیا تو میرے رب للعالمین کے نمائندہ ہونے کا انکار ہی کرتا رہے گا، اگرچہ میں صریح دسلے آؤں؟
 قَالَ اَوَلَا تُحِشُّونَ لِمِثْلِي مُبِينٍ (۳۰) موسیٰؑ نے کہا اگرچہ میں لے آؤں
 تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟

یعنی کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا۔ جب کہ میں اس امر کی صریح دلیل پیش کروں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب للعالمین۔ رب السموات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے۔؟

اس بات پر فرعون نے عام مشرکین کی طرح فوق الفطری صریح نشانی کا مقابلہ کر دیا۔

قَالَ فَاتَّبِعْ إِن كُنتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۲۱) فرعون نے کہا: اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے۔

حضرت موسیٰ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا، وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ کے الٰہیہ ہونے کو ماننا تھا اور اپنی کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامر من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اس کا جیجا ہوا ہوں، اور اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالک کائنات ہونے ہی میں اسے کلام ہونا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا، نشانی کی بات تو اس صورت میں درمیان آ سکتی تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کا قادر مطلق ہونا تو تسلیم ہو، اور سخت اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰ اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

اب حضرت موسیٰ کی حکمت تبلیغ کا نمونہ: اِظْهَرْنَا یٰٓیۡہٗ مَا کُنْتَ لَکَ.

سورہ القصص - آیت ۳۷۔ وَقَالَ مُوسٰی رَبِّیْ اَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ رَبَّالْہٰدِیْ مِنْ عِنْدِہٖ وَمَنْ تَوَلّٰی لَہٗ عَاقِبَةُ الدّٰرِ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُونَ. اے

موسیٰ نے جواب دیا: "میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو

جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام

کس کا اچھا ہوتا ہے، حق یہ ہے کہ ظالم کبھی نلاح نہیں پاتے۔

یعنی تفہیم القرآن

یعنی مجھے تو سحر اور افترا پر دانا قرار دیتا ہے، لیکن میرا رب میرے حال سے
 خوب واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس کی طرف سے رسول مقرر کیا گیا ہے
 وہ کیسا آدمی ہے، اور آخری انجام کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے، میں جھوٹا ہوں
 تو میرا انجام بڑا سہوگا اور تو جھوٹا ہے تو پھر خوب جان لے کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہے۔
 بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ظالم کے لئے فلاح نہیں ہے، جو شخص خدا کا
 رسول کا نہ ہو اور جھوٹ موٹ رسول بن کر اپنا کوئی مفاد حاصل کرنا چاہے وہ
 بھی ظالم ہے اور فلاح سے محروم رہے گا۔ اور جو طرح طرح کے جھوٹے الزامات
 لگا کر پیسے رسول کو جھٹلاتے اور مکاریوں سے صداقت کو دبانا چاہے تو وہ بھی
 ظالم ہے اور اسے کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔

حق کے مقابلے میں باطل کا انداز استدلال

تاریخ کے ہر دور میں باطل کے پاس حق کے مقابلے میں ہٹ دھرمی، الزام تراشی اور یادہ گوئی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں اسی ہے، اس بات کو قرآن نے کہا ہے
 فَلَا يَنْتَظِرُونَ سَبِيلًا - کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔
 باطل پرست حق کے مقابلے میں عناد اور تعصب سے اندھے ہو جاتے ہیں۔
 ان کا دامن مقبول دلائل سے ہمیشہ خالی ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ لچر اور پوٹج باتوں سے ایک مدلل اصولی دعوت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے لوگو، یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں، جواب میں شرک کے معقول ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی، بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مٹا ہوا آدمی ہے، وہ کہتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت ہیں، جواب میں شور بلند ہوتا ہے کہ یہ جادو گر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم دنیا میں شتر پہ مہار بنا کر نہیں چھوڑے گئے، وہ تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی امور دلالت کرتے ہیں، جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاعر ہے، وہ کہتا ہے میں خدا کی طرف سے تمہارے لئے تعلیم حق لے کر آیا ہوں، اور یہ ہے وہ تعلیم حق، جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی، بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے، وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے اور اس اخلاقی انقلاب کو

بیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیروں کی زندگی میں ہو رہا تھا، مگر منافقت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے، پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردل میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ عرض یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بتے لگی باتیں مانگ رہا ہے۔

اس کے بعد ان کی تجویز کردہ چیزوں کے بارے میں فرمایا:

مَلِكُكَ الَّذِي اِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِنْ ذَلِكَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَا يَصْلُحُ لَكَ قُصُورُهُ (الفارقان: ۱۰)

ترجمہ: ”اے بادشاہ! وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، ایک نہیں بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور بڑے بڑے محل۔“

تبارک: کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنی ہیں ”بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے“ غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے۔ اس سے بالاتر ہے کہ کسی حق میں کوئی مہملاتی کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ وَقَالُوا لَا يَمَسُّنَا كَذِبُ السَّاعَةِ سَعِيرًا اِذَا رَأَوْهُ مِنْ مَكَانٍ اَبْيَدٍ سَمِعُوا لَهَا لَعْنًا وَزَخِيرًا وَاِذَا الْقُورُ مِنْهَا مَكَاثِفًا مُقَرَّبِينَ دَعَوْا هَٰذَا الَّذِي كُفِّرُوا عَنْهُ يَوْمًا وَآخِرًا اَوْ اَدْعَوْا نُبُورًا كَثِيرًا قُلْ اِنَّ لَكُمْ خَيْرًا مِنْ جَنَّةِ الْخُلْدِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ لَكُمْ فَهُمْ جَدَاءٌ وَمَعِيرًا لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ط كَانَتْ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُورًا (الفارقان: ۱۱ تا ۱۶)

ترجمہ :- اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اس گھڑی" کو جھٹلا چکے ہیں۔ اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لئے ہم نے مہر لکھتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے، وہ جب دوسرے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے جوش اور غضب کی آواز سن لیں گے اور جب یہ دستِ پابند اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے (اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو۔

ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے جو ان کے عمل کی خیر اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ اَصْلَٰ بُاتٍ بِہِ ہِے کہ یہ لوگ اس گھڑی کو جھٹلا چکے ہیں یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ واقعی کسی قابلِ ملاحظہ دلیل کی بنا پر قرآن کے جعلی کلام سونے کا شبہ ہے یا ان کو درحقیقت یہ گمان ہے کہ جن آزاد کردہ غلاموں کا یہ نام بیٹے ہیں وہی تم کو سکھاتے پڑھاتے ہیں، یا انہیں تمہاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھانے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو۔ یا وہ تمہاری تعلیم حق کو ان لینے کے لئے تیار تھے مگر صرف اس لئے رک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمہاری اردلی میں تھا اور نہ تمہارے لئے کوئی خزانہ اتارا گیا تھا، اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ آخرت کا انکار ہے جس نے ان کو حق اور باطل کے مسئلے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اور تمہاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لئے ایسی ایسی مضحکہ خیز جتنیں پیش کرنے لگتے ہیں، ان کے ذہن اس تجل سے خالی ہیں کہ اس زندگی کے بعد اور زندگی بھی ہے۔ جس میں انہیں خدا کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس

چاروں کی زندگی کے بعد مکر سب کو مٹی ہو جاتا ہے، بت پرست بھی مٹی ہو جاتے گا اور خدا پرست بھی اور مکر خدا بھی، نتیجہ کی چیز کا بھی کچھ نہیں نکلتا ہے، پھر کیا فرق پڑ جاتا ہے مشترک ہو کر مرنے اور موجد یا ملحد ہو کر مرنے میں، صحیح اور غلط کے امتیاز کی اگر ان کے نزدیک کوئی ضرورت ہے تو اس دنیا کی کامیابی، ناکامی کے لحاظ سے ہے اور یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کسی عقیدے اور اخلاقی اصول کا بھی کوئی متعین نتیجہ نہیں ہے، جو پوری یکسانی کے ساتھ ہر شخص اور ہر رویے کے معاملے میں نکلتا ہو، دھربے آتش پرست اور عیسائی، موسائی، ستارہ پرست، بت پرست اور ہر اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں، کوئی ایک عقیدہ نہیں جس کے متعلق تجربہ بتاتا ہو کہ اسے اختیار کرنے والا، یا رد کرنے والا اس دنیا میں لازماً بد حال رہتا ہو، بدکار اور نیکوکار بھی یہاں ہمیشہ اپنے اعمال کا ایک ہی مقدر نتیجہ نہیں دیکھتے، ایک بدکار مزے کر رہا ہے اور دوسرا سزا پا رہا ہے۔ ایک نیکوکار مصیبت جھیل رہا ہے تو دوسرا مغرور محترم بنا ہوا ہے۔ ہنذا دنیوی نتائج کے اعتبار سے کسی مخصوص اخلاقی رویے کے متعلق بھی مکر آخرت اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ خیر ہے یا شر ہے، اس صورت حال میں جب کوئی شخص ان کو ایک عقیدے اور اخلاقی ضابطے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ تو غراہ کیسے ہی سنجیدہ اور مقتول دلائل کے ساتھ انہیں دعوت پیش کرے۔ اور ایک مکر آخرت کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا۔ بلکہ طفلانہ اعتراضات کر کے اسے ٹال دے گا۔

جب مکر بن درمندی مٹ دھرم لوگوں کا بد انجام ذکر کے اس بات پر توجہ دلائی جائے کہ یہ انجام بہتر ہے یا خدا سے ڈرنے والوں اور پرہیزگاروں کے لئے ابدی جنت کا جس کا وعدہ رب العالمین کر چکے ہیں، اس میں فرمایا وَعْدًا مُّسْتَوْکَا لَیَعْنِیَ السَّادِعْدَہ جِس کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک شخص سوال اٹھا سکتا ہے کہ جنت کا وعدہ اور دوزخ کا ڈر اور کسی ایسے شخص پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے جو قیامت اور جنت و نشت اور دوزخ کا پہلے ہی

مگر ہو؟ اس لحاظ سے تو یہ بظاہر ایک بے عمل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن محض ظاہر اس غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے، اگر معاملہ یہ ہو کہ میں بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا، تو بحث و جدت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، لیکن اگر میں اپنے مخاطب سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہوں کہ زیر بحث مسئلہ میری بات ماننے کا نہیں بلکہ تمہارے مفاد کا ہے، تو مخاطب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے، اس صورت میں مخاطب کو خود اپنی بھلائی کے نقطہ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہر حال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے اور امکان دونوں کا ہی ہے۔ اب اگر دوسری زندگی نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں، تو ہمیں بھی مکر مٹی ہو جانا ہے اور آخرت کے قائل کو بھی، اس صورت میں دونوں برابر رہیں گے۔ لیکن اگر کہیں بات دہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے تو یقیناً پھر ہماری غیر نہیں ہے، اس طرح یہ طرز کلام مخاطب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جائے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔

فہم دین کا حکمانہ طریقہ

قرآن نے اس کا عمدہ طریقہ سورہ الشعراء آیت ۷۰ تا ۷۶ میں بیان کیا ہے جب ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ اور قوم سے مخاطب ہوتے ہیں اور سوال فرماتے ہیں کہ۔ مَا تَعْبُدُونَ (۷۰) یہ کیا چیزیں جن کو تم پوجتے ہو؟

قَالُوا الْعِبَادُ لَنَا مَا مَنَعَكَ اَنْ تَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ (۷۱) انہوں نے جواب دیا۔

کچھ بت ہیں جن کو ہم پوجا کرتے ہیں اور انہیں کی سیوا میں لگے رہتے ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ اِذْ تُسَبِّحُونَ (۷۲) اَوْ يَسْأَلُونَكَ اَوْ يَسْأَلُونَكَ (۷۳)

اس نے کہا، پوچھا ”کیا یہ تمہاری سنتے ہیں، جب تم انہیں پکارنے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔؟“

قَالُوا قَبْرُنَا أَبَاؤُكَ ذَلِكُ يَفْعَلُونَ ﴿۷۴﴾ انہوں نے جواب دیا۔

”نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔“

قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَتَا كُنْتُمْ تُعْبُدُونَ ﴿۷۵﴾ اُنْتُمْ قَوْمٌ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷۶﴾

اس پر ابراہیم نے کہا ”کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی ہے

جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا ایسا لاتے رہے۔

یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لئے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ

دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے سیمینل ورنل بس یونہی آنکھیں بند کر کے تمہیں

مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم سبجا لا رہے ہیں

ان کے اندر خدائی کی واقعی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں اور وہ ہماری

قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ تو اس پریوں

چوڑ نکلتے ہیں۔

فَأَنصَرَفُ إِلَىٰ آلِهَتِهِنَّ الْأَدْبَابِ الْعَلِيِّنَ ﴿۷۷﴾

”میرے تو یہ سب دشمن ہیں البتہ ایک رب العالمین کے۔“

یعنی جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش

کردں گا تو میری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت

کو بے نفع اور بے ضرر نہیں بلکہ الٹا نقصان دہ سمجھتا ہوں، اس لئے میرے نزدیک

اس کو پوجنا تو دشمن کو پوجنا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم کے اس

قول میں اس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورہ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً

لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا

ترجمہ :- انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں تاکہ وہ ان

کے لئے ذلیل و ناتوان ہوں، ہرگز نہیں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ اور اٹھیں ان کے مخالف ہوں گے۔۔۔

یعنی قیامت کے دن وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اور صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، ناہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔ یہاں حکمت تبلیغ کا ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے، حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو مخالف کے لئے ضد میں مبتلا ہو جانے کا نیا وہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے، بخلاف اس کے جب انہوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخالف کے لئے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور بڑے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے، اس طریقہ سے حضرت ابراہیمؑ نے گویا ہر انسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کبھی اپنا برا نہیں چاہتا، انہوں نے اسے بتایا کہ میں تو خود ان کی بندگی میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ دانستہ میں اپنی بدخواہی نہیں کر سکتا، لہذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے اجتناب کرتا ہوں اس کے بعد مخاطب فطرۃ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو۔

غور و فکر کی دعوت

قرآن نے سورہ النمل - آیت (۵۹) فرمایا ہے -

اَللّٰهُ خَبِيرٌۭ اَمَّا لَيْسَ بِرَکُوْمٍ ۝۵۹ (ان سے پوچھو)

”اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟“

بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبودان باطل
حقیقت کے اعتبار سے تو معبودان باطل میں سرے سے کسی خیر کا سوال ہی نہیں ہے۔
کہ اللہ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رہے مشرکین تو وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے
کہ اللہ کا اور ان معبودوں کا کوئی مقابلہ ہے، لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لئے
رکھا گیا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوں۔ ظاہر ہے کوئی شخص دینا میں کوئی کام بھی اس
وقت تک نہیں کرتا۔ جب تک وہ اپنے نزدیک اس میں کسی مہملاتی یا فائدے کا
خیال نہ رکھتا ہو۔ اب اگر یہ مشرک لوگ اللہ کی عبادت کے بجائے ان معبودان
باطل کی عبادت کرتے تھے۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور
ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے۔ تو یہ اس کے بغیر بالکل بے معنی تھا کہ ان
معبودوں میں کوئی خیر ہو۔ اسی بنا پر ان کے سامنے صاف الفاظ میں یہ سوال رکھا
گیا۔ کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا تمہارے یہ معبود؟۔ کیونکہ اس دو ٹوک سوال کا سامنا کرنے
کی ان میں ہمت نہ تھی، ان میں سے کوئی کٹے سے کٹا مشرک بھی یہ کہنے کی جرأت نہ
کر سکتا تھا۔ کہ ہمارے معبود بہتر ہیں۔ اور یہ مان لینے کے بعد کہ اللہ بہتر ہے ان کے
پورے کے پورے دین کی بنیاد ڈھس جاتی تھی۔ اس لئے کہ پھر یہ بات سراسر نامعقول
قرار پاتی تھی کہ بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اس طرح قرآن نے تقریر کے پہلے ہی فقرے میں مخالفین کو بے بس کر دیا،
اس کے بعد اب پے درپے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک ایک کرشمے کی
طرف انگلی اٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس کے ہیں؟ ایک اللہ کے ساتھ
کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ دوسرے آخر
کیا ہیں کہ انہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت فرماتے تو
فوراً اس کے جواب میں فرماتے۔ بَلِ اللّٰهُمَّ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْكَوْمِ
نہیں بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔

خافل قوم کو چونکانے کی تدابیر

قرآن میں سورہ الشعراء آیت ۱۰۶ میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے۔

إِنِّي ذَالِكٌ لَّأَيُّهُ دَوْمًا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ -

”یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے، مگر ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔“
حضرت ابراہیم کے اس قصے میں نشانی کے رد پہلو ہیں، ایک یہ کہ مشرکین عرب بالخصوص مکہ کے لوگ، ایک طرف حضرت ابراہیم کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انساب پر فخر کرتے تھے، مگر دوسری طرف اسی شرک میں مبتلا تھے جس کے خلاف جدوجہد کرتے، ان کی عمر بیت گئی تھی اور ان کے لئے ہونے دین کی دعوت اب جو نبی پیش کر رہا تھا اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے تھے جو حضرت ابراہیم کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ ان کو یاد دلایا گیا کہ حضرت ابراہیم تو شرک کے دشمن اور دعوت توحید کے علمبردار تھے، یہ خود بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرت ممدوح مشرک نہ تھے۔ مگر پھر بھی یہ اپنی ضد پر قائم ہیں، دوسرا پہلو اسی قصہ میں نشانی کا یہ ہے کہ قوم ابراہیم دینا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کا اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوئی تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیل واسحاق) کی اولاد ہی کو نصیب ہوئی، قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار مغضوب قوموں ہی میں کیا گیا ہے۔

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ
ثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَةَ (التوبہ رکوع ۹۷) اے

اہل کتاب اور دعوتِ دین

قرآن نے اہل کتاب کے سامنے دعوتِ حق پیش کرنے کا حکم نہ طریقہ بتایا ہے۔
 وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۖ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأَنْزَلَ إِلَيْكُمُ
 وَالْهَذَا دِينُكُمْ دَاخِرُ دَعْوَانَا لِلْمُسْلِمِينَ - النکبت - ۴۶ رکوع ۱۶

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو، مگر عمدہ طریقہ سے۔ یعنی مباشرتہ منقول و لائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیئے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے، مبلغ کو اس بات کی فکر ہونی چاہیئے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار سکے اور اسے راہِ راست پر لائے، اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیئے، جس کا مطلب اپنے مد مقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گرمی کرنی چاہیئے، جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفا یاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباشرتہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے۔ مگر یہ اہل کتاب کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً
 اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النمل رکوع ۱۶)

”دعوتِ وراپے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباہلہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہوں۔“

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي

بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حکم السجدہ - رکوع ۵) ۱۷

مہلانی اور برائی یکساں نہیں ہے (مخالفین کے جھگڑوں کی) مدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ سَمِیعُ الْمَلَمُ مَا یُصِفُونَ (المومن - رکوع ۶) ۱۸

تم بدی کو اچھے ہی طریقے سے دفع کرو۔ جہیں معلوم ہے جو باتیں (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔

هَذِهِ أَمْسِرُّ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ه (مَائِدَہ ۲۸) ۱۹

مِنْ الشَّيْطَانِ نَذْرٌ فَإِسْتَعِذْ بِاللَّهِ (الاعراف - رکوع ۲۸) ۲۰

”درگزر کی روش اختیار کرو، مہلانی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو۔ اور اگر

اتر کی ہتر کی جواب دینے کے لئے شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔“

اللہ تعالیٰ نے خود اس عمدہ طریقے بہت

کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغ حق کی خدمت انجام دینے کو اختیار کرنا چاہیئے اس

میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمہیں بحث کرنی ہو اس کی گمراہی کو بہت کا لفظ

آغاز نہ بناؤ۔ بلکہ بات اس سے شروع کرو کہ حق و صداقت کے کون سے اجزاء ہیں

جو تمہارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں، یعنی آغاز کلام نکالتے اختلاف سے نہیں

بلکہ نکالتے اتفاق سے ہونا چاہیئے۔ پھر انہی متفق علیہ امور سے استدلال کر کے مخاطب

کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے، کہ جن امور میں تمہارے اور اس کے درمیان

اختلاف ہے، ان میں تمہارا مسلک متفق علیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے، اور

اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔

اس سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کی طرح وحی و رسالت اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح ان سب حقیقتوں کو مانتے تھے، ان بنیادی امور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیاد اختلاف ہو سکتی تھی، تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے مانے ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے مانے ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی انہیں دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انہیں کا فر قرار دیتے، یہ جھگڑے کی بڑی مضبوط وجہ ہو سکتی تھی، لیکن مسلمانوں کا موقف اس سے مختلف تھا، وہ تمام ان تمام کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہل کتاب کے پاس موجود تھیں، اور پھر اس وحی پر ایمان لاتے تھے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد بتانا اہل کتاب کا کام تھا کہ کس معقول وجہ سے وہ خدایٰ کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہل کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا یہی موقف ان کے سامنے پیش کرو۔ ان سے کہو کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی کو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں، اس کی طرف سے جو احکام و ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں، ان سب کے آگے ہمارا سر تسلیم خم ہے، خواہ تمہارے مانے ہوئی یا ہمارے مانے ہوئی۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں، ملک اور قوم اور نسل کے بندے نہیں ہیں کہ ایک خدا کا حکم آئے تو ہم مانیں اور دوسری جگہ آئے تو ہم اس کو نہ مانیں۔

اشتغال سے شدید پرہیز | دعوت دین دینے کے لئے دعوت نکر دینے کے ساتھ ساتھ غماط کے جذبات کو مشتعل نہ ہونے دینا۔

قرآن نے یہ آیت دی ہے۔

نَلَّ مِنَ بَیْرُکُمْ مِنَ السَّابِ وَالْأَرْضِ آمَنُ یُبَلِّغُ السَّمْعَ
وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ یُعْرِجُ الْحَقَّ مِنَ الْمِیَّتِ وَیُعْرِجُ الْمِیَّتِ
مِنَ الْحَقِّ وَمَنْ یُبْدِیْ الْأَمْرَ فَسَیَقُولُونَ اللَّهُمَّ فَعَلْ
أَفَلَا تَتَّقُونَ - (یونس - ۳۱)

”ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی توفیق کس کے اختیار میں ہے؟ کون بے جان ہیں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ کہو، پھر تم حقیقت کے خلاف چلنے سے کیوں پرہیز نہیں کرتے۔“

فَإِذَا الْبَحْدُ الْحَقُّ إِلَّا الضَّلَالُ ۚ مَا أَتَى النَّفْسَ الْكَافِرَةَ إِلَّا الْهُدَىٰ ۚ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (سجۃ: ۲۶-۲۷)
یعنی یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود مانتے ہو، تب تو تمہارا حقیقی پروردگار، مالک۔ آتما۔ اور تمہاری بندگی اور عبادت کا حقدار اللہ ہی ہوا، یہ دوسرے جن کا ان کاموں میں کوئی حصہ نہیں آخر ربوبیت میں کہاں سے شریک ہو گئے؟

پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھراٹے جا رہے ہو؟ خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے، اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو، بلکہ یہ ہے کہ ”تم کدھر پھراٹے جا رہے ہو؟“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو جمع رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں سے یہ اپیل کی جا رہی ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو۔ اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے، یہ طرز سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغہ مہول کے پردے میں چھپایا گیا ہے تاکہ ان کے متعصبین ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور نہ کر سکیں اور کسی کو یہ کہہ کر انہیں اشتغال دلانے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو یہ تمہارے بزرگوں اور پیشواؤں پر چڑھیں کی جا رہی ہیں، اس میں حکمت تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔

اصولوں میں ثابت قدمی اور عدم مدامنت

قرآن نے یہ راستہ دکھایا ہے کہ مومنین کو چاہیے کہ وہ اپنی نیکی سے ظالموں کی برائیوں کو شکست دیں۔ فرمایا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۱۲) وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلِينَ وَلَا الْاٰخِرِينَ وَلَا تَتَّبِعُوا اَمْرًا مِّنْ بَيْنِهِمْ (۱۱۳) وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۡرَ شُمْ لَا يُنْصُرُوْنَ (۱۱۴) وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَ النَّهَارِ وَزُلْفَاۡ مِّنَ اللَّيْلِ ط اِنَّ الْاٰمَنَاتِ يُبْذَرْنَ اَلْاٰمَنَاتِ ط ذٰلِكَ ذِكْرُىۡ لِلَّذِىۡ يَلْتَمِسُ اَلْاٰمَنَاتِ (۱۱۵)

”سپس اے محمد! تم، اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) ہٹ آئے ہیں: ٹھیک ٹھیک راہ پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے، اور جنگی کی حد سے بچاؤ نہ کرو، جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے، ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا، جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور تمہیں سے تمہیں امداد نہ پہنچے گی، اور دیکھو نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گونے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے، ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں، اور صبر کرنا، اور اللہ کی نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔“

فرمایا گیا ہے، کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یعنی جو برائیاں دینا میں پسلی ہوئی ہیں، اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو، اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ

یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی، جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے۔ بلکہ اسے دینے کے دینا میں عملائیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔

مواقع تبلیغ سے استفادہ | قرآن میں بیان کئے گئے واقعہ حضرت یوسف سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کے لئے کس طرح موقع نکالا، اس میں ہم کو حکمت تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے، دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَأَيْتُ أَحْصِرَ خَمْراً
وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَأَيْتُ أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا
بِمَا نَوْنِمُ ۚ إِنَّا كُنَّا مِنَ الْمُؤْتَسِرِينَ ۝ (یوسف: ۳۶)

(یوسف) قید خانے میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے، ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں" دوسرے نے کہا کہ "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں" دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔

جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا، مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر بتاتا ہوں۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُدْرِكُهُ إِلَّا نَبَأٌ ثَكَلَمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ
يَأْتِيَكُمَا ذِكْمًا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ (یوسف: ۳۷)

یوسف نے کہا "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا، یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں

اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ نے ان کے سامنے اپنے دین کی دعوت پیش کرنا شروع کر دی۔

إِنِّي مُرَكَّبٌ مِّمَّةٍ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ خَصَمٌ كَثِيرًا ۖ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي ابْرَهِيمَ وَاسْحَقَ وَلِيعْقُوبَ ط مَا كَانَ لَنَا أَنْ نَشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ (یوسف: ۳۸)

”واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا دینا چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے ہمارا یہ کام نہیں کہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائیں، درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوتی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو۔ تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے، جسے دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی، اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور اسے کبھی محسوس نہیں کرتا، کہ یہ موقع ہے یعنی بات کہنے کا، مگر وہ جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کئے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے لیچرٹپن اور جھگڑالو پن سے انہیں الٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے، حضرت یوسف چھوڑتے ہی دین کے تفصیلی اصول و ضوابط

پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستہ سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔

يَا صَاحِبِي السِّجْنِ أَمْ رَبَّابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرًا أَمْ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ
۱۔ اے زندان کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟

اور اس فرق کو وہ ایسے مقبول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان سے مخاطب تھے، ان کے دل درمناغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہو گی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک اتقا کا غلام ہونا بہتر ہے۔ یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی، پھر یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو۔ اور میرے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے ہیں، اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑا کر دوسروں کو اپنے رب بناتے ہیں، پھر اپنے غلطیوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر نہایت مغفولیت کے ساتھ، اور دل آناری کے ہر شایعے کے بغیر، بس اتنا کہتے پر کفایت کرتے ہیں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَهْمًا تُبَدِّلُوهَا
مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ سُلْطَانٍ ط إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ ط أَمَّا لَا تَعْبُدُوا
إِلَّا آيَا ط ذَلِكَ الَّذِينَ الْقِيمُ وَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ه

(یوسف: ۲۰)

تفہیم القرآن ۱۱ تفہیم القرآن ۱۲

اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ نے ان کے سامنے اپنے دین کی دعوت پیش کرنا شروع کر دی۔

اِنِّ تَوَكَّلْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرٰوْنَ
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۡءِیْ اِجْرَھِیْمَ وَاَسْحَقَ وَاَعْقُوْبَ ط مَا كَانَ لَنَا اَنْ
نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلٰی النَّاسِ وَ
لٰكِنَّا الْاَكْثَرُ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ (یوسف: ۳۸)

”واقف یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے ہمارا یہ کام نہیں کہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائیں، درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے، جسے دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی، اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور ایسے کبھی محسوس نہیں کرتا، کہ یہ موقع ہے یعنی بات کہنے کا، مگر وہ جسے دھن لگی ہوئی ہوئی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کئے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے لچر پن اور جھگڑالو پن سے انہیں الٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے، حضرت یوسف چھوڑتے ہی دین کے تفصیلی اصول و ضوابط

پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستہ سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔

يُصَاحِبِي السَّجْنَ اَوْ رَبَّابٍ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرًا اِمَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ
۱۔ اے زندان کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ
ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟

اور اس فرق کو وہ ایسے مقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان سے مخاطب تھے، ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہو گی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک اتنا کا غلام ہونا بہتر ہے۔ یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی، پھر یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو۔ اور میرے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے ہیں، اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑا کر دوسروں کو اپنے رب بناتے ہیں، پھر اپنے فاطہوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر نہایت معقولیت کے ساتھ، اور دل آزاری کے ہر شایعے کے بغیر، بس اتنا کہتے پر کف کرتے ہیں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ اِلَّا اَسْمَاءُ سَمِيُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ
مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ سُلْطٰنٍ ط اِنْ اِلْكُمُ اِلَّا اللّٰهُ ط اَمْ اِلَّا تَعْبُدُوْا
اِلَّا اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَاٰلَكُنَّ النَّاسُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف ۲۰۱)

تفہیم القرآن ۱ تفہیم القرآن ۲

”اس غالب و قاهر اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے
سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد
نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی، فرمانبرواری
کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے
سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیکہ سیدہ طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ
جانتے نہیں ہیں۔“

یعنی یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا کسی کو خداوند نعمت کسی کو مالک زمین
اور کسی کو رب دولت یا متناہ صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب خالی خول نام ہی ہیں
ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور مالکیت اور بلوبیت موجود
نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو
اور اس نے ان میں سے کسی کے لئے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں
اتاری ہے۔ اس نے تو فرمانبرواری کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لئے مخصوص
کر رکھے ہیں۔ اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

حکمت تبلیغ کی ایک اور مثال | حکمت تبلیغ کی ایک اور مثال اسی سورہ یوسف

کرنے کے بعد بات کو ختم کرنے سے پہلے اپنے مقصد کی بات بھی سنا دی گئی ہے۔
ظاہر ہے کہ قصہ یوسف کو تو اہل مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغور حجت بازی کے
معلوم کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ آپ بیان نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب قرآن نے
یہ واقعہ بڑی خوبصورتی اور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اور سب لوگوں کو اپنی طرف
متوجہ کر لیا تو سورۃ کے آخر میں جیسے ہی قصہ ختم کیا تو چند جملے اپنے مطلب کے بھی
کہہ دیئے۔ جو نہایت درجہ اختصار سے بیان کئے ہیں اور ان چند جملوں ہی میں کیفیت
اور دعوت کا سارا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے۔

وَكَايِن مِّنْ آيَاتِنَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ

مِنْهَا مَعْصُومُونَ ۝ دَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (یوسف: ۱۰۶)

”زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرنے، ان سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔“

(توجہ نہیں کرتے) اس سے مقصد لوگوں کو ان کی غفلت پر متوجہ کرنا ہے انہیں اور آسمان کی ہر چیز سمجھانے اور اپنی جگہ محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے، حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے، جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ انسانوں کا سا دیکھنا نہیں بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا دیکھتے ہیں۔ درخت کو درخت اور پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان چیزوں کا مصرف بھی جانتا ہے، مگر جس مقصد کے لئے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے وہ صرف آدمی حد تک نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مصرف اور استعمال معلوم کرے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی حقیقت کی جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعے ان کا سراغ لگائے، اسی معاملہ میں اکثر انسان غفلت برتتے رہے ہیں اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر دلوں پر یہ قفل نہ پڑھا لیا ہوتا تو انبیاء کی بات سمجھنا اور ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا اس قدر مشکل ہو جاتا۔

(اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں) یہ فطری نتیجہ ہے اس غفلت کا جس کی طرف اوپر کے فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے نشان راہ سے آنکھیں بند کیں تو سیدھے راستے سے ہٹ گئے، اور اطراف کی جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گئے، اس پر بھی کم انسان ایسے ہیں جو منزل کو بالکل ہی گم کر چکے ہوں اور جنہیں اس بات سے قطعی انکار ہو کہ خدا ان کا خالق و رزاق ہے۔ بیشتر انسان جس گمراہی میں مبتلا

میں، وہ انکارِ خدا کی گمراہی نہیں بلکہ شرک کی گمراہی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اختیار اور حقوق میں دوسرے بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں، یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہوتی اگر زمین و آسمان کی ان نشانیوں کو نگاہِ عبرت سے دیکھا جاتا جو ہر جگہ اور ہر آنِ خدائی کی وحدت کا پتہ دے رہی ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے۔

أَفَاَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ أَفَإِنَّمَا يَهْتَمُّ السَّاعَةُ
بِغُتَّتِهِمْ لَا يَشْعُرُونَ ه (یوسف: ۱۰۷)

”کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کی طرف سے کوئی عذاب آکر انہیں و بونج نہ لے گا۔ یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی۔“
اس سے مقصد لوگوں کو چونکا نا ہے کہ فرصتِ زندگی کو دراز سمجھ کر اور حال کے امن کو دائم خیال کر کے فکرِ مال کو کسی آنے والے وقت پر نہ ٹالو۔ کسی انسان کے پاس بھی اس امر کے لئے کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کی مہلتِ حیات نلاں وقت تنگ یقیناً باقی رہے گی، کوئی نہیں جانتا کہ کب اچانک اس کی گرفتاری ہو جاتی ہے، اور کہاں سے کس حال میں وہ پکڑ بلایا جاتا ہے، تمہارا شبِ روز کا ستر یہ ہے کہ پردہِ مستقبل ایک لمحہ پہلے بھی خبر نہیں دیتا کہ اس کے اندر تمہارے لئے کیا چھپا ہوا ہے۔ لہذا کچھ فکر کرنی ہے تو ابھی کر لو۔ زندگی کی جس راہ پر چلے جا رہے ہو اس میں آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھہر کر سوچ لو کہ کیا یہ راستہ ٹھیک ہے، اس کے درست ہونے کے لئے کوئی واقعی حجت موجود ہے؟ اس کے راہِ راست ہونے کی کوئی دلیلِ آثارِ کائنات سے مل رہی ہے۔ اس پر چلنے کے جو نتائج تمہارے اہلئے نوعِ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ اور جو نتائج اب تمہارے تمدن میں رونما ہو رہے ہیں کیا وہ بھی تصدیق کرتے ہیں کہ تم ٹھیک جا رہے ہو؟

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ

اللّٰهُ وَمَا آفَاكُمُ شُرَكَّائِيْنَ ۝ (يوسف: ۱۰۸)

”تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف سے بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔“

دعوتِ حق باوقار انداز میں | دعوتِ حق پیش کرنا ایک باوقار کام ہے، یہ پیچھے پڑ کر کرنے کا کام نہیں ہے۔ سورۃ الذاریات ۵۴۔ میں فرمایا گیا ہے۔

فَسَوَّلْ عَنْهُمْ نَمًا اَنْتَ بِمُكْرَمٍ ۝

”ان سے رنج پھیر لو۔ تم پر کچھ ملامت نہیں ہے۔“

اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو ابھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ ایک داعی حق جب کسی شخص کے سامنے منقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت صاف صاف پیش کر دے اور اس کے شبہات و اعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے، اس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ خیال پر جما رہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعی حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضروری نہیں کہ وہ اسی شخص کے پیچھے پڑا رہے۔ اس سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنانا ہے، داعی اپنا فرض ادا کر چکا، وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔۔۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ قاعدہ اس لئے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ مافاذ اللہ آپ دینی تبلیغ میں بے جا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے، اور

اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعی غیبی کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑا لوپن کے آثار دیکھ کر ان سے کنراکشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے چڑ جاتے ہیں۔ اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ وہ صاحب، آپ اچھے دعوت حق کے علمبردار ہیں۔ ہم آپ سے سمجھنے کے لئے بحث کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہماری طرف التفات ہی نہیں کرتے، حالانکہ ان کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی جتنا بستی میں داعی کو الجھانا اور محض اس کی تفسیح ادوات کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام پاک میں بالفاظ صریح یہ فرما دیا کہ ”ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو، ان سے بے التفاتی کرنے پر تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی۔“ اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپ لے کر آئے ہیں اس کی رو سے تو آپ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں، پھر آپ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

دعوت حق کا تسلسل قرآن پاک میں دعوت دین کے بارے میں یہ بات بھی گئی ہے۔

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ يَ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (الذکریت: ۵۵)

”اللہ تعالیٰ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے۔“

اس آیت میں تبلیغ دین کا ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے، دعوت حق اصل مقصد ان سبیداروں تک ایمان کی نعمت پہنچانا ہے، جو اس نعمت کے قدر شناس ہوں، اور اسے خود حاصل کرنا چاہیں، مگر داعی کو معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سبیدار وہیں کہاں ہیں، اس لئے اس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوت عام کا سلسلہ برابر جاری رکھے۔ تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں، وہاں اس کی آواز پہنچ جائے، یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں، انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے، اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر

خدا کے راستے پر لاکھڑا کرنا اس کے پیش نظر ہونا چاہیئے، بیچ میں ارلاد آدم کا جو فضل و غصہ اس کو ملے اس کی طرف بس اسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیئے، جب تک اسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنس کا سد ہے، اس کے کساد و فساد کا تجربہ ہو جانے کے بعد اسے اپنا قیمتی وقت اس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ اس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں اور ان پر اپنی قوت صرف کرنے سے نقصان ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔

قابلِ اعراض لوگ | قرآن مجید نے انسانوں کی اقسام کے لحاظ سے بعض لوگوں کے اہمیت دین

کے بارے میں اعراض کا مشورہ دیا ہے۔ چنانچہ سورہ النجم - آیت ۲۹ میں ان لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے جن کے پیچھے داعی کو قوت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

فَاعْرِضْ عَنْ مَّنْ كُوِيَ ۖ عَنْ ذِكْرِنَا وَكَمْ حِيدٌ إِلَّا الْحَيٰۤءُ ۚ
الْمُذْنِبٰۤی ۙ

"پس اے نبی، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا اسے کچھ مطلب نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

یعنی ان کے پیچھے نہ پڑو اور اسے سمجھانے پر بھی اپنا وقت ضائع نہ کرو، کیونکہ ایسا شخص کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا، جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو، جو دنیا کے مادی فائدوں سے باند تر ہو کر مقاصد اور اقتدار کی طرف ہٹاتی ہو اور جس میں اصل مطلب آخرت کی ابدی فلاح و کامرانی کو قرار دیا جا رہا ہے اس قسم کے مادہ پرست اور خدا بیزار انسان پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے توجہ ان لوگوں کی طرف کرو جو خدا کا ذکر سننے کے لئے تیار ہوں اور دنیا پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔ ذٰلِکَ مَبْلُغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۝ ان کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔

یعنی یہ لوگ دنیا اور اس کے فوائد سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں اس لئے ان پر محنت صرف کرنا لا حاصل ہے۔ اور سورہ الانعام میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

ذُرِّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَسَتْهُمْ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا - (الانعام: ۷۰)

”چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے
کی زندگی فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔“

اسلامی دعوت کے نقطہ نظر سے صرف طالب حق کی اہمیت ہے، حق سے بے نیازی برتنے والے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، سورہ عبس کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل پر تبصرہ فرمایا ہے جو حضرت ابن ام کثرم کی آمد پر آپ نے اختیار فرمایا تھا۔ معاملہ کی اصل نوعیت یہ تھی کہ جب بھی کوئی داعی اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو فطری طور پر اس کا رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت کو قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے، تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا، قریب قریب یہی طرز عمل ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا۔ جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوت حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا۔ نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تصور، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے، جو طالب حق ہو۔ چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر یا معذور ہو۔ اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے۔ خواہ وہ معاشرے میں کتنی ہی بڑا مقام رکھتا ہے۔ اس لئے آپ اسلام کی تعلیمات تو ان کے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبول حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی

بلند پای و عورت کے مقام سے یہ بات فرد تر ہے کہ آپ اسے ان معذور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو ان کی ضرورت ہے۔

فرمایا گیا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۚ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ لَعَلَّكَ يَذَّكَّرُ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَكَ الَّذِي كَرِهْتَ ۚ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۚ فَاَنْتَ كَتَبْتَ كُفْرًا ۙ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۚ وَهُوَ يُعْطٰی ۚ فَاَنْتَ عَنْهُ تَكْفُرُ ۙ (عبس: ۱۰ تا ۱۷)

ترجمہ: ترش برہنہ رو ہوا اور بے رحمی برتی، اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان لے اور نصیحت کرنا اس کے لیے اتنی ہو؟ جو شخص بے پرواہی برتنا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو تمہارے پاس خود دڑکھاتا ہے اور وہ خدا سے ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رحمی برتتے ہو۔

یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ابن ام کثرم کے ساتھ آپ کے طرز عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ دینی حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے، اور کس کی نہ ہونی چاہیے، ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالب حق ہے وہ اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے وہ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔

دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صرف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوآلپ نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اسے راہ راست بتائی جائے، ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سدھرنے کے لئے تیار ہے اور کون اس منافع گروں کا مایہ کا سرے سے تدردان ہی نہیں ہے، پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، نگڑا ہو، لولا ہو، فقیر ہے لولا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعی حق کے لئے وہی قیمتی آدمی ہے، اس کی طرف اسے توجہ کرنی چاہیے کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے اور اس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کر لے گا۔ رہی دوسری قسم کا آدمی تو خواہ معاشرے میں کتنا ہی بااثر ہو اس کے پیچھے پڑنے کی داعی حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سدھرنا چاہے تو نہ سدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعی حق پر اس کی کوئی فصد واری نہیں۔

فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ کر دو، خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر پھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو، نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ ہو اس سے منہ موڑے۔ اس کے سامنے اسے بالاجب پیش کیا جائے اور نہ تمہاری یہ نشانی ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو۔ میں سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمہاری کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مانیں گے کہ تمہاری دعوت فروغ پا سکے گی۔ ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق الہ سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

اسی مضمون کو سورہ اعلیٰ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔
 وَنَبِّئِكَ الْمُسْرَىٰ ۚ قَدْ كُرْنَا نَفَعْتَ الَّذِي كُذِّبَ
 ”اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہذا تم نصیحت کرو اگر
 نصیحت نافع ہو۔“

عام طور پر مفسرین نے ان دونوں فقرہوں کو الگ الگ سمجھا ہے، پہلے فقرے
 کا مطلب انہوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمہیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل
 کرنا سہل ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب یہ لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو
 لیکن ہمارے نزدیک نہ کہ لفظ دونوں فقرہوں کو باہم مربوط کرتا ہے اور بعد
 کے فقرے کا مضمون دوسرے فقرے کے مضمون پر تشریح ہے، پہلے ہم اس ارشادِ الہی کا مطلب یہ سمجھتے
 ہیں کہ اے نبی، ہم تبلیغِ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم
 بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لئے میسر
 کئے دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے
 فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہے، اب یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے
 لئے تیار ہے اور کون تیار نہیں ہے یہ اس لیے ہے کہ اس کا پتہ تبلیغِ عام ہی سے چل سکتا
 ہے اس لئے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیے
 کہ اللہ کے بندوں میں سے ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہِ راست
 اختیار کر لیں، یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تربیت
 پر تمہیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں
 کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن کے متعلق تجربے سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت
 قبول نہیں کرنا چاہتے۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوتِ دین کو قبول
 قبولیتِ حق اور خدا ترس انسان

لے تعلیم القرآن

ہر قی ہے ناخدا ترسنا میں نہیں ہوتی۔ فرمایا :-
سَيَذَكِّرُكُمْ مِّنْ يَّحْشَىٰ (۱۰) (الاعلیٰ)

جو شخص ڈرتا ہے وہی نصیحت قبول کر لے گا۔

یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہوگا، اس کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اس بندے کی نصیحت کو تو جیسے سنے گا۔ جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور نفع و سعادۃ کا راستہ بتا رہا ہو۔۔

قبولیتِ حق سے عاری لوگ | قرآن نے بتایا ہے کہ جہاں خدا ترس انسان قبول حق کی استعداد رکھتا ہے وہاں بدعت اور ناخدا ترس انسان یہ صلاحیت نہیں رکھتا۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَتْقَىٰ ۚ الَّذِي يُضَيِّقُ النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۚ (الاعلیٰ: ۱۱-۱۲)
”اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدعت جو بڑی آگ میں جانے والا ہے۔“

اس لئے کہ درحقیقت دایلی کے تنہ سے وہی متنبہ ہوتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرنے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہے۔

إِنَّمَا تُذَكِّرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبِ ج
”تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدا کے رحمان سے ڈرے“ (سورہ یسین: ۱۱)

اس کے علاوہ یہ نشانی بھی بتائی گئی ہے کہ ضدی اور تکبران حق قبول کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۷)

ان میں سے اکثر لوگ نیکلاء عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ایمان نہیں لاتے۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے اور جنہوں نے طے کر لیا تھا کہ آپ کی بات بہر حال مان کر نہیں دینی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ”یہ لوگ فیصلہ نذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لئے یہ ایمان نہیں لاتے۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت ہو جانے پر ان کا حق دشمنی کی روش اختیار کرتے پلے جاتے ہیں، ان پر خود ان کی اپنی شامت اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انہیں تو نیک ایمان نصیب نہیں ہوتی اسی مضمون کو آگے چل کر اس فقرے میں کھولا گیا ہے کہ ”تم تو اس شخص کو بندہ کر سکتے ہو، جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے،“

لیے لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مثال دی گئی ہے۔ فرمایا۔
 اِنَّا جَعَلْنَا فِيْ اٰمَنَاتٍ قِيٰمَهُمْ اَعْلًا فَهَيَّ اِلٰى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۹﴾
 ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھڑکیوں تک جکڑے گئے ہیں، اس لئے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

یہاں ”طوق“ سے مراد ان کی ہٹ دھرمی ہے جو ان کے لئے قبول حق میں مانع ہو رہی تھی۔ ”ٹھڑکیوں تک جکڑے جانے“ اور ”سر اٹھائے کھڑے ہونے“ سے مراد وہ گردن کی اکڑ ہے جو تکبر اور نخوت کا نتیجہ بنتی ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ان کی گردن کا طوق بنا دیا ہے، اور جس کبر و نخوت میں یہ مبتلا ہیں، اس کی وجہ سے ان کی گردنیں اس طرح اکڑ گئی ہیں کہ اب خواہ کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آجائے تو اس کی طرف التفات کر کے نہ دیں گے۔

وَقَبَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا اَخْغَيْنَاهُمْ
 فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۰﴾

تفہیم القرآن ۷ تفہیم القرآن ۷

”بہن ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے، اور ایک دیوار ان کے پیچھے، ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے اب انہیں کچھ نہیں سوچنا۔“
ایک دیوار آگے اور ایک دیوار پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اس ہٹ دھرمی اور استکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے کوئی سبق لیتے ہیں اور نہ مستقبل کے نتائج پر کبھی غور کرتے ہیں، ان کے تعصبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ انہیں وہ کھلے کھلے حقائق بھی نظر نہیں آتے جو ہر سلیم بالطبع ہے تعصب انسان کو نظر آ رہے ہیں۔

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۰)

”ان کے لئے یکساں ہے، تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے۔“
اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حالت میں تبلیغ کرنا بے کار ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تبلیغ عام ہر طرح کے انسانوں تک پہنچتی رہے، ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں سے جب سابقہ پیش آئے اور تم دیکھ لو کہ وہ انگارہ استکبار اور مخالفت پر نکلے ہوئے ہیں تو ان کے پیچھے نہ پڑو، مگر ان کی اس روش سے دل شکستہ نہ ہو، یوں ہو کر اپنا کام چھوڑ بھی نہ بیٹھو، کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ اسی بہیم خالق کے درمیان وہ خدا کے بندے کہاں ہیں، جو فیضیت قبول کرنے والے اور خدا سے ڈر کر راہ راست پر آ جانے والے ہیں، تمہاری تبلیغ کا اصل مقصود اسی دوسری قسم کے انسانوں کو تلاش کرنا اور انہیں پھانٹ چھانٹ کر نکال لینا ہے، ہٹ دھرموں کو چھوڑتے جاؤ اور قیمتی منافع کو میٹھتے چلے جاؤ۔

ہٹ دھرم لوگوں کے اجتناب

ایسے بے ہودہ لوگوں سے مناظرہ سے منع کیا گیا ہے، جو وحی کے تلاشی نہیں بلکہ فتنہ بچھڑا رہے ہیں۔

وَإِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْنِ يَحْيَىٰ مَوْصُونَ فِي الْآيَاتِ فَأَعْرَضَ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۖ وَإِمَّا يُبْسِتُ لَكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ ۚ بَعْدَ الذِّكْرِ ۚ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۚ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذَكَرُوا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ (الدعاء: ۶۸-۶۹)

ترجمہ: اور اے محمد! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیال کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلا دے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو، ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پر ہیز کر لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے، شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدائی نافرمانی سے خود بخود کمر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے ادھر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے عقور انہیں قائل کر کے ہی چھوڑیں گے۔ اور ان کے ہر عقور و سہل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منہ کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنہیں گمراہی میں پھنسنے دیکھ رہے ہوں انہیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور جھگڑا باز رہیں تو

تفہیم القرآن ص ۱ سورہ - - - آیت - - -

اہل حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ داغی کشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے پھریں۔ ذالمت پسند لوگوں کے بجائے اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کو تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیے، جو خود طالب حق ہوں۔

دعوت براہ راست دی جائے | حکمت تبلیغ یہ ہے کہ مخالفین کی بے ہودگیوں کو قطعی نظر انداز کر کے جو بات کہنے کی ضرورت

کہی جائے۔ چنانچہ سورہ قحط السجدہ: کے نزول کے پس منظر میں جو واقعہ پیش آیا تھا اسے صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم سیرت نگار محمد بن اسحاق نے مشہور تالیسی محمد بن کبقر رضی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہ ایمان لائے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے اس موقع پر عقبہ بن ربیعہ (الوسیفان کے خسر) نے سرداران قریش سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند سچیزیں رکھوں۔ شاید کہ وہ ان سے کسی کھان لیں۔ اور ہم بھی اسے قبول کر لیں۔ اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں، سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ اور عقبہ اٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا، آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا بھتیجے، تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور ناندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معاذم ہے، مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آتے ہو۔ تم نے جماعت میں نفرت ڈال دیا ہے، تم نے ساری قوم کو بیوقوف قرار دیا ہے۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی بڑائی کرتے ہو اور ایسی باتیں کرنے لگے ہو جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کانہ تھے۔ اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ سچیزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں

ان پر غور کرو۔ شاید کہ تم ان میں سے کسی کو قبول کر لو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوالولید آپ کہیں میں سفوں گا۔ اس نے کہا، بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے، تو ہم سب تم کو مل کر اتنا کچھ دے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سے سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنالیتے ہیں، اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء ملواتے ہیں۔ اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔“ عقبہ یہ باتیں سن کر تارنا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا، ابوالولید آپ کو جو کہنا تھا کہہ چکے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا اچھا، اب میری سسر، اس کے بعد آپ نے سیدہ ام کلثومؓ پر ہاتھ پڑھ کر سورہ السجدہ کی تلاوت شروع کی اور عقبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر رکھ کر غصہ سے سن کر تارنا۔ آیت سجدہ (۲۸) پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا۔ ”اے ابوالولید، میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

عقبہ کی اس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اس میں ان بے ہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا۔ جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں، اس لئے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپؐ کی عقل پر حملہ تھا۔ اس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مقصد نہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کی نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہر حال کوئی امکان نہیں ہے۔ اب لامحالہ آپؐ کی دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر، معاذ اللہ آپؐ کی عقل میں فتور آ گیا ہے پہلی صورت میں وہ آپؐ سے سوردے بازی کرنا چاہتا تھا۔ اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپؐ کی دیوانگی کا علاج کراتے

دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس طرح کی پیہر و گیوں پر جب فالین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کو چراب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ان کو قطعی نظر انداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو رہے۔

چنانچہ اس سورہ میں یہی طرز اختیار کیا گیا ہے، عقبہ کی باتوں سے صرف نظر کر کے اس سورہ میں اس ثالث کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جو قرآن مجید کی دعوت کو روک دینے کے لئے کنارہ مکہ کی طرف سے اس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بداخیلائی کے ساتھ کی رہی تھی۔

دعوت کی مزاحمت پر داعی تنگ دل نہ ہو | اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يَكُفِّرُ بَعْضٌ مِّنْ بَعْضٍ وَرَفِ
رَحْمَتِهِمْ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَمَّا كَانُوا مِنْ دُونِ وَلَا تَصِيرُ (الشوری: ۸)

”اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔“
اس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم اور تسلی دینا ہے، اس میں حضور کو یہ بات سمجھانی گئی ہے کہ آپ کفار مکہ کی جہالت و ضلالت اور اوپر سے ان کی خدا و مرہٹ دھرمی کو دیکھ دیکھ کر اس قدر نہ کڑھیں، اللہ کی مرضی یہی ہے کہ انسانوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہدایت چاہے اسے ہدایت ملے اور جو گمراہ ہونا پسند کرے، اسے گمراہ ہونے دیا جائے، جھوٹ جانا چاہتا ہے جائے، اگر یہ اللہ کی مصلحت نہ ہوتی تو انبیاء اور کتابیں بھیجے کی حاجت ہی کیا ہوتی، اس کے لئے تو اللہ جل شانہ کا ایک تخلیقی انشاء کافی تھا، سارے انسان اسی طرح مبیع زمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی، پتھر اور سب حیوانات ہیں، یہ مضمون دوسرے مقامات پر بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے

سورہ الشوری: آیت ۸۔ تفہیم القرآن

سورہ الانعام۔ آیت ۳۵۔

وَإِنْ كَانَ كِبَرَ عَلَيْكَ إِعْزَاذُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا
فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ مِنْ أَنْوَاعِ مَا اللَّهُ جَمَعَهُمْ
عَلَى الْهُدَىٰ خَلَائِفُكَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

”پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس کی خبریں تمہیں پہنچ چکی ہیں تاہم
اگر ان لوگوں کی بے رحمی تم سے برواشت نہیں ہوئی تو اگر تم میں کچھ زور
ہے تو زمین میں کوئی سرنگ و صوف و یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور
ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو، اگر اللہ چاہتا تو ان سب
کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہذا نادان مت بنو۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدینہ
گذر گئی ہیں اور کسی طرح یہ درستی پر نہیں آتی تو لمبا اوقات آپ کے دل میں یہ
خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جاتی
جس سے ان کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کریں۔ آپ کی اسی
خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری
سے کام نہ لو، جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدبیر سے ہم اس کام کو چلو
رہے ہیں۔ اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو ہم
خود نہ لے سکتے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس
مدنیتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر ہم مامور کئے گئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک
پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جہاد اور ان کے انکار
کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جہاد کو توڑنے کے لئے
کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرنا ہی ضروری ہے تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلتا
ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو

تفسیر القرآن - الانعام ۳۵ آیت

کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لئے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے۔ کیونکہ ہماری سکیم میں اس تدبیر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ہمیں اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رو بن جائیں تو بنی بھیجئے اور کتا ہیں نازل کئے اور مومنوں سے کفار کے مقابلے میں جدوجہد کرنے اور دعوت حق کی تدریجی تحریک کی منزلت گذر جانے کی حاجت ہی کیا ہوتی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارہ سے انجام پاسکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرتا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے پھر ان میں سے جو لوگ فکر سے کام لے کر حق کو پہچان لیں کہ وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ میں سے صالح عناصر کو اپنے خالق و رازق و مددگار، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اصول زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پہم جدوجہد کر کے فکری ارتقا کی راہ سے اقامت دین حق کی منزل تک پہنچیں، اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق پائیں گے وہ مدد بھی انہیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدنِ فاسدہ کو نیست و نابود کر کے مدنیتِ صالح کی تعمیر کروے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اسے تفرقات کے اختیارات دیئے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لئے فیصلہ کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ اس تدریجی عمل کی پابندی قانونِ خدا کی ہے۔ اس سلسلے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ طَعْلُ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَئِنْ كُنْتُمْ لَهُمْ لَآيَعْلَمُونَ ۝ (الانعام: ۳۷)

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ کہو، اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔“

نشانی سے مراد عسرس معجزہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اسکو دکھانے سے عاجز ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے نہیں سمجھتے۔

چنانچہ آیت ۱۰۷ سورہ الانعام میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

وَأَعِزُّوا لِلْمُشْرِكِينَ ۝ وَكُوشِدَاءَ اللَّهِ مَا اشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا ۝ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ (الانعام: ۱۰۶-۱۰۷)

”اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی منیبت ہو تو (وہ خود ایسا بندہ دلت کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کہہ مے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے کہ تو انہیں بنایا گیا تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی جان تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر اس حق کو کوئی قبول نہیں کرتا تو نہ کرے، تم کو اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری وہاں ہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقہ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے، لہذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔ کراںدھوں کو کس طرح بیٹا بنایا جائے۔ اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص

تفہیم القرآن تفہیم القرآن

باطل پرست نہ رہ جائے۔ چنانچہ اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔ کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے۔ اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے۔ تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی نیکو شاگرد تمام انسانوں کا حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے۔ کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے۔ اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے۔ کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لئے صحیح طرز عمل یہ ہے۔ کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اس کے اُجائے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو، جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں۔ انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں۔ ان کے پیچھے نہ پڑو جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں۔ اس کی طرف جانے کے لئے انہیں چھوڑ دو۔

اصلاح کی سست رفتاری پر مایوسی سے اجتناب

یہ بھی ہدایت دی گئی ہے۔ کہ داعی کو اصلاح کی سست رفتاری پر مایوسی نہیں ہونا چاہیئے۔ اور نہ اصلاح کے لئے بے جا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ فرمایا۔

ولو شاء الله لجمعهم امته واحدًا ولكن يدخل من يشاء في رحمتهم والظالمون ما لهم من شيء ولا نصير
اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی دلی ہے نہ مددگار اس آیت کا ایک مقصد تو وہ تھا جو عنوان بالا میں بیان ہوا۔ دوسرا مقصد اہل ایمان کو ان مشکلات کی حقیقت سمجھانا ہے جو تبلیغ دین اور اصلاح خلق کی راہ میں اکثر پیش آتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی آزادی کا انتخاب دارادہ اور اس کی بناء پر طبائع اور طریقوں کے اختلاف کی حقیقت کو نہیں

سمجھتے وہ کبھی تو کارِ اصلاح کی سست رفتار ہی کو دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کرامتیں اور معجزات رونما ہوں تاکہ انہیں دیکھتے ہی لوگوں کے دل بدل جائیں اور کبھی وہ ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لے کر اصلاح کے بے جا طریقے اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں کرامتوں اور معجزات کا جو آیت سورہ الرعد آیت ۳۱ میں اس طرح دیا گیا ہے۔ **وَلَوْ أَنَّ قُلُوبَنَا سَوَّيْتُمْ فِي الْجِبَالِ لَدُقُّطَعَتْ فِي الْأَرْضِ أَوْ لَكَلَّمَكُم بِمُؤْتَقِنٍ** اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شل ہو جاتی یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟

اس آیت مبارکہ کو سمجھنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی لازمی ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے مسلمان جب کفار کی طرف سے بار بار نشانیاں کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو کوئی نشانی دکھائی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی ادبی نشانیاں دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں دل سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبول حق کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں کائنات کے آثار میں، بنی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابہ اکرام کے انقلاب حیات میں، نور حق نظر نہ آیا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پالیں گے؟

بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے بلکہ سارا اللہ کے اختیار ہی کے ہاتھ میں ہے۔)

یعنی نشانیوں کے نہ دکھانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دکھانے

ہر قدر نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان طریقوں سے کام لینا اللہ کی مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اصل مقصود تو ہدایت ہے نہ کہ ایک بنی کی نبوت کو منوالینا اور ہدایت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کی فکر و بصیرت کی اصلاح ہو۔ اَفَلَمْ يَأْتِ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ آيَاتُ ۚ اِنَّ كُوَيْلَكُمْ لَآلَهُ ۚ لَقَدْ كَذَّبَ النَّاسُ بِحَبِيۡبٍ ۚ پھر کیا اہل ایمان را بھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی دشمنی کے ظہور کی آس نکلتے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر یا یوس نہیں ہوں گے کہ اللہ اگر چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟
یعنی اگر سمجھ بوجھ کے بغیر محض ایک غیر شعوری ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لئے نشانیاں دکھانے کے تکلف کی کیا حاجت تھی یہ کام تو اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ سارے انسانوں کو مومن ہی پیدا کر دیتا۔

غیر اخلاقی طریقوں کی ممانعت | اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورہ النحل آیت ۹۰ میں تین چیزوں کا حکم دیا ہے اور ان کے مقابلے میں تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِتْيَانِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۖ اللہ عدل اور احسان اور اقرباء اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو جو چیزیں منع کی ہیں ان میں آخری اور تیسری البغی یعنی ظلم و زیادتی ہے۔ البغی کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا۔ خواہ وہ حقوق خانی کے ہوں یا مخلوق کے۔

اور آیت نمبر ۹۱ میں علی الترتیب تین قسم کے معاہدوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے
اور آیت نمبر ۹۲ میں عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر موجب فساد ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ عُزْلَهُمَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةِ الْكَاثِبِ ط تَتَّخِذُوا
 أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونُوا أُمَّةً مَعَ رُبِّي مِنْ أَمْنٍ ط إِنَّمَا يَبْهَتُكُمْ
 اللَّهُ بِهِ ط

”تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت
 کاٹا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مگر
 فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے حالانکہ
 اللہ اس عہد پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

یہاں خصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو
 دنیا میں سب سے بڑھ کر موجب فساد ہے اور جسے بڑے بڑے اور بچے درجے کے لوگ
 بھی کار ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داؤ پلتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں کی سیاسی
 معاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کا لیڈر ایک وقت
 میں دوسری قوم سے معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد
 کی خاطر یا تو اسے علانیہ توڑ دیتا ہے یا دیر پر وہ اس کی خلاف ورزی کر کے ناجائز
 فائدہ اٹھاتا ہے یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ تک کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں
 بڑے راست باز ہوتے ہیں، ان حرکتوں پر صرف یہی نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے
 ملامت کی کوئی آواز نہیں اٹھتی، بلکہ ہر طرف سے ان کی بیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس
 طرح کی چال بازیوں کو ڈپلومی کا کمال سمجھا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر متنبہ فرماتا ہے
 کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرتے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش
 ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوں گے وہ اللہ کی عدالت میں مواخذہ
 سے نہ بچ سکیں گے۔

” (۹۲) اور ضرور

وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔“
 یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمہارے درمیان

مٹش برپا ہے ان میں بر سر حق کون ہے اور بر سر باطل کون۔ لیکن بہر حال خواہ کوئی مرام حق پر
 ہی کیوں نہ ہو اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے یہ کسی طرح
 جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکر و
 فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان
 میں ناکام ثابت ہو گا، کیونکہ حق پرستی صرف نظریہ اور عقیدے ہی میں صداقت کا مطالبہ
 نہیں کرتی، طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے یہ بات خصوصیت کے
 ساتھ ان مذہبی گروہوں کی بنیہ کے لئے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے
 ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا فریق مقابل مذہبی باغی ہے اس لئے ہمیں حق پہنچنا ہے
 کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو رک پہنچائیں ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے
 باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور دنا و عہد کا لحاظ رکھیں ٹھیک یہی
 بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ شکر کن عرب
 کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے ان کے ہر طرح کی حیانت کی جاسکتی ہے جس
 چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو رک پہنچے وہ بالکل روا ہے
 اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً، اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی
 کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو، تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔
 یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ
 کا طرفدار سمجھ کر بھلے اور بڑے ہر طریقے سے اپنے مذہب کو دے وہ خدائی مذہب سمجھ
 رہا ہے افروغ دینے..... اور دوسرے مذاہب کو مشابہت کی کوشش کرتا ہے
 تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا
 کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا احتیاج چھین لیا جائے اور چاروں اچار سارے انسانوں کو
 ایک ہی مذہب کے پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لئے اللہ کو اپنے نام نہاد طرف
 وارد کے ذلیل ٹکھنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی

تخلیقی طاقت سے کہہ سکتا تھا وہ سب کو مومن و مرمان پرور پیدا کر دیتا کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے ہال برابر بھی جنبش کر سکتا؟ وَلَٰكِنْ يُفْضِلُ مَنْ يَشَاءُ دَرَكَيْهِ مَنْ يَشَاءُ ط مگر وہ جسے چاہتا ہے گرا ہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔

یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے۔ اس لئے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں کوئی گرا ہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لئے گرا ہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے اور کوئی راہ راست کا طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرماتا ہے۔

وَكُلُّكُمْ لَنَا عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۶) اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمہاری بد اخلاقی و کجیہ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اس ایمان کے گردہ میں شامل ہونے سے رک جائے کہ اس گردہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ایمان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔ وَلَا تَتَّخِذُوا اٰیْمَانَكُمْ دَعْوَا نَبِيِّكُمْ فَتَذِلَّ قَدَمُكُمْ بَعْدَ نُبُوَّتِهِمْ وَتَقُو السُّوْبَا حَدَّ دَنَمٍ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱) اے مسلمانوں، تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنالینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جھنے کے بعد اکھڑ جائے اور اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے اس کا برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔

فَلْيَذِلَّ قَدَمُ جَدِّ وَاسْتَقِمَّ كَمَا اُمرِتَ ؕ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۡءَهُمْ ؕ حِجْرُ السُّوْرٰٓۙ چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لئے اے محمد، اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو۔

یعنی ان کو راضی کرنے کے لئے اس دین کے اندر کوئی روئ بدل کار راستہ نہ نکالو کہ وہ

سمش برپا ہے ان میں برسر حق کون ہے اور برسر باطل کون۔ لیکن بہر حال خواہ کوئی سرا سر حق پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے یہ کیسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکرو فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام نہایت ہوگا، کیونکہ حق پرستی صرف نظریے اور عقیدے ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی، طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے یہ بات خصوصیت کے ساتھ ان مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لئے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا ذریعہ مقابلہ خدائی باغی ہے اس لئے ہمیں حق پہنچنا ہے کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو رک پہنچائیں ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفا و عہد کا لحاظ رکھیں ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ ہر کس کوئی بات کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے ان کے سرطرح کی خیانت کی جاسکتی ہے جس خیال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو رک پہنچے وہ بالکل روا ہے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۚ أَلَا تَعْلَمُونَ ۚ
 کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو، تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔
 یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرفدار سمجھ کر بھلے اور بڑے ہر طریقے سے اپنے مذہب کو دجے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے افزودہ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت سرا سر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا اختیار چھین لیا جائے اور چاروں اچارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کے پیر بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لئے اللہ کو اپنے نام نہاد طرفداروں کے ذلیل ٹھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی

تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا وہ سب کو مومن و فرمان بردار پیدا کر دیتا کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟ **وَالَّذِينَ يُضِلُّونَ عَنْ لِسَانِكَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ سَبِيلِكُمْ فَاصْبِرُوا لِمَا نَزَّلْنَا بِهَذَا الْقُرْآنِ فَاعْلَمُوا أَنَّ سَبِيلَنَا مُبْتَلًى وَلَكِنَّا جَاهِلُونَ مَا فِي الْأَفْئَادِ**۔

یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے۔ اس لئے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لئے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے اور کوئی راہ راست کا طالب ہو رہا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ سَخَّرْنَاكُمْ آلَ فِرْعَوْنَ وَمَعَارِبَهُمْ وَلَمَّا كُنْتُمْ عَلَيْهِمْ طُوفًا تُدْرِكُونَ يَوْمَ تَوَلَّوْا أَثَرَهُمْ طَبَعًا ذَا قُرْءَانٍ يُرْوَاهُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ يَوْمَ تَمُوتُ كُلُّ شَيْءٍ قَدْ أَفْجَىٰ ۚ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ عَنِ السَّاعَةِ لَوَسَّاسٌ عُتْبَىٰ ۚ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ عَنِ السَّاعَةِ لَوَسَّاسٌ عُتْبَىٰ ۚ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ عَنِ السَّاعَةِ لَوَسَّاسٌ عُتْبَىٰ ۚ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ عَنِ السَّاعَةِ لَوَسَّاسٌ عُتْبَىٰ ۚ۔
 دیکھ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گردہ میں شامل ہونے سے رک جائے کہ اس گردہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہوا ان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔ **وَلَا تَسْتَحْذِرُوا أَنِي مَذْمُومٌ ۖ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ عَنِ السَّاعَةِ لَوَسَّاسٌ عُتْبَىٰ ۚ**۔
 عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَلَكِنَّ عَذَابَ عَظِيمٍ (اے مسلمانوں، تم اپنی قوموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنالینا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جھینے کے بعد اکٹھا جائے اور اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے اس کا برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَبِقُوا كُنَّ الْأَمْرُتِ ۚ وَلَا تَتَّبِعِ أَهْوَاءَ هُمْ جِ وَالسَّوْءِ ۚ۔
 چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لئے اے محمدؐ، اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو۔

یعنی ان کو راضی کرنے کے لئے اس دین کے اندر کوئی رد بدل کا راستہ نہ نکالو کہ وہ

اسلام میں آجائیں، جس کو ماننا ہے، خدا کے اعلیٰ اور خالص دین کو جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جس جہنم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے۔ خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

داعی حق ہر عصیّت سے پاک

داعی حق کو ہر قسم کی عصیّت سے پاک ہونا چاہیے نہ خود کسی نوعیت کی عصیّت یا تفرقہ بازی میں مبتلا ہو اور نہ دوسروں کو مبتلا ہونے دے۔ فرمایا گیا۔ وَتَقُولُ اٰمَنْتُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا مِنْ كِتَابِ رَبِّنَا وَلَٰكِنْ اِنَّمَا نَحْنُ بِعَبْرِ الْوَادِیْ اِذَا عَلِمْنَا مَقَالَتَ الْغُتَّارِ اور ان سے کہہ دو کہ ”اے اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔ میں ان تفرقہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اس کتاب کو ماننا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔“

اس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں متعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا متعلق، جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھ حق ہوں خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرے قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمہارا سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے، اس میں پسے یا غیر، بڑے اور چھوٹے عزیز اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں ہیں، بلکہ جو حق ہے وہ سب کے لیے حق ہے جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے اور جو جرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں ہے۔

ضدِ مخاطب سے عدم التفات

جیسا کہ تسلیح کے زبرد اگر خواہ سب اپنی بات پر پختہ ہو تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے گا
 ذَرُّهُمْ يَخُوشُوا وَيُلَاعِبُونَ اَخْتًا يَلْتَمِسُ اِيَّاهُمْ الَّذِي يُمْسِكُهُمْ (النون) ۸۲

”اچھا تو کچھ راہیں اپنے اہل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں
 تک کہ یہ اپنا دھون دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔ اس کے لئے کہ آخر اللہ کی
 فرمان برداری کے سوال پر جھگڑا کرنے سے کیا حاصل ہے فرمایا۔ قَدْ اَتَّخَذْتُمْ اِلٰهًا دَهْوًا
 رَبَّنَا وَمَا كُنَّا مِنْهُمْ لَبِئْسَ مَا يَكُونُ لَكُمْ اَعْيُنٌ يَّرْءَوْكُمْ (البقرہ ۱۲۶) اے نبی ان سے کہہ دیا کہ تم اللہ کے بارے میں ہم سے
 جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے۔“

یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی تم سب کا رب ہے۔ اور اسی کی فرماں برداری ہونی
 چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے
 بھی، تو وہ ہمارے لئے ہے۔ نہ کہ تمہارے لئے، کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو بندگی کا مستحق تم
 ٹھہرا رہے ہو۔ نہ کہ ہم اِتَّخَذْتُمْ اِلٰهًا دَهْوًا ”اللہ“ کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا تمہارا
 یہ جھگڑا نفسانی نہیں ہے۔ بلکہ خدا واسطے کا ہے۔ تو یہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔“

وَلَنَّاخَذَنَّ اَعْيُنَنَا مِنَ الْاَعْمٰرِ وَخَنَّا لَكُمْ مُتَعَلِّصُونَ (البقرہ ۱۳۱) ”ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں۔ تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ کے لئے اپنی
 بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔“

گویا تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے نہ۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا
 ہے۔ اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی جدائی میں شریک ٹھہرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجالاتے
 ہو۔ تو تمہیں الیا کرنے کا اختیار ہے۔ اس کا انجام تم خود دیکھ لو گے۔ ہم تمہیں زبردستی نہیں چاہتے
 لیکن ہم اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ کے لئے خالص کر دیتے ہیں۔ اگر تم تسلیم کر لو کہ
 ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہی مضمون قرآن
 میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ فرمایا۔

داعی حق کو ہر قسم کی معصیت سے پاک ہونا چاہیے نہ خود کسی نوعیت کی معصیت یا تقویٰ بازاری میں مبتلا ہو اور نہ دوسروں کو مبتلا ہونے دے۔ فرمایا گیا۔ وَحَقُّ اٰمَنَةٍ بِمَا اَنْزَلَ اَللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَّ اٰمَرَتْ اِلٰعِدْلَیْ بَيْنَكُمْ۔ اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔ میں ان تقویٰ پر دواز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔

اس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے لگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں۔ میرا سب انساؤں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق، جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا سامتی ہوں خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرے قریب ترین رشتہ داری کیوں نہ ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمہارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے، اس میں اپنے یا غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں ہیں، بلکہ جو حق ہے وہ سب کے لیے حق ہے جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے اور جو جرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں ہے۔

فندی مخاطب سے عدم التفات

جیسا کہ تبلیغ کے زبرد اگر نہ اندیشہ اپنی بات پر یقین نہ تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔
 ذَذَرْنَاهُمْ يَتْلُو صُورًا وَيُلَاحِظُ مِثْلَهُ لَا يُفِيهِمْ إِلَّا غَيْرُ الْحَقِّ يَوْمَ تَفُوتُونَ (الزمر) ۵۳

”اچھا اگر کچھ انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنا ادھ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔ اس کے لئے کہ آخر اللہ کی فرمان برداری کے سوال پر جھگڑا کرتے سے کیا حاصل ہے فرمایا۔ قَدْ اخْتَارْتُمْ بَيْنَنَا وَاللَّهِ وَهَوَّ زَيْنًا وَرَجِبْتُمْ كَاهِنًا۔ البقرة ۱۲۶۔ اے نبی ان سے کہہ دیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے۔“

یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے۔ اور اسی کی فرمان برداری ہوتی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے بھی، تو وہ ہمارے لئے ہے۔ نہ کہ تمہارے لئے کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو بندگی کا مستحق قسم ٹھہرا ہے ہو۔ نہ کہ ہم امتدادِ حق فی اللہ کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا تمہارا یہ جھگڑا انسانی نہیں ہے، بلکہ خدا واسطے کا ہے۔ تو یہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔“

وَلَنَّا آتَيْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَكُنَّا نَعْلَمُ كَيْفَ تَخْلُصُونَ (البقرہ) ۱۲۹
 ”ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں۔ تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ ہی کے لئے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔“

گویا تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی جدائی میں شریک ٹھہرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو۔ تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ اس کا انجام تم خود دیکھ لو گے۔ ہم تمہیں زبردستی نہیں چاہتے لیکن ہم اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ کے لئے خالص کر دیتے ہیں۔ اگر تم تسلیم کر لو کہ ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہی مضمون قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ فرمایا۔

اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاۤهُ قُلْ لَنْ اَفْتَرِيْكَ فَعَلَى الْاَبْلَاحِ وَاَنَا بِسَيِّئِ مَا يَفْعَلُونَ ۝۳۵
 ۱۔ اے محمد یہ کیا لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہہ اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے۔ تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے۔ اور جو جرم تم کر رہے ہو۔ اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔ انذار بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوح کا یہ قصہ سننے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوگا۔ کہ محمد یہ قصے بنا بنا کر اس لئے پیش کرتا ہے۔ کہ انہیں ہم پر چسپاں کر دے۔ بڑے دشمن ہم پر براہ راست نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے لئے ایک قصہ گھڑتا ہے۔ اور اس طرح ”در حدیث دیگران“ کے اندر میں ہم پر چوڑا کرتا ہے۔ لہذا اس کا نام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے بڑے پتلور کی طرف جاکر رہتا ہے۔ اور اچھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پتلور پر ان کی نظر جاسکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے۔ یا وہ تمہیں کوئی سفید سبق دے رہا ہے۔ یا تمہاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے۔ تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو۔ مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں برائی کا کوئی ایسا پتلور تلاش کرے گا۔ جس سے حکمت اور نصیحت پر پانی پھیر دے اور نہ صرف خود اپنی برائی پر قائم رہے۔ بلکہ سائل کے ذمے بھی لٹے کچھ برائی لگا دے۔ بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جاسکتی ہے۔ اگر سننے والا اسے خبر خواہی کے بجائے چوڑے کے معنی میں لے لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس و ادراک کے بجائے بُرائی ماننے کی طرف چل پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی ٹکر کی بنا پر ایک بنیاد پر گمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقت واقعی ہونے اور ایک بناوٹی داستان ہونے کا یکساں امکان ہو مگر وہ ٹھیک ٹھیک تمہارے حال پر چسپاں ہو رہا ہو۔ اور اس میں تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی ہوتی ہو۔ تو تم ایک دانش مند آدمی ہو گے۔ اگر اسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اور محض ایک بدگمان و کج نظر آدمی ہو گے۔ اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگا دو گے کہ قاتل نے محض ہم پر چسپاں کرنے کے لئے یہ قصہ تعریف کر لیا ہے اسی بنا پر فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے۔ تو اپنے جرم کا میں ذمہ دار ہوں۔ لیکن جس جرم کا تم ازکاب کر رہے ہو وہ اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

وَإِذَا سَأَلَ عَنْ عَمَلٍ فَعَرِّضْ قَوْلَهُ وَقَالُوا إِنَّا لَنَاصِحَاتُكُمْ وَأَكْثَرُ سَأَلَكُمْ عَنْ عَمَلِكُمْ لَا تَتَّبِعُوا
الْجَاهِلِينَ (۵۵) النقص

اور جب انہوں نے بے پردہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں۔ اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں، تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔

اس آیت میں اس بیہودہ بات کی طرف اشارہ ہے۔ جو ابو جہل کے اور اس کے ساتھیوں نے جنتی عیسائیوں کے اس وفد سے کی تھی۔ جس کا ذکر ابن ہشام اور ہبشہ وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرت جدتہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے میس کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیق حال کے لئے مکہ معظمہ آیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے، وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کئے۔ جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن میں ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور انہوں نے اس کے کلام اللہؐ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے جب مجلس برخواست ہوئی۔ تو ابو جہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جالیا۔ اور انہیں سخت ملامت کی کہ ”یڑے نامراد ہو تم لوگ“ تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس میٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گردہ کو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا، اس پر انہوں نے جواب دیا کہ وہ سلام ہے۔ بھائی تم کہہ تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں کر سکتے۔“

اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَيْنَاهُ قُلْ اِنْ اَنْتُمْ لَافْتَرَيْنَ لَهُمْ قَوْلًا مَّا يَكْفُرُونَ ۳۵
 ۳۵۔ اے کفار کیا لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہہ اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے۔ تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے۔ اور جو جرم تم کو رہے ہو۔ اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔ انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوح کا یہ قصہ سننے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوگا۔ کہ محمد یہ قصے بنا بنا کر اس لئے پیش کرتا ہے۔ کہ انہیں ہم پر چسپاں کرے۔ جو چسپاں وہ ہم پر براہ راست نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے لئے ایک قصہ گھڑتا ہے۔ اور اس طرح ”در حدیث دیگران“ کے اندر میں ہم پر چوٹ کرتا ہے۔ لہذا اس سلسلہ کلام کو ٹوک کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے برے پہلو کی طرف جاتا کرتا ہے۔ اور اچھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پہلو پر ان کی نظر جاسکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے۔ یا وہ تمہیں کوئی مفید سبق دے رہا ہے۔ یا تمہاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے۔ تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو۔ مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں برائی کا کوئی ایسا پہلو تلاش کرے گا۔ جس سے حکمت اور نصیحت پر بانی بھیسر دے اور صرف خود اپنی برائی پر قائم رہے۔ بلکہ سائل کے ذمے بھی لٹے کچھ برائی لگا دے۔ بہتر سے بہتر نصیحت بھی منالغ کی جاسکتی ہے۔ اگر سننے والا اسے خبر خواہی کے بجائے چوٹ کے معنی میں لے لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس و اور دک کے بجائے بُرائی کے طرف چلا پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی ٹکر بنا پر ایک بنیاد بدگمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقت واقعی ہونے اور ایک بناوٹی داستان ہونے کا یکساں امکان ہو مگر وہ ٹھیک ٹھیک تمہارے حال پر چسپاں ہو رہا ہو۔ اور اس میں تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی ہوتی ہو۔ تو تم ایک دانش مند آدمی ہو گے۔ اگر اسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اور محض ایک بدگمان و کج نظر آدمی ہو گے۔ اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگا دو گے۔ کہ فائل نے محض ہم پر چسپاں کرنے کے لئے یہ قصہ تعریف کر لیا ہے اسی بنا پر فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے۔ تو اپنے جرم کا میں ذمہ دار ہوں۔ لیکن جس جرم کا تم اور تکاب کر رہے ہو وہ اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي أَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَعْبُدُوا لِمَا خَلَقْتُ بِإِسْمِ اللَّهِ إِنِّي زَاكِيٌّ وَسَدِيقٌ
الْجَلِيلِيُّ (۵۵) القصص

”اور جب انہوں نے بے ہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال بڑے
لئے ہیں۔ اور تمہارے اعمال تمہارے لئے تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں
چاہتے۔“

اس آیت میں اس بے ہودہ بات کی طرف اشارہ ہے۔ جو ابوجہل کے اور اس کے
ساتھیوں نے جتنی عیسائیوں کے اس وفد سے کی تھی جس کا ذکر ابن ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن
اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ کہ ہجرت حبشہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی
بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے بیس کے قریب عیسائیوں
کا ایک وفد تحقیق حال کے لئے مکہ معظمہ آیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملاقات
بہت سے لوگ یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے، وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات
کئے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی
آیات ان کے سامنے پیش کیں۔ قرآن میں ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور انہوں نے
اس کے کلام اللہؐ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی۔ تو
ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جالیا۔ اور انہیں سخت ملامت کی
کہ ”بڑے نامراد ہو تم لوگ“ تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس شخص
کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس میٹھے بیٹھے
کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گردہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا،
اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”سلام ہے۔ بھائی تم کہہ تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر
سکتے ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر
بھلائی سے محروم نہیں کر سکتے۔“

جو دلائل دیئے انکا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ نکات حسب ذیل تھے ان میں پہلا امر
 زبان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی، یہ بتانی کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر
 جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ایک
 انسان تھا جس کو اللہ نے دینی مصلحتوں کے تحت منصبِ نبوت پر فائز کیا اور اسے
 ایسے مجرّمے عطا کیے جو نبوت کی مرتبہ علامت ہوں۔ اور منکرین حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے
 دیا بلکہ اس کو اپنے پاس اٹھا لیا، مالک کو اختیار ہے کہ اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے
 استعمال کرے بعض اس غیر معمولی بناؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک
 تھا یا مالک کا بیٹا تھا۔ یا ملکیت میں اس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو بھائی گئی۔ وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے
 آئے تھے۔ وہ وہی چیز تھی جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں دونوں
 کے مشن میں یکساں فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام
 تھا۔ جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی۔ جو مسیح علیہ السلام نے
 دی تھی۔ اور نہ اس مذہب کی پیروی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

لہذا اب اس علم کے بعد بھی اگر وفد بخران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے تو پھر
 ان کے لئے حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے یہ صورت پیش کریں جس سے مقصود
 یہ ہے کہ جو حق نکات ان کے سامنے پیش کئے گئے۔ ان میں سے کسی کا جواب بھی ان کے پاس موجود
 نہ تھا۔ سمیت کے عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسیہ کی ایسی سند نہ پاتے
 تھے۔ جس کی بناء پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے۔ کہ ان کا عقیدہ امرِ اقدس کے عین مطابق
 ہے۔ اور حقیقت اس کے خلاف ہو کر نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ
 کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو
 گئے تھے۔ یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں
 ایسے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے۔ تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو۔ اس پر

فدا کی لعنت ہو۔ تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ بخرازی مسیحیت کے پیشرو اور پادری جن کے تقدس کا سکیم دور دور تک رواں ہے۔
 دراصل ایسے عقاید کا اتباع کر رہے ہیں۔ جن کی صداقت پر خود انہیں بھی کمال اعتماد نہیں ہے۔

اہل کتاب اور عقیدہ توحید

فرمایا گیا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَقُصِبَ
 إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ
 فَإِنْ تَوَلَّوْا فَمَوْلَاكُمْ شَرٌّ ذِلَّةً إِيَّاكُمْ مُسْلِمُونَ۔ ۴۳۔ آل عمران ۱۔

”۔ کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں
 ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں
 سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔“

یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کرو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ اور جس
 کے مروج ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے تمہاری
 اپنی کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

تبلیغ میں قول یلین کی اہمیت :-

فرمایا گیا۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۶۳۔ (النساء)

یعنی ان سے تعرض مت کرو، انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو۔ جو ان کے دلوں میں
 اتر جائے یہ منافقین کے طرز عمل کے ذکر کے بعد فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بگڑے ہوئے
 مسلمانوں کی اصلاح کس طرح کی جائے یا نہیں سرزنش کرنے کے بجائے موثر طریقہ سے بات کرنا
 سکھایا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں کو گرویدہ بنانا اور ایسے دل نشین طریقہ سے بات کرنا مقصود
 ہے۔ کہ بجائے اس کے وہ ڈر اور خوف اور شرمندگی و خواریت سے دور بھاگیں، وہ اپنی اصلاح
 کی فکر کریں۔

دعوت دین بذریعہ مکاتیب :-

یہ بھی ایک طریق دعوت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو بذریعہ خطوط دعوت دی۔ اور اسلام کی تعلیم دی۔ دعوت کے لئے جس طرح مخاطب، مذاکرے اور گفتگو سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح نشر و اشاعت اور خطوط کے ذریعہ سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ جب صلح حدیبیہ کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوت کو وسیع کرنے کے لئے پہلی دفعہ مہلت ملی، ملک کے اندر امن میسر آیا۔ اور ایسے حالات میسر آئے کہ گرو و پیش میں اسلام کی دعوت پھیلائی جائے۔ تو اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، روم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور مختلف قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لئے پھیل گئے۔

دین حق کی تبلیغ قریضہ منصبی

دین حق کی تبلیغ پیشہ وارانہ کام نہیں ہے۔ فرمایا۔

ثَلَاثَ لَا أَشْتَكُكُمْ عَلَيْهِ أَحْسَنُ مَا رَأَيْتُ هُمْ رَاكِعًا وَكَثُرَى لِلْعُلَمَاءِ (۹۰۔ الانعام)

۱۔ اور کہہ دو کہ میں اس تبلیغ و ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے۔ تمام دنیا والوں کے لئے۔

یعنی قرآن تو ایک سراسر ذکر ہے۔ اور دنیا کے ہر فرد کے لئے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر آدمی آگے بڑھ بڑھ کر اسے حاصل کرے۔ یہ ایک سراسر نصیحت اور خیر خواہی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت تبلیغ کو بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ اور جن پر تبلیغ کا کام کیا جائے۔ ان کو بھی اسی جذبہ کے تحت اس کا استقبال کرنا چاہیئے۔

فردعات سے پہلے اصول پر زور | ہماری دعوت کا اصول اَلَا قَدَمٌ قَالَا قَدَمٌ ہونا چاہیے
جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی توجہ

کرنا چاہیے۔ اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیے۔ اس طرح جس چیز کی دینی اہمیت جتنی کم ہے اس پر اسی قدر کم توجہ دی جانی چاہیے۔ اور اس کی قدر، قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ زمین نشین کر لیجیے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جدا جدا زور دینے کے بجائے اس اصل اصول کی فکر کرنی چاہیے جس کی اصلاح سے فردوع کو اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل کر گر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روکنے کے لئے ایک ایک تدبیر اختیار نہیں کی جائیگی۔ بلکہ براہ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی فکر کی جائے گی۔ یا مثلاً کسی شخص کا خون خراب ہو۔ اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوٹے پھنسیاں نمودار ہو رہے ہوں۔ تو ایک ایک پھوٹے پر نشتر چلانا اور ایک ایک نامشور پر پھیانہ رکھنے کی جگہ اصلاح خون کی تدبیر کی جائے گی۔ اس اصول پر ہمارے مبلغین کو مقامی حالات پر غور کیے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا؟ اور پھر ہر ضرب اسی علت کو دودھ کرنے کے لئے لگائی جانی چاہیے۔ اس کام کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے۔ اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے، ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیے۔ یہ جڑ اگر قائم ہو گئی، تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے۔

جماعت کا پورا طریقہ کار اسی اصول پر رکھا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی امور پر اصول کے استحکام کے لئے پورا زور استدلال صرف کیا گیا ہے۔ مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاخوں کی کٹی چھٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قہر جیات کے مشتے ہوئے نقشہ زمینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں۔ بلکہ اس کی بنیادوں کی فکر کریں۔ ورنہ دیواروں کی خوبصورتی تو ترقی کر جائے گی۔ مگر اس کی تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت

کو کھنڈ رہتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے۔ تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھرتا ہے۔ اور پھر ہر شے اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلا یا جاتا ہے۔ آپ لوگ اب اس مذاق کی کسر بدل ڈالنے، بار بار کے تجربے سے معلوم ہوا ہے۔ کہ جزئیات پر عمل کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی دلدلیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اور اسی طرز پر کام کرنے سے خود بخود جذبات شعل ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے چبھنے والے انقلاب مثلاً ویائی اور بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں جتنی کہ سرسبز ٹھول ٹھک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریق پر تبلیغ کو دوسرے سے قطعاً اجتناب کیجئے۔

آپ حضرات غور کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو توحید نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے یا عقیدہ معاد کی واقفیت سے علاوہ ہر کچھ خرابیاں ایسی ہیں۔ جو اصول و فروع دین کی صحیح ترتیب کو الٹ دینے سے نمودار ہوتی ہیں۔ خود لگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں۔ اور وہ ہے کتاب سنت سے بے تعلق۔ یہ سب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا، بلکہ بکثرت علماء تک کتاب و سنت سے براہ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے۔ اب اگر ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے۔ تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہیے جب تک بنیادی منتقلا کی اصلاح نہیں ہو جاتی۔ لوگوں کو فروغ گمراہیوں کو صبر سے گوارا کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ فردعات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ مدعا یہ ہے۔ کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ ہرگز نہ زور دیا جائے۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔ کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے۔ جو شرارت اور خبیث کی بنیاد پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام بچارے محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوئے ہیں مدت ہائے دراز کی غلط تعلیم و تربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اتر گئی ہے۔ کہ جن طواغیط طریقوں کو وہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہی کا نام دین ہے۔ ان بے چاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ صبر و تحمل اور تدریج سے توحید، نبوت اور معاد کے اسلامی تصورات کو ان

کے جنوں میں رائج کیا جائے۔ ان کے عقائد کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف دہائی، دہائی پکار کر بھیڑ جمع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلاب عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوے کی صداقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے روک رکاوٹ کرنے والوں میں بالکل مختصر سا گروہ ایسا تھا۔ جو ذاتی اغراض کی بناء پر مخالفت کر رہا تھا۔ باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے۔ پھر جب تحریک پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آگیا۔ تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لئے انکار کے راستے سدود ہو گئے۔ ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اغراض کی بناء پر لڑ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ میدان میں ہم نہ مارہ گئے ہیں۔ اس لئے وہ سر جھکا دینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی دعوت حق کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔ اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عریاں کر دیں۔ تو ان میں سے نیک نیت و فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے اپنے کبراء کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آئیں گے۔ پھر جو لوگ غرض کی بناء پر سد راہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری چلتی ہوئی گاڑی ان کے روکے نہ رک سکے گی۔ یہ پروگرام اگر اختیار کرنا ہو تو پھر امین الجہرؒ اور ”تیجہ“ اور قتل کے جھگڑے ختم کیجیے، غور تو کیجیے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصب العین بس اتنا ہی کچھ تھا؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ ان مہمات امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی۔ جن کے لئے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مظالم کا خیر مشق جیتے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھادی گئی ہے۔ امارت دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ فکر تو اس کی کیجیے کہ لوگ خدا کے دین کو برضا و رغبت تسلیم کریں۔ اور سنت نبویہ کا اتباع کرنے پر آمادہ ہو جائیں، یہ چیز پیدا ہو گئی۔ تو پھر جس کو جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہوتی نظر آئے گی۔ وہ اسے اختیار کرے گا۔ اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہ ملے گا۔ اسے ترک کر دے گا۔ زور تو اسی ایک بنیادی اصلاح

پر دنیا چاہیے۔ اصول سے فروغ کی طرف سے چلنے کی جو تدریج اسوۂ بنوی میں پائی جاتی ہے اگر اسے نظر انداز کر کے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کر دیا جائے۔ تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہوگا۔ اسوۂ بنی کا اتباع نہ ہوگا۔

دور اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم خرابیاں نہیں تھیں۔ جتنی آج ہمارے دور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت چوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا اصلاح کی وادی کو ملک ہی جست میں طے کر ڈالا گیا تھا؟ نہیں بلکہ اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی۔ پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو دھونے کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ تو پہلے بنی کے طریق کار کو خوب سمجھ لیجیے۔ اور پھر آگے قدم بڑھائیے۔

(ردود جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۳ تا ۷۹)

ہم کسی کے حریف نہیں! اپنے طرز عمل اور اپنے انداز گفتار سے دوسری

ہمیں کرنا چاہتے۔ ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے۔ اور ہمارا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے۔ جو بھی حق سے منحرف ہے۔ ہم بس اس کی غلطی کو صاف بتا دیں گے۔ اس کے بعد ہمارا خاص طور پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہوگا۔ بہر حال کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرز عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ کہ آپ اس کے حریف بن کر اٹھیں، ہمیں تو صرف نظام کفر و جاہلیت کا حریف بن کے رہنا ہے۔ اسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہوگی۔ اسی تناسب سے ہماری اس کی دشمنی میں بھی شدت ہوگی

۱) ردود جماعت اسلامی حصہ دوم صفحہ ۹ تا ۱۰

”جو کچھ آپ کریں حکمت کے ساتھ کریں۔ اس کے بغیر آپ کام بنانے کے بجائے الٹا بگاڑ دیں گے ہر شخص کو اپنے ہی حلقے اور طبقے کے لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ اسی کے لئے

سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اگر کالج سے نکلا ہوا کوئی نوجوان اس دعوت کو لے کر علماء کے پاس جائے گا۔ تو اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے اور جماعت اسلامی کے اوپر کچھ اور نئے صادر کرانے کا موجب بنے گا۔ اسی طرح سے اگر کوئی قدیم طرز کا عالم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تبلیغ کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو اغلب یہ ہے کہ وہ وہاں کے طلباء کو دین سے اور دور بھگانے کے سوا کوئی خدمت انجام نہ دے سکے گا۔ ہر شخص کو اسی حلقے میں جانا چاہیئے جس سے اس کا تعلق ہے۔ اور جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ جو کارکن دیہاتی لوگوں سے بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ دیہات میں جائیں۔ جو مزدوروں کو اپنی بات سمجھانے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ وہ مزدوروں میں کام کریں۔ اس کام کے کرتے والوں کو اپنے اندر حکیم اور ڈاکٹر کی سی خصوصیات پرورش کرتی چاہئیں۔ وہ پہلے مصلحت کے خیالات اور ذہنی و فکری پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اسی کے مطابق اس سے بات کریں، مطالعہ کے لئے بھی ہر شخص کو وہ چیز دی جائے۔ جو اس کے مناسب حال ہو۔

بحث و مناظرہ اور رد و کد اور لڑائی جھگڑے سے ہر حال میں پرہیز کیجیئے۔ اس سے کوئی اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ نمایاں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی آپ کو بحث و مناظرہ میں الجھانا بھی چاہے تو آپ اس سے نہ الجھیں۔ اگر آپ یہ محسوس کریں کہ ایک شخص پر بحث کا موڈ طاری ہو گیا ہے۔ تو اس وقت اسے چھوڑ دیجیئے۔ اور کسی دوسرے وقت جب وہ ٹھنڈے طریق سے بات سمجھنے سمجھانے کے لئے تیار ہو۔ اس سے بات کیجیئے۔ اور جس شخص میں آپ جھگڑالوہن یا مخالفانہ تعصب یا ضد کی بیماری پائیں، اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ ہر شخص کو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری بہر حال آپ پر نہیں ہے۔ اپنی توجہ خدا کے بندوں پر صرف کیجیئے جو حق بات کو سننے کے لئے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(مشرقی پاکستان کے حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر صفحہ ۳۸ تا ۴۸)

سخت سے سخت بیہودہ مخالفت کے جواب میں بھی آپ

مخالفت میں طرز عمل | حدود اللہ سے کبھی تجاوز نہ کریں ہر لفظ جو آپ کی زبان یا

قلم سے نکلے اس پر خوب سوچ لیں کہ وہ خلاف حق تو نہیں ہے۔ اور آپ اس کا حساب خدا کے آگے دے سکیں گے؟ آپ کے مخالفین خدا سے ڈریں چاہئے نہ ڈریں، آپ کو بہر حال اس سے ڈرنے چاہیئے

داعیٰ حق اور اُس کے اوصاف

ابتدائیہ

داعی حق خدا کی زمین پر سب سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتا ہے اس لئے کہ وہ کائنات کی حقیقت کو جانتا ہے اور اس سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کرنے کی طرف انسانوں کو بلاتا ہے۔ دعوت حق کو پھیلانے کے لئے اس کی پیدا کردہ تحریک اسلامی دعوت اسلامی کی علمبردار ہوتی ہے اور ایک داعی جو حق کی طرف دعوت دے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف ہی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک خالق، مالک آقا اور پروردگار ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی اور پرستش کی جائے اور اس کی مخلوق کا اس کے ساتھ سب سے سچا اور حقیقی تعلق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مالک اور خالق کی بندگی اور عبادت کرے اس بات کو خالق و مالک نے خود ہی بیان کیا ہے۔

مَا كُنَّا بِمُؤْمِنِينَ وَلَا نَحْنُ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ -

”ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی اور عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے تمام کاموں سے سب سے بڑا اور اہم

۱۔ ابتدائیہ از سید سعید گیلانی

کام یہی ہے کہ کائنات کے خالق کی اطاعت و عبادت کی جائے اور انسانی
کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے لوگوں کو مالک
کے آگے جھک جانے اور اس کی بندگی بجالانے کی دعوت دی جائے
بندگی رب کی دعوت دینے والا دنیا والوں میں سب سے زیادہ محترم، معزز
اور مقدس گروہ انبیاء کا گروہ تھا جس کے افراد اپنے اپنے دور اور اپنی
اپنی قوموں میں مسلسل اور پیہم آتے رہے اور ایک ہی بات کی طرف سارے
انسانوں کو بار بار دعوت دیتے رہے۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ

اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے
اس طرح انسانوں میں سب سے زیادہ معزز، معتبر، محترم اور مقدس گروہ
یہی ہے انبیاء کے کام کا مرکز، نکتہ، ہمیشہ رہا ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی
طرف دعوت دی جائے اس لئے کہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت بھی یہی
ہے کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور انسانوں کی طرف سے اس حقیقت
کا اعتراف سب سے بڑی صداقت کا اظہار ہے یہی دعوت انبیاء کے ساتھی
یا ان کے راستے پر چلنے والے صالحین بھی اپنے اپنے وقت میں انسانوں کو دیتے
رہے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں انسانیت کی ہدایت
رہنمائی اور بھلائی کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی
طرف بلایا جائے۔ سائنٹفک دریافتیں، مشینوں کی ایجاد، انسانی سہولتوں میں
اضافے کا کام، محتاج اور پریشان حال انسانوں کی مدد، تعلیمی اور رفاہی ادارے
خیالاتی اور ملکی یکیں امن کی سلامتی اور لوگوں کی بہبود کے سارے کام دعوتِ دین
کے اس کام کے آگے بیچ و پست اور دوسرے درجے کے کام ہیں خدا کی
نظر میں سب اعلیٰ و ارفع اور دنیا و آخرت میں انسانیت کی بھلائی اور
بہبود کا عظیم کام خدا کی بندگی کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت دینا ہے۔

اس لئے یہ مہابیت ضروری ہے کہ بہترین صلاحیت کے لوگ اس کام کو سر انجام دیں اور دنیا کے مختلف کاموں میں مصروف لوگ خدا کے اس کام میں اپنا اپنا حصہ لگائیں اور اپنا فریضہ بندگی ادا کریں۔ لیکن جس طرح ہر کام کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اللہ کے بندوں تک اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچانے کے لئے بھی ایک مخصوص صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے انبیاء کی تربیت تو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص ذرائع سے خود کرتا ہے کبھی انفس و آفاق میں آیات الہی دکھا کر، کبھی فرعون کے گھوڑوں پرورش کر کے، پھر کمریاں چروا کر، کبھی کنوئیں اور جیل کے راتنے سے تخت شاہی تک پہنچا کر اور کبھی غار و ہجرت کے مراحل طے کر کے غلبہ نظام اسلامی تک لے جا کر، لیکن انبیاء کے بعد جس کسی نے بھی دعوت حق کا کام کرنا ہوا اسے ایک خاص نوعیت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ایک مخصوص طرز کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ تربیت علمی بھی ہوگی اور عملی بھی۔ اس کے بغیر دعوت دین کا کام احسن طریقے سے سر انجام دینا ممکن نہیں ہے تحریک اسلامی ان دونوں قسم کی صلاحیت کے حامل افراد تیار کرتی ہے

علمی صلاحیت کوئی شخص جب تک یہی نہ جانتا ہو کہ حق کیا ہے اس کا معیار کیا ہے۔ اس کی شناخت اور اس کی پہچان کیا ہے اس کے خد و خال اور اس کا حدود و اربعہ کیا ہے وہ کس چیز سے منع کرتا ہے اور کونسا کام کرنے کا حکم دیتا ہے اس وقت تک اس کے لئے نہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ حق کیا ہے اور نہ دوسروں کو باور کرنا ممکن ہے کہ وہ حق ہی پیش کر رہا ہے حق کے نام پر کوئی اور چیز پیش نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے دعوت دین کے لئے حق طلبی، حق شناسی، حق آگاہی اور حق پرستی ساری صفات ضروری ہیں جو شخص دعوت دین کا یہ کام کرنا چاہے اسے اپنے اندر کچھ صلاحیتوں کو پیدا اور بیدار کرنا ضروری ہے۔

کام یہی ہے کہ کائنات کے خالق کی اطاعت و عبادت کی جائے اور انسانی
 کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے لوگوں کو مالک
 کے آگے جھک جانے اور اس کی بندگی بجالانے کی دعوت دی جائے
 بندگی رب کی دعوت دینے والا دنیا والوں میں سب سے زیادہ محرم، معزز
 اور مقدس گروہ انبیاء کا گروہ تھا جس کے افراد اپنے اپنے دور اور اپنی
 اپنی قوموں میں مسلسل اور پیہم آتے رہے اور ایک ہی بات کی طرف سارے
 انسانوں کو بار بار دعوت دیتے رہے۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ

اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے
 اس طرح انسانوں میں سب سے زیادہ معزز، معتبر، محترم اور مقدس گروہ
 یہی ہے انبیاء کے کام کامرانی نکتہ، عیشہ یہی رہا ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی
 طرف دعوت دی جائے اس لئے کہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت بھی یہی
 ہے کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور انسانوں کی طرف سے اس حقیقت
 کا اعتراف سب سے بڑی صداقت کا اظہار ہے یہی دعوت انبیاء کے ساتھی
 یا ان کے راستے پر چلنے والے صالحین بھی اپنے اپنے وقت میں انسانوں کو دیتے
 رہے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں انسانیت کی ہدایت
 رہنمائی اور بھلائی کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی
 طرف بلایا جائے۔ سائنٹفک دریافتیں، مشینوں کی ایجاد، انسانی سہولتوں میں
 اضافے کا کام، محتاج اور پریشان حال انسانوں کی مدد، تعلیمی اور رفاہی ادارے
 خیراتی اور مذہبی کمیونٹیاں امن کی سلامتی اور لوگوں کی بہبود کے سارے کام دعوت دین
 کے اس کام کے آگے ہیچ و پست اور دوسرے درجے کے کام ہیں خدا کی
 نظر میں سب اعلیٰ و ارفع اور دنیا و آخرت میں انسانیت کی بھلائی اور
 بہبود کا عظیم کام خدا کی بندگی کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت دینا ہے۔

اس لئے یہ مہابت ضروری ہے کہ بہترین صلاحیت کے لوگ اس کام کو سرانجام دیں اور دنیا کے مختلف کاموں میں مصروف لوگ خدا کے اس کام میں اپنا اپنا حصہ لگائیں اور اپنا فریضہ بندگی ادا کریں۔ لیکن جس طرح ہر کام کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اللہ کے بندوں تک اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچانے کے لئے بھی ایک مخصوص صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے انبیاء کی تربیت تو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص ذرائع سے خود کرتا ہے کبھی انفس و آفاق میں آیات الہی دکھا کر، کبھی فرعون کے گھوڑوں پرورش کر کے، پھر کمریاں چروا کر، کبھی کنوئیں اور جیل کے راتنے سے تخت شاہی تک پہنچا کر اور کبھی غار و ہجرت کے مراحل طے کر کے غلبہ نظام اسلامی تک لے جا کر، لیکن انبیاء کے بعد جس کسی نے بھی دعوت حق کا کام کرنا ہوا اسے ایک خاص نوعیت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ایک مخصوص طرز کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ تربیت علمی بھی ہوگی اور عملی بھی۔ اس کے بغیر دعوت دین کا کام احسن طریقے سے سرانجام دینا ممکن نہیں ہے۔ تحریک اسلامی ان دونوں قسم کی صلاحیت کے حامل افراد تیار کرتی ہے

علمی صلاحیت کوئی شخص جب تک یہی نہ جانتا ہو کہ حق کیا ہے اس کا معیار کیا ہے۔ اس کی شناخت اور اس کی پہچان کیا ہے اس کے خد و خال اور اس کا حدود و اربعہ کیا ہے وہ کس چیز سے منع کرتا ہے اور کونسا کام کرنے کا حکم دیتا ہے اس وقت تک اس کے لئے نہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ حق کیا ہے اور نہ دوسروں کو باور کرنا ممکن ہے کہ وہ حق ہی پیش کر رہا ہے حق کے نام پر کوئی اور چیز پیش نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے دعوت دین کے لئے حق طلبی، حق شناسی، حق آگاہی اور حق پرستی ساری صفات ضروری ہیں جو شخص دعوت دین کا یہ کام کرنا چاہے اسے اپنے اندر کچھ صلاحیتوں کو پیدا اور بیدار کرنا ضروری ہے۔

احساس و شعور کی بیداری | ایک دائمی حق کے لئے پہلے ہم قدم پر

احساس و شعور بیدار کرنا انتہائی ضروری ہے

کہ وہ اگر دین کی دعوت لے کر اٹھا ہے تو سب سے پہلے اس دین کو اپنی ذات پر نافذ کرنا چاہیے۔ یہ اس سے اس کے دین کا سب سے پہلا تقاضا ہے اگر وہ دین کے اس مطالبے کو پورا کرنے سے عاری ہے تو جس جس سے وہ دین کا مطالبہ پورا نہیں کرتا اسی پہلو سے اس کی دعوت کا مخاطب بھی اس کی دعوت کی طرف سے غیر متاثر بے نیاز اور بے پرواہ رہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو حق کی ترازو میں تولے اور اس کی کمی بیشی پوری کرنے کی اپنی سعی کوشش کرے اپنی طرف دیکھنا، اپنی ذات پر خود گرفت کرنا اور اپنی ذات کو لا کر اپنے ضمیر کے سامنے کھڑا کرنا اور ضمیر کی ترازو میں تولنا دعوت حق کا آغاز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص جہاد پر جانے سے پہلے اپنے اسلحہ کی جانچ پڑتال کرے۔ بغرض اس کے لئے ایک باشعور اور بیدار ضمیر مطلوب ہے اور بیدار ضمیر کی پہچان یہ ہے وہ نیکی پر خوش ہونا اور بدی پر آزرده اور نادم ہونا ہے۔

حضرت عمرؓ کا اپنی بہن فاطمہؓ سے مار پیٹ کا واقعہ ان کے اندر احساس و شعور کی کردٹ کا واقعہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی کمزور بہن جو کبھی اپنے بھائی کے سامنے اُٹ تک نہ کرتی تھی ایک خالص معاملہ دین میں ان کے سامنے ڈٹ گئی ہے اور یہ تک کہہ گزرتی ہے کہ ”عمرو چاہے کر لو لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکالا جاسکتا“ تو ان کی بہن کا پُر عزت جملہ اور ناقابل شکست رویہ ان کے اندر احساس خیر کی بیداری کا باعث بن گیا۔ ان کے اندر عمر فاروقؓ نے کردٹ لی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کوئی خاص چیز ہے جس نے ان کی بہن کو اتنا قوی کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے بھائی کی پرواہ کرنے سے بھی بے نیاز ہے۔ اپنی بہن کی یہی جرأت آمیز بات ان کے اندر قبول حق کے لئے جنگاری کا کام کر گئی۔ اس کے علاوہ ہر شخص حضور اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق اپنے پانچ نکاتی جانورے کا اہتمام کرے کہ وہ اپنی عمر عزیز

کس کام میں صرف کر رہا ہے۔ اپنا علم کس مقصد کے لئے کام میں لا رہا ہے اپنی آمدنی کو کہاں کہاں سے سمیٹ رہا ہے اور اسے کس کس راستے میں صرف کر رہا ہے اور اس کی جسمانی اور ذہنی توانائیاں کس کس جگہ کام آ رہی ہیں اور یہ کہ ان سب چیزوں میں ان کے خدا کا حصہ کتنا ہے تو یہ جاننا ہی اس کے اندر اخلاص نیت، خشیت الہی اور دین کے لئے کام کرنے کا عزم پیدا کر دے گا اور وہ دین کے داعی کی حیثیت سے کام کرنے کی خوبی سے آراستہ ہو جائے گا۔

نیت کی درستی | احساس کی بیداری کے بعد اللہ کے دین کے لئے کام کرنے کی نیت اور عزم کا مسئلہ ہے جب تک آدمی نیت کر کے خدا کے کام کی طرف رجوع نہ کرے اس کا دل دماغ اور اس کی توانائیاں سمت منزل اور مدت سے محروم رہتی ہیں اسلام میں نیت خیر کا مسئلہ عمل خیر سے پہلے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیت کی خوبی عمل خیر کو تقویت پہنچاتی ہے اس میں خلوص اور بے لوثی پیدا کرتی ہے اس کام کو بہتر انجام تک پہنچاتی اور انسان میں عزم، حوصلہ اور صبر پیدا کرتی ہے۔ نیت کے بغیر کوئی بھلائی بھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے ایک مومن کو یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اللہ کی بندگی کی دعوت اللہ کے بندوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس کے اللہ کا اس کے ذمے یہ حق ہے جسے ادا کئے بغیر اس کا فریضہ بندگی ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ اجتماعی کام ہے جسے سرانجام دیئے بغیر انفرادی نیکی میں بھی استحکام اور استقلال پیدا نہیں ہوتا ایک داعی میں یکسوئی کے ساتھ یہ جذبہ شدید ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مالک کے دین کی دعوت اس کے تمام بے خبر اور گم کردہ راہ بندوں تک پہنچائے گا اور اس میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور قوتیں بہترین انداز میں کھپائے گا۔ اس راستے میں آنے والی مشکلات سے ہرگز نہیں گھبرائے گا اس لئے کہ مشکلات تو حق کے راستے کا زادِ راہ ہیں مصائب اس راستے کا زادِ سفر ہیں اور مخالفتیں اس راستے کا دستور ہیں۔ غرض داعی حق کی پیروی یہی ہے کہ وہ حق و صداقت کا پیغام لے کر خدا کے بندوں کی طرف جاتا

ہے اور اگر ان کی طرف سے مزاحمت، مخالفت، گالی گلوچ، مار پیٹ اور پتھر بھی آئیں تو وہ ان سب کو برداشت کرتا ہوا نتائج کو اپنے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کام سے کسی رکاوٹ کے سبب بھی کبھی باز نہیں آتا۔

علمِ حق و صداقت کا حصول | علمِ حق و صداقت دینِ اسلام ہے اور اس کے حصول کے دو ہی سرچشمے ہیں۔ قرآن

سنت۔ انسانوں کے مالک کی مرضی قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ اس مرضی کو پورا کرنے کا طریقہ اس قرآن کو لانے والے رسولِ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہمارا مالک ہم سے جو کچھ چاہتا ہے اور کس طرح چاہتا ہے یہ بات ہمیں رسولِ پاکؐ کی تعلیمات کو جانے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی اس لئے ایک داعیِ حق کے لئے قرآن سے تعلق ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہی واحد کتابِ صداقت و ہدایت ہے اور اب ساری ہدایت اس کے اندر ہے اس سے باہر ہدایت و صداقت نہیں ہے اور جو شخص ہدایت کا متلاشی اور صداقت کی پیروی کرنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے استفادہ کئے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین پر خدائے بزرگ و بزرگی یہ ایک ہی آواز ہے جس کی پکار پر قدم بڑھائے بغیر انسانِ فلاح کا راستہ نہیں پاسکتا۔ اس لئے قرآن کا بڑھنا اس کے مضامین کو سمجھنا اور اس کی ہدایت کو زیادہ علم رکھنے والوں کی مدد سے اپنے اندر جذب کرنا، اسے حفظ کرنا، اسے اپنے سینے میں محفوظ کرنا اور اس کے سانچے میں ڈھل جانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ پھر اس قرآن کو لانے والے پاک اور معصوم انسان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی سعی کرتا ہے اس لئے کہ وہی خدا کے مطلوبہ مہیا کے کامل نمونہ اور مکمل انسان تھے اور جس کسی نے خدا کی مرضی کو انسانی کردار میں منعکس و یکساں ہو وہ رسولِ پاکؐ کے کردار و اخلاق میں ہی دیکھ سکتا ہے اور جس کسی نے قرآن کو بولتے ہوئے اپنے کانوں سے سننا ہو وہ حضورِ اکرمؐ کے ارشادات کو سن سکتا ہے۔

غرض حق و صداقت کا سرچشمہ قرآن و سنت ہی ہیں۔

مطالعہ سیرت صحابہ و صالحین | خدا کے احکام اور رسول اکرمؐ کے کال نمونے

کو انسان جس بہترین انسانی سانچے میں
ڈھلا ہوا دیکھ سکتا ہے وہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن
کے کردار ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں دعوت دین اور
اشاعتِ حق کے لئے صرف کیں جو صداقت کے پیکر، ہدایت یافتہ اور نیکی کے
علمبردار تھے جن کے کردار سے معروف نمایاں ہوا اور منکر دبتا تھا جن کے افعال
کے آئینے میں ہمیں معروف و منکر کے اہتمام و اجتنباب کی بہترین مثال ملتی ہے
جو حق کے لئے جہاد کرنے والے، حق کے لئے گھر بار چھوڑنے والے، حق کے لئے زندگیاں
لگانے والے اور کھپانے والے اور حق کے لئے اپنی زندگیوں کی ساری مادی متاع
لٹانے والے تھے جن کے عمل سے ہمیں بھلائی کے راستے پر چلنے کے لئے رہنمائی ملتی
ہے اور جن کے کام سے ہمیں اپنے کام میں مدد ملتی ہے۔ جنہوں نے حق ہم تک
پہنچایا تو حق ہم تک پہنچا اور جنہوں نے معروف و منکر کو اپنے کردار سے نمایاں کیا
تو وہ ہم پر واضح ہوا۔ ان کی خدا ترسی، خشیتِ الہی، معاملات کی خوبی، عبادات
کا اہتمام، کردار کی بلندی، اللہ رسول سے وفاداری اور دین کے لئے قربانی و ایثار
سے ہمارے سامنے درختاں مثالی قائم ہوتی ہیں اور جن کے نقش قدم پر چل کر
ہم نقش ہدایت پاتے ہیں، ایک داعی حق کے لئے ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا
اور ان کی زندگیوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنانا سجدہ لازمی ہے۔

تعلق باللہ | ایک داعی حق کے لئے سب سے مضبوط لنگر اپنے مالک کے

ساتھ اس کا گہرا جاندار یا بیدار اور مضبوط تعلق ہے اس
کا یہ احساس کہ وہ جس کا کام کر رہا ہے وہ اس کو دیکھ رہا ہے قضا و قدر کے
کارکن اس کے غیبی کارندے اس کی مدد کر رہے ہیں اس کی پشت پناہی اسے
حاصل ہے۔ وہ زندہ و پائندہ جی و قیوم، قادر مطلق اور مختار کل ہستی کا کارندہ
اور اس سے وابستہ ہے۔ وہ ہستی قدم قدم پر اس کی دستگیری کرتی ہے وہ

فرد کے دل میں اس کی پذیرائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے انداز سے اور اجلے میں اس کی نگرانی، محاذِ قضا اور پشتِ پناہ ہے جس کی قدرت کاملہ سے باہر کوئی پر بھی نہیں ہلا سکتا۔ وہ اس کی زیرِ لب دعاؤں کو بھی سنتا اور اس کے دل کے اضطراب کو بھی جانتا ہے وہ ہستی اس کے ساتھ ہے جس پر ایمان لانا برا ایمان سے مقدم ہے جس سے خوف کھانا ہر خوف سے مقدم ہے جس کی رضا پناہ دوسرے ہر کسی کی رضا سے مقدم ہے جس کی عبادت میں انہماک دوسرے ہر انہماک سے مقدم ہے جس سے گہرا تعلق ہر دوسرے تعلق سے مقدم ہے وہی ہر دعوت کا مرکز ہر دورِ دھوپ کا محور اور ہر ایثار و قربانی کا مقصود ہے اس کی رضا کا حصول ہمارا سرچڑ زندگی ہے اور اس کی رضا کے لئے ہمارا سب کچھ حاضر اور قربان ہے۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

داعیِ حق میں یہ توانائی ہو کہ وہ اللہ کے لئے ہر محبت قربان کر سکے اور اس کی لہریں ہر غصہ برداشت کر سکے۔ اس کے لئے ہر نقصان گوارا کرے اور اس کی خاطر ہر نفع ترک کر سکے جو اس کے دشمن ہیں وہ ان کا دشمن ہو جائے اور جو اس کے دوست ہیں وہ ان کا خادم بن جائے۔ اس طرح مالک کی صفات کے ایک ایک پہلو پر غور و فکر کر کے اس سے محبت بھی کرے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کے مقابلے میں آگ میں گر جانا اسے قبول ہو اور اس کا ذکر اسے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ اس کی بندگی کے لئے وہ نماز پڑھے، اس کو خوش رکھنے کے لئے وہ روزہ رکھے اور اس کی رضا کے لئے وہ اس کی ملائیم قربان کرے پس اپنے مالک کے ساتھ جب اس کا تعلق درست اور راست ہو جائے تو پھر داعیِ حق لے روحانی کردار کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے اور اللہ پر ایمان لانے کے ضروری تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

محبت رسول اللہ کے بعد دوسری ہستی جس سے ایک داعیِ حق کے لئے بے پناہ محبت جزوِ ایمان بننے والی ہے رسول اکرمؐ کی ذاتِ اقدس

ہے جنہوں نے انسانیت کو دوزخ کے گڑھے سے نکال کر جنت کے راستے پر ڈالا۔ جنہوں نے انسانوں کو نباہی سے ہٹا کر سلامتی کی طرف رہنمائی کی۔ جنہوں نے مصائب اٹھا کر ہمارے لئے ایمان و اسلام اور رضائے الہی کے حصول کے مواقع پیدا کئے۔ جنہوں نے ہجرت اختیار کر کے ہمارے لئے کفر سے ایمان کی طرف آنے کا راستہ ہموار کیا۔ جنہوں نے کفر سے ٹکرا کر حق و باطل کا امتیاز نمایاں کیا جو انسانیت کے قائد و سالار اور رحمتہ العالمین میں جو قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کے مستقل رہنما اور قائد ہیں۔

حضور اکرم نے انسانیت کو تہذیب کا درس دیا۔ انسان کو وحشت و درندگی سے شرافت و مدنیت کا سبق دیا۔ جہالت کے اندھیرے سے علم کی روشنی کی طرف رہنمائی کی۔ جنہوں نے ہمیں بہترین قانونِ عدل عطا فرمایا۔ انسانی مساوات و موافقت دی۔ آقا و غلام کا فرق مٹایا۔ عورت کو بلند درجہ دے کر اسے مرد کا ساتھی اور رفیق بنایا اور ماں کے پاؤں کے نیچے جنت کا نشان بتایا۔ جنہوں نے چھوٹوں کو بڑوں کا ادب سکھایا اور بڑوں کو چھوٹوں پر مہربانی اور شفقت کی تعلیم دی۔ جن سے بڑھ کر رحیم و کریم انسان نہ ان سے پہلے دنیا میں آیا اور ان کے بعد آئے گا جو سراپا رحمت، سراپا محبت و شفقت اور مظلوموں، یتیموں، مسکینوں اور پس ماندہ انسانیت کے محافظ و محسن تھے ہمارا ان سے محبت کرنا صرف اعترافِ احسان ہی نہیں بلکہ جزو ایمان بھی ہے اور جس دل میں ان کی محبت نہیں ہے اس میں ایمان کی رمت بھی موجود نہیں ہے ایک داعیِ حق کے لئے ان کی محبت مشعلِ راہ اور ان کی بیہروی عزیمت و استقامت کا معیار ہے۔

فکرِ آخرت | خدا و رسولؐ کی محبت کے ساتھ ہی فکرِ آخرت بھی ممکن کا جزو ایمان ہے آخرت کو ترجیح دینا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کو سنوارنے کی کوشش کرنا داعیِ حق کا فرضِ اولین ہے وہ

دنیا میں ممکن لوگوں کو آخرت کی یاد دلانا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ حقیقی اور کامل زندگی آخرت میں ہے دنیا اس کے مقابلے میں یوں ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں شبنم ہوتی ہے دنیا تو اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگوں کی آبادی ہے لیکن آخرت میں باکردونوں قسم کی آبادیاں الگ الگ ہو جانے والی ہیں۔ بُروں کے لئے دوزخ کی آبادی ہے اور بڑی ہی ہولناک آبادی ہے اور اچھوں کے لئے جنت ہے اور وہ بڑی ہی خوشگوار اور خوش کن آبادی ہے آخرت میں باکردنیا کی ساری آبادی ان دو آبادیوں میں تقسیم ہو جائے گی اور تقسیم آبادی کا اصول دنیا کی زندگی کا عمل ہوگا۔ انسان نے اس دنیا میں کس طرح زندگی گزاری۔ خدا کا وفا دار بندہ بن کر گزاری یا باغی اور سرکش انسان بن کر گزاری۔ اس کی زندگی اطاعت کی تھی یا بناوٹ کی زندگی۔ اس بات کا امتحان کہ ایک شخص اپنے حقیقی مالک کو پہچانتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ یہ کام دنیا میں ہی ممکن ہے یہاں مالک حقیقی کی ذات آیات و علامات کے پیرائے میں پنہاں ہے اور اس کی طرف چلنے میں مصائب بھی آتے ہیں اور اس کی طرف جانے میں شیطان کے خوشنما جال بھی رکاوٹ بنتے ہیں۔ آخرت کا احساس تو صرف ضمیر کرتا ہے اور دنیا کی شیریں بینوں کا احساس انسان کا ظاہری رونگٹا کرتا ہے یوں انسان کو امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ اس دنیا میں دائمی حق کا کام یہ ہے کہ یہ حقیقت کو پہچانے اور راہ راست پر خود بھی چلے اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلنے کی دعوت دے۔

آخرت کے احساس کی پرورش کے مختلف اور متعدد ذرائع ہیں جن میں سب سے اہم ذریعہ قرآن کی آیات اثمار اور مناظر قیامت کا مطالعہ ہے پھر احادیث میں کتاب الزفاتی اور کتاب الفتن کا مطالعہ ہے۔ پھر بزرگوں کے احساس آخرت کو بیدار کرنے والے واقعات و احوال ہیں۔ پھر گاہے گاہے گور

غریباں میں جا کر آخرت کے مسافروں کے آخری نشانات قبروں کے درمیان
چکے وقت گزارنا ہے پھر کبھی کبھی ہسپتال میں جا کر بیماروں سے ملاقاتیں اور ان
کے حالات سے آگاہی ہے اس طرح ایک داعی حق آخرت کی فکر رکھنے والوں
کے درمیان رہ کر آخرت کا احساس زیادہ سے زیادہ بیدار کر سکتا ہے۔

کردار کا ایک قرآنی خاکہ | تحریک اسلامی کے داعی کے کردار کا قرآن نے

بھی ایک خاکہ پیش کیا ہے ہر مومن بنیادی
طور پر مجاہد ہوتا ہے۔ تبلیغ دین کا عمل ایک مسلسل اور پیہم جہاد اکبر ہے حضور
نے غزوہ تبوک سے واپسی پر مدینہ کی طرف سفر کرتے ہوئے صحابہ کرام سے فرمایا
تھا کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوہتے ہیں اس لئے کہ نفس کو اللہ
کا مطیع فرمان بنا کر رکھنا اور اسے اللہ کی مرضیات کا تابع کرنا بہت بڑا جہاد
ہے اور جہاد ہی مومن کی ساری زندگی کا شعار ہے۔

چنانچہ قرآن نے ایک داعی راہ حق کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ رسوۃ الفرقان
میں اس طرح درج ہے۔

رحمان کے اصلی بندے تو وہ ہیں جو

يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا
وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ
قَالُوا سَلَامًا۔

زمین پر نرم چال چلتے ہیں
جاہل ان کے منہ آئیں تو سلام
کہہ کر گزر جاتے ہیں

يَسْتَوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا
وَقِيَامًا۔

اپنے رب کے حضور سجدے اور
قیام میں راتیں گزارتے ہیں

إِذَا أُلْقُوا لَكُمْ يُبَدِّلُوكُمْ
يَقْتُلُوكُمْ وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ
قَوَامًا۔

اگر تم پر پھینکا جائے تو
اور نہ بدل کر دیتے ہیں نہ دونوں کے

لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا
هَذَا كَمَا كَانُوا يُدْعُونَ

اور نہ سوا کسی اور کو معبود بنا
یہ جیسا کہ وہ پہلے سے

اَحَدٌ - لاَ يَمُتُّوْنَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ
کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے
اللَّهُ اِلَّا بِالْحَقِّ -

لَا يَزْنُوْنَ
زنا نہیں کرتے
لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ
جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے
اِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا
لغو چیز پر گزر رہو تو شریعتاً
کِرَامًا - گزر جاتے ہیں۔

مزید سورہ المومنون میں علامات بتائیں

هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ
اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں
هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ
زکوٰۃ پر عمل ہوتے ہیں
هُمْ لِفِرْحِهِمْ حَافِظُوْنَ -
اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں
هُمْ اِذَا مَاتَ اَنَاثِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کو پورا
رَٰمُوْنَ - کرتے ہیں

لَا تَصْعَدُ خَدَّكَ لِلنَّاسِ
لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر
لَا تَمْسِسْ فِي الْاَرْضِ مَرْحًا
زمین میں اکڑ کر نہ چل
وَاَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ
اپنی چال معتدل رکھ اور اپنی آواز
مِنْ صَوْتِكَ
پست رکھ

پھر سورہ توبہ میں مزید تدوین نمایاں کئے

اَلتَّائِبُوْنَ
توبہ کرنے والے
اَلْعَابِدُوْنَ
عبادت کرنے والے
اَلْحَامِدُوْنَ
خدا کی حمد کرنے والے
اَلسَّائِحُوْنَ
خدا کی راہ میں سفر کرنے والے
اَلرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ
رکوع و سجدہ کرنے والے

الْأَمْسُورُونَ بِالْمَعْمُورِينَ
النَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ
الْعَافِطُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ

نیکی کا حکم دینے والے
بدی سے روکنے والے
حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے

غرض اس طرح قرآن و حدیث کے صفحات میں جا بجا داعیِ حقِ مومن کے کردار کی حسین و جمیل جھلکیاں بکھری ہوئی ہیں جنہیں آسانی سے چن چن کر داعیِ حق کے خوشنما کردار کا ایک عمدہ گلدستہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

عملی تربیت | تحریکِ اسلامی کا علمبردار صرف الفاظ کے طوطا بینا بنانے کے لئے نہیں اٹھتا بلکہ وہ انسانی زندگیوں میں خوش گوار اصلاحی

انقلاب برپا کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے اس لئے اس کا حقیقی میدانِ عمل کا میدان ہے وہ انسانی زندگی کی بھیتی میں اپنی اصلاح کے بیج بوتا ہے اور خوشگوار اخلاق و کردار کی فصل اگاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانیت عملی طور پر فلاح کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ کوئی راہب نہیں ہوتا کہ خاموشی سے غار کا یگوشہ گیری کا راستہ اختیار کرے وہ کوئی جوگی نہیں ہوتا کہ پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر شانتی کو تلاش کرتا رہے۔ وہ کوئی تارک الدنیا انسان نہیں ہوتا کہ جس دنیا میں اس کے خدا نے اسے امتحان کی خاطر ناما رہے اس امتحان گاہ سے خاموشی کے ساتھ کھسک کر ایک کونے میں جا گئے اور ساری زندگی گزار دے وہ تو حضور اکرم کے اس ارشاد کا مخاطب ہوتا ہے کہ

”تم میں جو کوئی بدی دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ہی اسکی مذمت کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو مٹانے کی خواہش رکھے کیونکہ یہ ایمان کا کم از کم درجہ ہے جس دل میں بدی سے نفرت نہ ہو اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں“

اس لئے قرآن نے صاف صاف حکم دیا کہ

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ رِجَالٌ مُدْرِكُونَ
الْبَغْيَ وَيُنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (آل عمران)

روحتم میں سے ایک ایسی جماعت تضرع
ہی ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف
بلائی ہو، لچھے کام کا حکم دیتی ہو۔
اور بڑے کام سے روکتی ہو اور
فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں

یہ ہدایات تحریک اسلامی کے علمبردار کو واضح طور پر میدان عمل میں آکر
ذریعہ دعوت دین ادا کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

اصلاح خلق کی عملی جدوجہد | ایک داعی حق کی تربیت کا بلا عملی ذریعہ
یہ ہے کہ وہ اس کام کو سراہا نام دے جس

کام کو وہ حق سمجھتا ہے۔ درحقیقت وہ اس وقت تک اپنی دعوت فطری سترچ
سے دوچار نہیں ہوتا جب تک وہ میدان میں آکر بندگان خدا کے سامنے عملی
طور پر دعوت حق پیش نہ کرے۔ اس اقدام کے ساتھ ہی اسے تعاون کرنیوالے
دوستی کے ہاتھ بھی ملیں گے جو اس کے رفیق کار ہوں گے اور مزاحمت کرنے
دست عناد سے بھی واسطہ پڑے گا جو اس کا راستہ روکیں گے۔ لہذا عملی جدوجہد
کے ساتھ ہی اسے رفاقت کے لطف اور مزاحمت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے
گا اور یہی دونوں احوال اس کی تربیت کے لئے ضروری ہوں گے۔ دوستوں سے
مل کر وہ کام کا نقشہ بنائے گا اور مخالفوں کی مزاحمتوں کے توڑ کی تدابیر سوچے گا اور
ان کے مظالم پر صبر کی مشق کرے گا۔ اس طرح اس کے اندر پختہ معزم و ارادہ پرورش
پائے گا اور آزمائش کی بھٹی سے گزر کر وہ سونا ہو جائے گا۔

اس جدوجہد میں اس کے قریبی عزیز اور ہمدرد بھی اس کا راستہ روکیں گے
تاکہ وہ اپنے دنیوی مستقبل کو خراب نہ کرے اور اس کے مخالف بھی اس کا راستہ روکیں
گے تاکہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو۔ یہ صورت حال اس کی تربیت کے لئے
ماحول کا ایک عمدہ تربیتی سانچہ فراہم کرے گی جس میں ڈھل کر وہ ایک کامیاب داعی

حق بن جائے گا۔

صحبتِ صالح | داعی حق کی تربیت کا دوسرا عملی ذریعہ صحبتِ صالح ہے۔ اس پر بُرے لوگوں کی صحبت و رفاقت و الفت سے دست کش ہو کر خدا ترس اور نیک لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اختیار کر لینی چاہیئے۔ تاکہ اس پر باطل کی ہم نشینی کے ناگوار اثرات نہ پڑیں اور اس میں باطل باتوں اور لغو حرکات کو برداشت کرنے کی عادت نہ پڑے اور اس میں مہمانت پرورش نہ پائے وہ ہم خیال اور نیک لوگوں کی مجلس سے خود بھی مستفید ہوگا۔ اور ان کو بھی حق کی پشت پناہی پر آمادہ کر سکے گا۔ اگر ایک نمازی آدمی بے نماز لوگوں کی مستقل رفاقت اختیار کر لے تو وہ ضرور ہی آہستہ آہستہ نمازوں میں کوتاہی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس کے ہم نشین اس کے لئے نماز کو قائم کرنے میں مددگار ہونے کی بجائے کوتاہی کرنے کا باعث بنتے چلے جائیں گے اس لئے ایک داعی حق کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ نیک لوگوں کی مجلس رفاقت سے نہ کہ بُروں کی ہم نشینی۔ جب نیکی ایک جماعت کی صورت اختیار کر کے کام کرتی ہے۔ اسی صورت میں وہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ویسے بھی اسلام نے مسلمانوں کو نیکی کا حکم دینے والوں کی ایک جماعت بنا کر کام کرنے کا حکم دیا ہے جس طرح کونٹوں کے پاس بیٹھنے والا ان کی سناہی اور پھولوں کے پاس بیٹھنے والا ان کی خوشبو لینے وجود میں میٹ لیتا ہے اسی طرح انسانوں پر صحبتِ نیک و بد کا اثر ہوتا ہے۔ نیک لوگوں کے اجتماع میں شرکت نیکی کرنے کا ذریعہ اور نیکی کی دعوت پھیلانے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نیک لوگ باہم ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ باہمی اصلاح کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ اور یوں ایک ساتھی اگر گرتا نظر آتا ہے۔ تو دوسرا اسے سنبھالتا ہے۔ اور ایک کے پائے استقامت میں اگر لغزش آتی ہے تو دوسرا آگے بڑھ کر اسے تھام لیتا ہے ایک کے دامن کا وہبہ دوسرا صاف کر دیتا ہے۔ اور اگر دوسرے کا دامن آلودہ ہو

تو پہلا اسے پاک کر دیتا ہے۔ ایک کی اصلاح دوسرے کی رہنمائی کا باعث بنتی ہے اور ایک اگر اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتا ہے تو دوسرا اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایک کی کوئی بات کسی کو کھٹکتی ہے تو دوسرا حسن و خوبی کے ساتھ اس کو توجہ و لادیت ہے اس طرح آہستہ آہستہ پورا اجتماع باہمی خیر و فیض کا تبادلہ کر کے حسن و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک داعی حق کسی صحابی یا بزرگ کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس کی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنے کا معمولی اہتمام کر لے تو اس سے بھی تربیت اور کردار کی اصلاح میں بہت مدد ملتی ہے۔

اپنے سے اعلیٰ ساتھیوں پر نظر | تربیت و اصلاح کردار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے احباب و رفقاء میں اخلاق و کردار اور دینداری اور تقویٰ میں اپنے سے بہتر ساتھی پر نظر رکھی جائے اور اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک داعی حق کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیوی امور میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے تاکہ دوسروں کی خوشنما دنیا دیکھ کر وہ لالچ اور حسرت میں مبتلا نہ ہو اور دینی امور میں اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے تاکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا موازنہ کر کے وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرے۔ اس کی خوبیوں کو اپنائے اور اپنے آپ کو سنوارنے کی تہ تک دوڑ کرے۔ اگر انسان غور سے دیکھے تو صاف دکھائی دے گا کہ چاروں طرف اس کے مختلف ساتھیوں میں اخلاق و کردار کے عمدہ عمدہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کسی میں خدا ترسی ہے کسی میں خوش خلقی ہے کسی میں خدا کی راہ میں مال صرف کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے کا جذبہ ہے کسی میں عبادت کا شغف ہے کوئی وکرواد کار میں منہمک ہے۔ کوئی خلق خدا کی ہمدردی، خیر خواہی اور خدمت خلق میں آگے ہے کوئی شفقت، نرم مزاجی، خوش خلقی اور خوش مزاجی میں منفرد ہے۔ کوئی راتوں کا زاہد ہے اور کوئی دن کا مجاہد فی سبیل اللہ اور

دعوتِ حق کا سرگرم و نیک رفتار ساتھی ہے۔ ایک داعیِ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آس پاس بکھری ہوئی ان خوبیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے کردار میں جمع کرتا جائے تاکہ وہ خود بھی ان ساری خوبیوں کا ایک دلاویز گلدستہ بن جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام | داعیِ حق کی تربیت کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے

کہ وہ خلقِ خدا کے اندر بالفعل نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی خوف دلانے والے کے خوف سے نہ دے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

”اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم وہ قوم ہو کہ نیکی کا حکم دو۔ بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔ جس طرح اس نے بنی اسرائیل پر کی“ (ترمذی) اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مسلمانوں میں خیر کی شمع کو روشن رکھنے اور شر کی ظلمت کو دفع کرنے کا اہتمام جاری رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ایسے لوگوں کا اللہ کے عذاب سے بچ نہ سکتا سخت مشکل ہے۔

معاشرۂ تربیت و اصلاح کا سانچہ | جب کوئی شخص دعوتِ حق لے کر اٹھتا ہے تو صرف یہی نہیں ہونا کہ

تنہا وہی معاشرے کی اصلاح کا کام کرتا ہے بلکہ خود معاشرہ بھی اس کے اندر معمولی سے معمولی کمزوری اور لغزش کی نشاندہی کر کے اسے ٹھیک ٹھیک اصلاح و درستی کے معیار مطلوب پر قائم ہونے اور رہنے پر مجبور کر دیتا ہے ایک داعیِ حق اس بات کی طرف معاشرے کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس بات کا وہ خود اہتمام نہ کرتا ہو اور اس خرابی سے وہ کسی دوسرے کو بچا نہیں سکتا۔ جس خرابی سے بچنے کا وہ خود اہتمام نہ کر رہا ہو۔ اس طرح جو نہی وہ اپنی دعوت لے کر اٹھتا

تو پہلا اسے پاک کر دیتا ہے۔ ایک کی اصلاح دوسرے کی رہنمائی کا باعث بنتی ہے اور ایک اگر اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتا ہے تو دوسرا اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایک کی کوئی بات کسی کو کھٹکتی ہے تو دوسرا حسن و خوبی کے ساتھ اس کو توجہ و لادیت ہے اس طرح آہستہ آہستہ پورا اجتماع باہمی بخیر و خوبی کا تبادلہ کر کے حسن و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک داعی حتیٰ کسی صحابی یا بزرگ کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس کی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنے کا معمولی اہتمام کر لے تو اس سے بھی تربیت اور کردار کی اصلاح میں بہت مدد ملتی ہے۔

اپنے سے اعلیٰ ساتھیوں پر نظر | تربیت و اصلاح کردار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے احباب و رفقاء میں

اخلاق و کردار اور دینداری اور تقویٰ میں اپنے سے بہتر ساتھی پر نظر رکھی جائے اور اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک داعی حتیٰ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیوی امور میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے تاکہ دوسروں کی خوشنما دنیا دیکھ کر وہ لالچ اور حسرت میں مبتلا نہ ہو اور دینی امور میں اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے تاکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا موازنہ کر کے وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرے۔ اس کی خوبیوں کو اپنائے اور اپنے آپ کو سنوارنے کی تلمذ و دہ کرے۔ اگر انسان غور سے دیکھے تو صاف دکھائی دے گا کہ چاروں طرف اس کے مختلف ساتھیوں میں اخلاق و کردار کے عمدہ عمدہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کسی میں خدا ترسی ہے کسی میں خوش خلقی ہے کسی میں خدا کی راہ میں مال صرف کرنے اور الفاق فی سبیل اللہ کرنے کا جذبہ ہے کسی میں عبادت کا شغف ہے کوئی ذکر و اذکار میں منہمک ہے۔ کوئی خلق خدا کی ہمدردی، غیر خواہی اور خدمت خلق میں آگے ہے کوئی شفقت، نرم مزاجی، خوش خلقی اور خوش مزاجی میں منفرد ہے۔ کوئی راتوں کا زاہد ہے اور کوئی دن کا مجاہد فی سبیل اللہ اور

دعوتِ حق کا سرگرم و نیک رفتار ساتھی ہے۔ ایک داعیِ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آس پاس بکھری ہوئی ان خوبیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے کردار میں جمع کرتا جائے تاکہ وہ خود بھی ان ساری خوبیوں کا ایک دلاویز گلدستہ بن جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام | داعیِ حق کی تربیت کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے

کہ وہ خلقِ خدا کے اندر بالفعل نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی خوف دلانے والے کے خوف سے نہ دے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

”اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم وہ قوم ہو کہ نیکی کا حکم دو۔ بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔ جس طرح اس نے بنی اسرائیل پر کی“ (ترمذی) اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مسلمانوں میں خیر کی شمع کو روشن رکھنے اور شر کی ظلمت کو دفع کرنے کا اہتمام جاری رکھنا اشد ضروری ہے۔ اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ایسے لوگوں کا اللہ کے عذاب سے بچ نہ سکتا سخت مشکل ہے۔

معاشرۂ تربیت و اصلاح کا سانچہ | جب کوئی شخص دعوتِ حق لے کر اٹھتا ہے تو صرف یہی نہیں ہونا کہ

تنہا وہی معاشرے کی اصلاح کا کام کرتا ہے بلکہ خود معاشرہ بھی اس کے اندر معمولی سے معمولی کمزوری اور لغزش کی نشاندہی کر کے اسے ٹھیک ٹھیک اصلاح و درستی کے معیار مطلوب پر قائم ہونے اور رہنے پر مجبور کر دیتا ہے ایک داعیِ حق اس بات کی طرف معاشرے کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس بات کا وہ خود اہتمام نہ کرتا ہو اور اس خرابی سے وہ کسی دوسرے کو بچا نہیں سکتا۔ جس خرابی سے بچنے کا وہ خود اہتمام نہ کر رہا ہو۔ اس طرح جو نہی وہ اپنی دعوت لے کر اٹھتا

سے ہر طرف سے نگاہ احتساب اس کے ایک ایک کام اور حرکت پر لگ جاتی ہے اور اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہو تو اسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اس لئے کسی داعی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ بہت سی خرابیاں اپنے ساتھ لے کر معاشرے کی اصلاح کے لئے نکل کھڑا ہو معاشرہ اس کے قول و فعل کو یکسو کر کے چھوڑتا ہے یا تو اسے اپنے قول کے مطابق خود بھی ڈھلنا پڑتا ہے یا پھر اسے اپنے قول سے ہی توبہ کرنا پڑتی ہے اس لئے انسانی معاشرہ دعوت حق پیش کرنے والے کے لئے خود بھی ایک کسوٹی بن کر اس کی درستی اور راستی کا ضامن بن جاتا ہے۔ کبھی معاشرے کی تنقید سے اور کبھی اس کی مزاحمت اور آزمائش سے داعی حق اپنے کردار کی ہر گنجی کو دور کر لیتا ہے اور بلاخود اپنی قوت کے لئے غلصہ اور بے لوث ہو کر رہتا ہے اس طرح داعی حق کے لئے معاشرہ خود ایک تربیتی ماحول اور اصلاح کا سانچہ فراہم کر دیتا ہے۔

نظام حق کے غلبہ کی جدوجہد | تمام ذرائع تربیت میں داعی حق کی اخلاقی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ

یہ ہے کہ وہ اس نظام حق کے غلبہ کے لئے عملی طور پر جدوجہد کا آغاز کرے جس کی حقانیت کی گواہی وہ اپنے قول و فعل سے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کے علمبردار کی اخلاقی تربیت کے بھی مختلف مدارج ہیں جس طرح حدیث کی رو سے ایمان کے مختلف درجے ہیں اگر منکر کو قوت سے روکنا ایمان کا پہلا درجہ ہے تو منکر کو روکنے والی قوت کی فراہمی یعنی اقامت دین کی جدوجہد بھی ایک داعی حق کا پہلا فرض ہے جس سے پہلو تہی کر کے اس کے دوسرے اعمال کی قدر و قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔ جب تک یہ نیت نہ ہو کہ خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے اور جب تک پیش نظر یہ منزل نہ ہو کہ دین حق کو ساری دنیا میں غالب کرنا ہے اس وقت تک ایک داعی حق کی سیرت کا پورا پورا اظہار نہیں ہوتا۔ اور اس کے سارے گوشے نکھر کر سیرت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ایک داعی خفی میں ایمان کے سائے پہلو اور سائے مدارج موجود ہوں اور وہ جس طرح خدا پر ایمان، رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان اور ایمان کے دیگر تمام گوشوں کو ہمہ پہلو مکمل کئے بغیر ایمان کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اسی طرح زبانی ایمان کا اعتراف ہی کافی نہیں بلکہ اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ و رسول کا مطیع فرمان بنادینا اور ان کے احکام پر سر جھکا کر ملاپہن و چرائیل پڑنا بھی اتنا ہی ضروری ہے درنہ ایمان بلا عمل و کردار تو نفاق کا مظہر بن جاتا ہے ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کا نام ہی حقیقی اسلام ہے یعنی عملی اطاعت کا زندگی کے ہر گوشے میں مظاہرہ کرنا ہی سچا اسلام ہے پھر یہ مظاہرہ اطاعت بھی ایسا ہو کہ جس میں احساس و شعور و ضابطہ و تقاضائے حکم کا پورا پورا التزام و اہتمام موجود ہو جس میں خدا کا خوف صاف جھلکتا ہوا دکھائی دے جس میں رسول اکرمؐ کی محبت کی صورت حقیقی طور پر موجود ہو جس میں مومن اپنے پورے احساس ذمہ داری سے دین حق کی پیروی کا اہتمام کرے اور پورے طور پر تابع فرمان الہی ہو جائے جو حکم و ہاں سے ملے اس پر پیل پڑے جس چیز سے روک دیا جائے اس چیز سے رک جائے کسی معاملے میں اس کی اپنی خواہش اور مرضی کا دخل نہ رہے بلکہ وہ پورے طور پر خدا و رسول کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

پھر اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق مرضی الہی کا تابع ہو جائے بلکہ اس میں اپنے مالک کے احکام اور اپنے آقا کے ارشادات کے ساتھ مکمل طور پر والہانہ لگاؤ پیدا ہو جائے کہ ان کے خلاف وہ کوئی دوسرا راستہ سوچ بھی نہ سکے۔ اس میں احکام الہی پر چلنے کے لئے والہانہ پن پیدا ہو جائے جیب تک اس کے مالک کا کلمہ بلند نہ ہو اس کے دل میں ایک لگن اور اس کے دماغ میں ایک ہمہ وقت اضطراب موجود رہے وہ خدا کے دشمنوں کے خلاف مسلسل اور پیہم تبلیغ و تلقین سے لے کر جان و مال کی قربانی تک ہمہ تن جدوجہد میں مشغول رہے۔ جیب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں داعی خفی کی وہ

صفات نمودار ہوتی ہیں جو اس راستے میں مطلوب ہیں۔ پھر وہ کسی کے ابھارنے اور اس کے کھانسنے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ خود کار مشین کی طرح اپنے مالک کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھنا چلا جاتا ہے اور اس کا وجود اللہ کی آیات میں سے ایک آیت بن جاتا ہے۔

کیا خوب کہا تھا ایک بزرگ نے کہ

”جب میں اپنے مالک کی اطاعت سے ذرا بھی انحراف کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے پیٹے کی گستاخی، اپنی بیوی کی غضب اور اپنی سواری کی سرکشی میں صاف دیکھ لیتا ہوں۔“

بلاشبہ تبلیغ دین ایک انسان سازی کا بڑا حکمت کا کام ہے اور اس میں پھوس پھوس اور بھونڈے طریقے سے کام نہیں کیا جاسکتا جو لوگ انسانی نفسیات کا لحاظ رکھتے بغیر صرف جبر و تشدد، طعن و تشنیع اور ملامت و نصیحت سے ٹیڑھے دلوں کو سیدھا کرنا چاہتے ہیں وہ بالعموم دلوں کو توڑتے دیتے ہیں، لیکن ان کو سیدھا نہیں کر سکتے اس لئے کہ دل کا دروازہ اندر کی طرف ہے اور اسے جب تک گھر کا مہین خود اندر سے نہ کھولے باہر کے کسی جبر سے کھولا نہیں جاسکتا۔ تبلیغ کا کام حکمت کا کام ہے اس کام کو احسن طریقے سے، ہی سرانجام دینے کا حکم دیا گیا ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بَالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

”اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیں اور افہام و تفہیم بھی احسن طریقے سے کریں۔“

البتہ ایک داعی حق کے لئے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ انسانوں کی تربیت کو بگاڑنے والی اور تبلیغ کی تاثیر کو خراب کرنے والی کونسی چیزیں ہیں۔ اگرچہ وہ بہت سنی باتیں ہیں لیکن ان میں بے صبری سب سے زیادہ نقصان دہ ہے جلد بازی اس سے بھی زیادہ مضر ہے اور سخت کلامی، درشت مزاجی اور تشدد

بیان تو سب سے زیادہ مہلک ہیں اس طرح اسے یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو دعوت دین سے بے نیاز اور لاپرواہ ہوتے ہیں اور بالعموم حق کی علمبرداری کے لئے آگے بڑھنے کے لئے نہ تیار ہوتے ہیں اور اس قابل ہوتے ہیں کہ دین کی علمبرداری کریں۔ یہ دنیا کی محنت میں اندھے لوگ، اقتدار کے نشے سے سرشار لوگ، منہ پرستی میں مبتلا لوگ، آرام و راحت کے دلدادہ لوگ اور خوف آخرت سے بے نیاز لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ حق کے کسی کام کے نہیں ہوتے اور داعی حق کے لئے ان کا جو کسی درجے میں بھی مفید معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسے یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے میں زیادہ آسانی سے دعوت حق کو قبول کر کے اس کے علمبردار بن جاتے اور حق کی پشت پناہی کے لئے اپنا سب کچھ لگانے کے لئے جلد آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سعید فطرت لوگ جو بات جیت سے شریعت، خدا ترس اور بھلے لوگ شمار ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کرنے والے اور سوتیلے بچہ کے عادی لوگ، جو ہر بات کی گہائی تک پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں حادثات و حوادث سے عبرت پکڑنے والے لوگ، دین کے طالب اور حق کے منشا نشی لوگ، آیات الہی پر غور کرنے والے لوگ، پیچ بولنے والے راست فکری کے عادی، باہمت جری اور بہادر لوگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک داعی حق ان اقسام کے لوگوں میں اپنی دعوت پہنچا کر زیادہ تعداد میں اپنے ساتھی فراہم کر سکتا ہے۔

اگر ان علمی تربیت کے اصولوں کو داخلی اصلاح و تزکیہ کے لئے اور عملی تربیت کے اصولوں کو خارجی تربیت و اصلاح کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ مناسب اخلاقی اور روحانی تربیت حاصل ہو جاتی ہے جس کی مدد سے دین حق کی تبلیغ و تشہیر اور اقامت و سر بلندی کا کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب تک کوئی شخص یہ صفات اپنے اندر پیدا نہ کرے وہ تبلیغ کے میدان میں نہیں نکل سکتا۔ یہ تو ایک اصلاحی معیار ہے جو بیان کیا گیا ہے در تبلیغ کے لئے نکلنا ہر مومن کا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کے لئے شخص اسی صلاحیت کا مکلف ہے جو

اسے مائل ہے اس کی کوشش کو قبول کرنے والا وہ مالک بیحد رحیم و کریم ہے
 وہ تو اتنا مہربان ہے کہ اس کا جو بندہ اس کی طرف پل کر جاتا ہے وہ اس کی طرف
 دوڑ کر جاتا ہے اور جو بندہ اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے وہ اس کے درجہ اس کے ہم و گمان
 سے بھی زیادہ بلند و بالا کر دینے والا آقا و مولیٰ ہے اس کی مہربانیوں اور بندہ نوازیوں
 کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔



داعی حق کے اوصاف

داعی حق کی خصوصیات | قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس میں ایک
داعی کی اہم خصوصیات کو اسی طرح بیان فرمایا
گیا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي
مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝

دو یعنی اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور
نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں،

اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے یہ چیز نگاہ میں رکھنی ضروری ہے
کہ یہ بات مکہ منظمہ کے حالات میں کہی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروؤں پر شدید مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ ایسے
عالم میں یہ کہنا اور اس بات کا اعلان کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ میں مسلمان ہوں
ایسی بات کہنا گویا اپنے اوپر درندوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا۔ ان
حالات میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ بہترین قول اس شخص کا ہے جو اللہ کی طرف
بلائے۔ دوسرے الفاظ میں ایک داعی حق کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی دعوت اللہ
کی طرف ہو۔ کوئی دنیاوی غرض اس کے سامنے نہ ہو، نہ وطنی، نہ قومی، نہ خاندانی اور
نہ مادی۔ کوئی دوسرا مقصد اس کے پیش نظر نہ ہونا چاہیئے۔ کوئی شخص خالص اللہ
کی طرف دعوت دے رہا ہو تو قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ایسے داعی کی اولین
خصوصیات یہ معلوم ہوتی ہیں کہ اسے اللہ کی توحید کی طرف دعوت دینی چاہیئے۔ اس بات

کی دعوت دینی چاہیے کہ خدا کے سوا کسی کی بندگی، کسی کی عبادت اور کسی کی پرستش نہ کی جائے۔ خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، خدا کے سوا کسی سے کوئی طمع نہ ہو، صرف خدا ہی کے احکام اور اس کے فرامین کی اطاعت اس کے پیش نظر ہو۔ اسی کے قانون کی پیروی مطلوب ہو۔ آدمی دنیا میں جو کام بھی کرے یہ سمجھنے ہوئے کرے کہ میں کس کا بندہ ہوں اور کس کے سامنے جا کر مجھے جوابدہی کرنی ہے۔ انسان کی تمام کوششوں اور ساری جدوجہد کا مرکز و محور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر اور اس کے ذریعے رضائے الہی کا حصول ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ داعی حق عمل صالح کی خوبی سے آراستہ ہو۔ یعنی نیک عمل کرے۔ اس فرمان پر ذرا بھی غور کیا جائے تو پورا مفہوم واضح ہو جائیگا یہ کہ دعوت دینے والے کا اگر اپنا عمل درست نہ ہو تو پھر اس کی دعوت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک انسان جس چیز کی طرف دعوت دے اسے اس کا عملی مجسمہ ہونا چاہیے اس کی اپنی زندگی میں خدا کی نافرمانی کا کوئی شائبہ تک نہ پایا جائے، اس کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں کہ کوئی شخص اس کے دامن پر ایک دھبہ تک نہ دکھا سکے۔ اس کے گرد و پیش کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کے دوست، اس کے عزیز و اقارب سب یہ جانتے ہوں کہ ہمارے درمیان یہ ایک نہایت بلند اور پاکیزہ کردار آدمی ہے۔

یہ تعلیم ہمیں قرآن پاک کے ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی قدم قدم پر ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی حیات طیبہ شہادت دیتی ہے کہ جب وہ خدا کی طرف سے دعوت حق دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو معاشرہ جس میں آپے پالیس سال سے موجود تھے۔ آپ کے عظیم الشان کردار کا شاہد تھا۔ اس معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو آپ کی بلند اخلاق کا قائل نہ ہو اور آپ کے ظاہر و باطن کی زندگی کا معترف نہ ہو۔ جو آپ کے جس قدر قرب تھا وہ اتنا ہی آپ

کا زیادہ معتقد تھا۔ جن افراد سے آپ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپ نہیں سکتا تھا انہوں نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

حضرت خدیجہ الکبریٰ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پندرہ سال سے آپ کی زوجیت میں تھیں اور وہ کوئی کم سن عورت نہیں تھیں بلکہ عمر میں آپ سے بڑی تھیں۔ جس وقت آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ ایک ایسی پختہ اسن رسیدہ اور دانشمند خاتون سے جس نے پندرہ سال سے اپنے شوہر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہو، شوہر کا کوئی عیب اس سے چھپ نہیں سکتا۔ دنیاوی اغراض کے لئے ایک بیوی اپنے شوہر کے ناجائز کاموں میں بھی شریک ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پر ایمان کسی صورت نہیں لا سکتی۔ عقیدہ بھی وہ یہ ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص خدا کا رسول ہو سکتا ہے یا اسے ہونا چاہیے۔ لیکن حضرت خدیجہ آپ کی اس حد تک معتقد تھیں کہ جب آپ نے نبوت کی بشارت کا ماجر بیان فرمایا تو انہوں نے ایک لمحے کا تامل کئے بغیر اسے تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد قریب ترین مثال حضرت زید بن حارث کی ہے۔

ظاہر ہے کہ قریب سے دیکھنے والے دوسرے شخص حضرت زید بن حارث ہی تھے جو غلام کی حیثیت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں آئے تھے تو پندرہ برس عمر تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہوا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر تیس سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پندرہ سال انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہ کر ہر طرح سے اور ہر پہلو سے آپ کی زندگی کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی شہادت ایک خاص صورت واقعہ میں سامنے آتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ بچپن میں والدین سے بچھڑ گئے تھے، اور خدا کی قدرت نے انہیں حضور تک پہنچا دیا۔ جب ان کے والدین اور ان کے چچا کو معلوم ہوا کہ ہمارا بیٹا فلاں جگہ غلامی کی زندگی بسر کر رہا

ہے تو وہ مکہ معظمہ آئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے آکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ:

”آپ کا احسان ہوگا، اگر آپ ہمارے اس بیٹے کو آزاد فرمادیں“

آپ نے فرمایا کہ:-

”میں لڑکے (زید) کو بلا لیتا ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو میں آپ کے ساتھ روانہ کر دوں گا، اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو میرے ساتھ رہنا چاہے تو اسے زبردستی اپنے سے علیحدہ کر دوں۔“

آپ کی اس بات کے جواب میں، انہوں نے کہا کہ آپ نے بہت انصاف کی بات کہی ہے۔ آپ زید کو طلب فرمائیے۔ جب حضرت زید ان کے سامنے آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟

حضرت زید نے کہا:-

”جی ہاں! یہ میرے والد اور چچا ہیں“

آپ نے فرمایا کہ:

”یہ تمہیں گھر واپس لے جانے کے لئے آئے ہیں، تم جانا چاہو تو بڑی خوشی سے ان کے ساتھ جا سکتے ہو۔“

ان کے والد اور چچا نے بھی یہی کہا کہ ”ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں۔“

حضرت زید بن حارث نے کہا کہ:

”میں نے ان میں (حضور کی طرف اشارہ) ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ جن کے بعد انہیں چھوڑ کر میں اپنے باپ اور چچا اور رشتہ داروں کے پاس جانا نہیں چاہتا۔“

یہ تھی آپ کے اخلاق کے بارے میں آپ کے خادم کی گواہی۔ ایک خادم احسان مند تو ہو سکتا ہے لیکن اتنا متاثر اور گرویدہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے مخدوم پر ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کردار کی ایسی بلندی اور اخلاق کی ایسی پاکیزگی دیکھی ہو کہ جس کے بعد اسے یہ ماننے میں خداتامل نہ ہو کہ میرا مخدوم نبی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ حضرت زینہ بن حارث کسی معمولی قابلیت کے آدمی نہیں تھے، مدینہ طیبہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت قائم ہوئی تو انہیں پکھنٹ قوجی مہمات میں لشکر مجاہدین کا سالار بنایا گیا۔ یہ گواہی ایسی قابلیت کے انسان کی گواہی تھی۔

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہیں نبوت سے پہلے بیس سال تک ایک گہرے دوست کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا موقع ملا، ان کی نشست و برخاست آپ کے ساتھ تھی اور مکہ معظمہ میں سب سے زیادہ جن دو آدمیوں کی دوستی تھی ان میں سے ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ایک دوست اپنے دوست کو پسند کر سکتا ہے، اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔ لیکن کبھی اتنا معتقد تو نہیں ہو سکتا کہ اس کو نبی مان لے۔ حضرت صدیق کا بلاتامل آپ کو نبی مان لینا ظاہر کرتا ہے کہ بیس سال کی ایک طویل مدت کے دوران میں انہوں نے آپ کو اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کا مجسم نمونہ پایا۔ حجب ہی تو انہوں نے یہ تسلیم کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ اتنے بلند کردار کا آدمی یقیناً نبی ہو سکتا ہے اور اس کو نبی ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد حضرت علیؑ آتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام میں نے پہلے اس لئے نہیں لیا کہ اس وقت وہ دس سال کے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی۔ لیکن دس سال کا بچہ بھی جس کے گھر میں ہو جس کے پاس رہتا ہو اس

کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے خصوصاً اتنا دھین انسان جیسا کہ حضرت علیؓ اپنی خصوصیات کی بنا پر آگے چل کر ثابت ہوئے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچپن میں بھی یقیناً اتنی ذہانت رکھتے تھے کہ جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین بچے کا اس بات کو مان لینا اس کے یقیناً ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپؐ کی شفقت آپؐ کے انتہائی پاکیزہ اخلاق و کردار سے واقف تھا۔

اس لئے عمل صالح کے سلسلہ میں ان اعلیٰ مثالوں سے معلوم ہوا کہ انسان جس چیز کو پیش کر رہا ہو۔ اس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس دعوت کے مطابق بسر ہو رہی ہو وہ اتنے پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار کا مالک ہو کہ جب وہ اللہ کے راستے کی طرف جانے کے لئے اُٹھے تو اس کی بات میں وزن ہو۔ اور اس کے قول میں اثر ہو۔ اس کا عمل شہادت دے اور لوگ تسلیم کریں کہ یہ واقعی اپنے قول میں سچا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ لوگ اس چیز کو مانیں یا نہ مانیں۔ لیکن یہ تو ان کو ماننا پڑے گا کہ یہ آدمی اپنے قول میں سچا ہے جو کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ اس بنا پر کہہ رہا ہے کہ وہ اس نظریے، اس اصول اور اس دعوت کا حامل ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن ابو جہل نے ایک مرتبہ خود کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تم کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جو تم لائے ہو جھوٹا کہتے ہیں۔ یعنی آپؐ کا بدترین دشمن بھی آپؐ کی صداقت کا قائل تھا پس ایک داعی کی دوسری بڑی خصوصیت اس کے قول و فعل کی مطابقت ہے یہ بلندی کردار ہے اور یہ پاکیزگی اخلاق ہے۔

تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی **وَقَالَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ** (یعنی وہ کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں اسے سمجھنے کے لئے مکہ معظمہ کا وہ ماحول پیش نظر رہنا چاہیئے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کسی فرد کا اٹھ کر یا اعلان کرنا کہ میں مسلمان ہوں، کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ زندگی کو اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا۔ تو داعی حق کی یہ خصوصیت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہو، نہ صرف پاکیزہ عمل رکھنے والا ہو، بلکہ وہ بدترین

دشمنوں اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اپنے مسلمان ہونے سے انکار نہ کرے
 اپنے مسلمان ہونے کو چھپائے نہیں۔ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اور اقرار کرنے میں
 وہ نہ شرمے، نہ جھکے اور نہ ڈرے۔ بلکہ کھلم کھلم یہ کہے کہ ”ہاں میں مسلمان ہوں
 جو کچھ جس کا جی چاہے کرے“ دوسرے الفاظ میں داعی حق کی تیسری بڑی اور اہم
 خصوصیت یہ ”نی چاہیے کہ وہ نہایت بڑی آدمی ہو، نہایت بہادر آدمی ہو۔
 کسی بزدل آدمی کا کام نہیں ہے کہ وہ خدا کے راستے کی طرف دعوت دے۔ جو ذرا
 سی چوٹ لگنے پر بلے کی طرح بیٹھ جائے والا ہو ایسا انسان کہی خدا کے راستے کی طرف
 نہیں بلا سکتا۔ خدا کے راستے کی طرف دعوت جو شخص دے سکتا ہے وہ وہ
 ہے جو سخت سے سخت دشمنی کے ماحول میں، مخالفت کے ماحول میں، خطرات
 کے ماحول میں اسلام کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس
 کے نتائج کیا ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ذات، اس شجاعت
 کا ایک مکمل اور عملی نمونہ ہے مگر معظمہ میں کھلم کھلا آپؐ نے دعوت اسلام پیش کی
 شہادت حق کا فریضہ انجام دیا اور ان لوگوں کے درمیان یہ کام جاری رکھا، جو آپؐ
 کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے، اور جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو ظلم و تشدد
 کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ آپؐ مسلسل تیرہ سال تک اس ماحول کی تمام
 تر تاریکیوں، سختیوں اور مصیبتوں کے درمیان اپنی دعوت پیش کرتے چلے گئے
 پھر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد جو حالات پیش آئے جن خطرناک اور بڑی بڑی ٹرائیوں
 سے سابقہ پیش آیا، ان میں بھی آپؐ کا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ غزوہ حنین کے
 موقع پر جب کہ مسلمانوں کو تقریباً شکست ہو چکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نہ صرف اپنے مقام پر موجود رہے بلکہ میدان جنگ میں برابر آگے دشمن کی
 صفوں کی طرف بڑھتے چلے گئے اور اس بات کو چھپایا بھی نہیں کہ ”میں کون ہوں
 آپؐ فرما رہے تھے۔“

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ

”میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں۔ میں ابن عبدالمطلب ہوں۔“
یہ اعلان آپؐ اس جنگ میں ایسے حالات کے دوران میں کر رہے تھے جب آپؐ دشمنوں کے نسخے میں تھے اور ساتھ صرف دو تین ساتھی رہ گئے تھے اس وقت بھی یہ کہا کہ ”ہاں! میں نبی ہوں“ اس سے ظاہر ہوا کہ ایک داعی خلی کو اتنا شجاع اور انبیاہاد ہونا چاہیے جو اللہ کی راہ کی دعوت دینے کے لئے کھڑا ہو۔ اگر داعی میں ہمت، شجاعت، استقامت اور بہادری کا جو سہرہ ہو تو وہ اس راہ میں کھڑا ہو نہیں سکتا، اور اگر کھڑا ہو بھی جلتے تو اپنی بزدلی کی وجہ سے الٹا اس مشن کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔“

دعوت اسلامی کے کام کیلئے شخصی اور جماعتی اوصاف

داعی کے اوصاف کے بعد اب میں مختصر طور پر آپؐ کو بتاؤں گا کہ وہ کم از کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے لئے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں، جن کے بغیر ایک داعی حق اپنا فریضہ دعوت ادا نہیں کر سکتا۔

شخصی اوصاف | شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پٹلے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنائے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

”الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ“
”حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے“

یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لئے نکلیں اس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے اگر یہ باغی آپ کے اندر پیل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رخصتے الہی کی مخالفت اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلان جنگ کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے باہر اتنا شراب کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہمارا ہی تحریک کے لئے تباہ کن ہے پہلے خود خدا کے آگے سر جھکائیے، پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجئے۔

۲۔ جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے، ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑنا نہیں ہے بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے اصلی مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لئے کہ اس کے وطن میں قانون الہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرمانبرداری ہی اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔ یہ حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے۔ بطور مثال ایک حدیث کو لیجئے۔ آنحضورؐ سے پوچھا گیا کہ:

ای الہجرۃ افضل یا رسول اللہ

یا رسول اللہ کون سی ہجرت افضل ہے؟

جواب ملا:

ان تعجزوا کما کرہ ربکم

یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترک وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اسی لئے یہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیے اور اصطلاحی کفار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنائیے۔ اس معنی کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ

حدیث نبوی کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنائیے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور کتنا ہی گھومے پھرے بہر حال اس حد سے آگے نہیں جاسکتا جہاں تک رسی اسے جانے دیتی ہے۔

مثل المومنین و مثل الایمان کمثل الفرس فی اخیتہ یجول ثم

یرجع الی اخیتہ

ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو میدان میں گھومتا ہے، ہر کیفیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں بہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم یہ اٹھائیے کہ اپنے قریبی ماحول سے جسے میں ”ہوم فرنٹ“ کہوں گا، لڑنا شروع کر دیجئے گھر کے لوگ، اعزہ، دوست اور سوسائٹی جس سے آپ کا گہرا رابطہ ہے، ان سب سے ایک عملی کش مکش شروع ہو جانی چلیئے۔ کش مکش اس معنی میں نہیں کہ آپ اپنے متعلقین سے کشتی لڑیں، یا ان سے ٹوٹوئیں میں اور مناظرہ شروع کر دیں بلکہ یہ کشمکش اس معنی میں ہونی چاہئے کہ آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصول و ضوابط کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابند اصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں۔ آپ کی بیویاں آپ کی اولادیں، آپ کے والدین، آپ کے رشتہ دار اور دوست آپ کے رویہ کے خلاف مزاحمت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ جائیں جہاں آپ کسب معاش کے لئے کام کرتے ہوں وہاں آپ کا وجود نمایاں طور پر کھٹکے لگے۔ دفتر کی آرام وہ گریس پر پیٹھ کر جاہ و ترقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں

آپ کے لئے انگاروں کی انگیٹھی بن کر رہ جائے۔ غرض جو قہنا زیادہ قریبی ہو اس سے اتنا ہی پہلے تصادم شروع ہو جانا چاہیئے۔ جس شخص کے گھر میں میدان جہاد موجود ہو وہ آخر چند میل کے فاصلہ پر ہی کیوں لٹنے جلے۔ پہلا معرکہ تو گھر ہی سے شروع ہونا چاہیئے۔ اب تک جہاں جہاں اس کش مکش کی اطلاعات آرہی ہیں وہاں کے لوگوں سے مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آرہی ہیں وہاں کے لئے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔

مگر میں بروقت یہ واضح کر دوں کہ یہ ساری کش مکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیئے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام تر جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر اخلاص ہوتا ہے دشمنی نہیں ہوتی۔ اس کی نفرت اور اس کا غصہ بالکل مرض کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ مریض کے خلاف۔ بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لائیے۔ وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیق سے دیکھا جا رہا ہے یا براہ راست اس کی ذات سے دشمنی کی جا رہی ہے بلکہ وہ آپ کے اندر انسانی ہمدردی، محبت اور اخوت کو کام کرتا ہوا پائے۔

..... فی الحقیقت اصلی تبلیغ تقریری اور تحریری مناظروں سے ہمیں ہوا کرتی۔ یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنیٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور اور نمونہ ہوں۔ جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے یہ نمونہ گزر جائے وہ آپ کے طرز عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کی راہ کے راہی۔ جس طرح کوئی ”فنائی اسکا نگرہیں“ آدمی سامنے آجاتا ہے تو کانگریسیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اسی طرح آپ ایسے فنائی الاسلام بن جائیئے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے یہی وہ چیز ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

اِذَا رَوَّوْا ذَكَرَ اللّٰهُ

میں یہ نہیں کتا کہ ایسا فوراً ہو جانا چاہیے۔ یہ مقام تو تدریجاً ہی حاصل ہو گا۔ خدا کی راہ میں جیب اپنے ماحول سے پیہم آپ کا تضاد ہو تا رہے گا اور آپ ہر آن، ہر لمحہ اپنے مقصد کے لئے کوشش کرتے ہوئے قربانیاں دیتے رہیں گے تو ایک مدت میں جاکر فائدہ کی کیفیت آپ پر طاری ہوگی اور آپ اپنی دعوت کا حجم ظہور بن سکیں گے۔ اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کا گہری نظر سے بار بار مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کے آدمی تیار کیا کرتے تھے۔ وہ کیا صفات تھیں جو تحریک کے کارکنوں میں پیدا کی گئیں۔ دنیا کے سب سے بڑے مز کی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انسان تیار کئے تھے انہیں ۵ برس کی تیاری کے بعد میدان میں لایا گیا۔ اس تیاری کی تفصیلات معلوم کیجئے اور دیکھئے کہ یہ کس تدریج کے ساتھ ہوئی تھی، اس میں کن صفات کی پرورش مقدم تھی اور کن کی مؤخر، کون سی صفات کس درجہ میں مطلوب تھیں اور انہیں کس حد تک ترقی دی گئی تھی اور کس مقام پر پہنچ کر اس جماعت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم دنیا کا بہترین گروہ بن گئے ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ نوع انسان کی اصلاح کے لئے بکھلو۔ یہی نمونہ خود اپنی تیاری کے لئے بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیئے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ میں صرف دو حدیثیں آپ کی رہنمائی کے لئے پیش کروں گا جن سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کام کے لئے کن صفات کے آدمی درکار ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ،

مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَابْغَضَ لِلّٰهِ وَاعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ -

یعنی آدمی پورا مومن اس وقت بنتا ہے جب اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی دوستی اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ ہو خالص اللہ کیلئے ہو نفسانی اور دنیوی محرکات اس کے لیے ختم ہو جائیں۔ دوسری حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

امرو فی رجبی جتسم میرے رب نے مجھے نوجیزوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ خشیتہ اللہ فی السر والعلانیۃ کھلمے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرنا ہوں

۲۔ وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف قصہ

میں ہوں ، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں ۔

۳۔ والقصد فی الفقر والغنا خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت

میں ، ہر حال راستی و اعتدال پر قائم رہوں ،

اور یہ کہ جو تجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں

۴۔ وان اصل من قطعنی

اور جو تجھے مجھ کو مکرے میں اسے دوں

۵۔ واعطی من حرمنی

اور جو تجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کروں

۶۔ واعفو من ظلمنی

اور یہ کہ میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو

۷۔ وان یکون صمتی فکرا

اور میری گفتگو ذکر الہی کی گفتگو ہو۔

۸۔ ونطقتی ذکرا

اور میری نگاہ، عبرت کی نگاہ ہو

۹۔ ونظری عبرۃ

ان اوصافِ مطلوبہ کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

کہ ان امریاء المعروف وانہی عن المنکر یعنی تجھے حکم دیا گیا ہے کہ

میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں ، معلوم ہوا کہ نیکی کو پھیلانے اور

بدی کو ختم کرنے کے لئے جو امت و سطات میں اس کے فرد فرد ہیں یہ اوصاف

ہونے چاہئیں۔ اپنی اوصاف کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے ، یہ نہ ہوں تو

ہم کبھی اپنے منصب کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے ۔

جماعتی اوصاف

یہ تو شخصی اصلاح کا پروگرام ہوا۔ اس سے آگے اجتماعی حیثیت سے

کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے ، جماعتی نظم کو مستحکم اور کارگر

بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ارکان جماعت کے درمیان محبت و ہمدردی ہو۔
 باہمی آپس میں حسن ظن ہو۔ بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو۔ آپس میں کام
 کرنے کی صلاحیت ہو۔ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت
 ہو۔ خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں
 یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لئے ناگزیر ہیں۔ ورنہ اگر فرداً فرداً
 سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفات حسنہ اپنے اندر پیدا کر لیں، لیکن
 منظم و مربوط نہ ہوں۔ آپس میں متعاون نہ ہوں۔ شانہ سے
 شانہ ملا کر نہ چل سکیں۔ تو ہم علمبردارانِ باطل کا بال تک
 بیکا نہیں کر سکتے۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان ہم
 میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور اگر آج ہم
 دنیا بھر کو چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہوں
 گے۔ تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جاسکے۔
 مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے، جن لوگوں
 نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے، انہوں نے
 زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد پر اپنا اثر پھیلا
 دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہو گئے یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔

۲۳۱

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اصول کی مکمل تشریحات موجود ہیں پھر بہر بن نبویؐ اور سیر الصحابہ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجئے اور ناپ تولی کر دیکھئے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے۔ اور اس کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجئے۔

صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لامحالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسن ظن، ہمدردی، ایثار اور واداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف تعاون کو چار دن بھی جاری نہیں رہنے دے گا۔ جماعتی نظم جتنا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لئے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لئے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی نہ بان پر نہ لانا چاہیئے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کے ضروری اوصاف

میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قرآن و حدیث میں مفصل تذکرہ موجود ہے صرف تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک ایک مطلوبہ صفت کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ وہ کس نوعیت

اور کس درجہ کی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں احکام و ہدایات کو جمع کیجئے اور سمجھئے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ میں مختصر ان کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے صبر ہے۔ صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دنیا کے لئے مجاہدہ کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے پہلا صبر ناگزیر صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے دشواریوں اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلہ میں استقامت دکھائی جائے اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو تب بھی ہمت نہ ہاری جائے اور بہم سعی جاری رکھی جائے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات اور خوف و طمع کے مواقع بھی اگر پیش آجائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی صبر ہی کا ایک شعبہ ہے کہ اشتیاق جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے، جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائے۔ ہمیشہ سکون، صحت عقل اور ٹھنڈی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔ پھر حکم صرف صبر ہی کا نہیں مصابرت کا بھی ہے، یعنی مخالفت طاقیتیں اپنے باطل مقاصد کے لئے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اسی لئے ”اصبر و“ کے ساتھ ”مصابر و“ کا حکم بھی دیا گیا ہے جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ حق کی علمبرداری کے لئے اٹھنے کا داعیہ رکھتے ہیں ان کے صبر کا اپنے صبر سے موازنہ کیجئے اور سوچئے کہ آپ کے صبر کا کیا تناسب ہے؟ شاید ہم ان کے مقابلہ میں ۱۰ فی صدی کا دعویٰ کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ باطل کے غلبہ کے لئے جو صبر وہ دکھا رہے ہیں ان کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی باطل کیلئے جنگوں حالات پر نظر ڈالئے۔ کس طرح وقت آپ بڑے پران لوگوں نے اپنے ان کارخانوں شہروں

اور ریلوے اسٹیشنوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹک ڈالا جن کی تعمیر و تیاری میں سالوں کی محنتیں اور بے شمار روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ یہ ان ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو فوجوں کو اپنے آہنی پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں یہ دشمن کے ان بمباریوں کے سامنے بین استقامت سے کھڑے رہتے ہیں جو موت کے پر لگا کر اڑتے ہیں۔ جب تک ان کے مقابلہ میں ہمارا صبر ۱۰۵ فیصدی کے تناسب پر نہ پہنچ جائے ان سے کوئی ٹکر لینے کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ جب سروسامان کے لحاظ سے ہم ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر سروسامان کی کمی کو صبر ہی سے پورا کیا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری چیز جو مجاہدہ کا لازمہ ہے، ایثار کی صفت ہے۔ وقت کا ایثار، محنتوں کا ایثار اور مال کا ایثار؛ ایثار کے اعتبار سے بھی باطل کا جھنڈا اٹھانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں۔ حالانکہ بے سروسامانی کی تلافی کے لئے ہمیں ایثار میں بھی ان سے میلوں آگے ہونا چاہیئے۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ ایک شخص میں پیچاس، سو اور ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے عوض اپنی پوری صلاحیتیں خود اپنے دشمن کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس طرح ہماری قوم کا کارآمد جو ہر بے کار ہو جاتا ہے یہ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ ایک بڑی آمدنی کو چھوڑ کر یہاں محض بقدر ضرورت قلیل معاوضہ پر خدمتِ حق کے لیے اپنی خدمات پیش کرے۔ پھر فرماتے کہ اگر یہ لوگ اتنا ایثار بھی نہ کریں گے اور اس راہ میں پتہ مار کر کام نہ کریں گے تو پھر اسلامی تحریک کیسے پھل پھول سکتی ہے ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک محض والیٹیروں کے بل پر نہیں چل سکتی۔ جماعتی نظم میں والیٹیروں کو اسی درجہ کی اہمیت حاصل ہے جیسی ایک آدمی کے نظامِ جسمانی میں پاؤں اور ہاتھ کو ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضاء کس کام کے ہو سکتے ہیں اگر ان سے کام لینے کے لئے دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے دماغ موجود نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں والیٹیروں سے کام لینے کے لئے اعلیٰ درجہ کے جنرل چاہئیں مگر مصیبت یہ ہے کہ جن کے پاس دل اور دماغ کی قوتیں ہیں وہ دیوبی ترقیوں کے دلدادہ ہیں اور مارکیٹ میں اسی کی

طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کر سکیں اس ایشیا کو لے کر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفسدین عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں مانوں کا ایشیا کر رہے ہیں۔ ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

(۳) مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے تیسری صفت، دل کی لگن ہے۔ محض دماغی طور پر ہی کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہو جانا، یہ اس راہ میں اقدام کے لئے صرف ایک ابتدائی قدم ہے لیکن اتنے سے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ بھڑک اٹھے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جایا کرتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے، یا اتنی جتنی گھر میں غلہ نہ پا کر بھڑکتی ہے اور آدمی کو ہنگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھتے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے، دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھینچیں کوشش کیجئے کہ آپ اپنی ذات کے لئے اپنی قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصد حیات کے لئے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہوگی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے، محض ندرانی جمع خزانے سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ تن من و جھن سے اس کام میں شریک ہوں میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں، حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے

یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں مُض دماغی اطمینان کی بنا پر شریک جماعت تھا۔ مگر اب یہ چیز دل میں اتر گئی ہے اور اس نے نہایتِ روح پر قبضہ جما لیا ہے میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود تنقید کر کے دیکھے کہ ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اس کے دل میں مقصد کے عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن ہوتی ہے وہاں کسی تھیلے اور کسانے کی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورت حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک رکن پیچھے ہٹ گیا یا نقل مقام پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوٹ ہو گیا۔ بخلاف اس کے پھر تو ہر شخص اس طرح کام کرے گا جس طرح وہ اپنے بچے کو بیمار یا کر لیا کرتا ہے۔

خدا نخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکل کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ غدر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ بیٹھیں کہ کوئی بیمار دار نہیں، کوئی دوالانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں اگر کوئی نہ ہو تو آپ خود سب کچھ بنیں گے کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے سو تیلہ باپ تو بچے کو مرنے کے لئے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے بچے کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا اس کے نودل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی ماہی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرنے دیں اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں، یہ سب باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سر بلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سونپلا رشتہ ہے حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچہ سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ ایسی بری پسپائی ہوگی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے

طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کر سکیں اس ایثار کو لے کر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفیدین عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں مانوں کا ایثار کر رہے ہیں۔ ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

(۳) مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے تیسری صفت، لگن کی لگن ہے محض دماغی طور پر ہی کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہو جانا، یہ اس راہ میں اقدام کے لئے صرف ایک ابتدائی قدم ہے لیکن اتنے سے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ بھڑک اٹھے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہیے جتنی اپنے بچے کو، بیمار دیکھ کر ہو جایا کرتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے، یا اتنی جتنی گھر میں غلہ نہ پا کر بھڑکتی ہے اور آدمی کو تنگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھتے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے، دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھینچیں گوشش کیجئے کہ آپ اپنی ذات، کئے لئے اپنی قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصد حیات کے لئے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہوگی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے، محض ذہنی جمع خزانے سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ تن من دھن سے اس کام میں شریک ہوں میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں، حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے

یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں محض دماغی اطمینان کی بنا پر شریک جماعت تھا۔ مگر اب یہ چیز دل میں اتر گئی ہے اور اس نے نہایت خاندان روح پر قبضہ جما لیا ہے میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود تنقید کر کے دیکھے کہ ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اس کے دل میں مقصد کے عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن ہوتی ہے وہاں کسی ٹھیلے اور اکسانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورت حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک رکن پیچھے ہٹ گیا یا نقل مقام پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوڑھٹ ہو گیا۔ بخلات اس کے پھر تو ہر شخص اس طرح کام کرے گا جس طرح وہ اپنے بچے کو بیمار پا کر کیا کرتا ہے۔

خدا نخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکل کبھی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ غدر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ بیٹھیں کہ کوئی تیمار دار نہیں، کوئی دوا لانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں اگر کوئی نہ ہو تو آپ خود سب کچھ بنیں گے کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے سو تیل یا پتہ تو بچے کو مرنے کے لئے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے بچے کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا اس کے تودل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی نااہلی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرنے دیں اور اپنے دوسرے مشاغل میں بھاگ کر منہمک ہو جائیں، یہ سب باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سرمدی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سونیلا رشتہ ہے حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لٹا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بڑے بھائی سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ ایسی بری پسپائی ہوگی کہ مدلوں تک ہماری نیلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے

سے پہلے اپنی قوت قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجئے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجئے۔

(۴) چوتھی ضروری صفت اس راہ میں یہ ہے کہ ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور مضبوط ، (systematic) طریقہ سے کام کرنے کی عادت ہو۔ ایک مدت دراز سے ہماری قوم اس طریق کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے، جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو۔ چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرنا بغارت ہو کہ رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے اس کی جگہ تدریج اور بے ہنگام کام کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، جو بجائے خود ضروری ہو، اگر آپ کے سپرد کر دیا جائے تو بغیر کسی نمایاں اثر معجزاتیہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی کام میں کھیادیں۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں رہا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے ایک وقت کی میدان آرائی کے لئے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نظر میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔

واعی سخن کے ان اوصاف کے بارے میں اب ہم براہ راست قرآن کی رہنمائی کی طرف آتے ہیں

اہل باطل اہل حق کو ہلکا نہ پائیں

فَاَصْبِرَانْ وَعُدَالِهٖ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخَذَنَّ
الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَكَ مِنْهُ - الروم - ۶۰

صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

”اللہ کا وعدہ سچا ہے“ اس سے اشارہ ہے اس وعدہ کی طرف جو اسی سورۃ آیت ۶۰ میں گزر چکا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی بیانات کا مقابلہ تکذیب و تضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے۔ (فَاَنذَرْتَنَّا مِنْ الَّذِينَ لَا يَرْجِعُونَ) اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نصرت فرمائے (وَيُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَيُعْظِمْ لَهُمْ ثَوَابَهُمْ) (حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ)

۱۔ ہلکا نہ پائیں یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ یا ان کی بہتان و افترا کی مہم سے تم مسحوب ہو جاؤ یا ان کی چھٹیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزا سے تم پست ہمت ہو جاؤ یا ان دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ یا ان کے دیئے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کمر ہے میں ان کی بنا پر تم ان کے ساتھ مصالحت کر لینے پر آمادہ اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوش مند اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عزم میں اتنا راسخ، اور اپنے کیرکڑ میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جاسکے نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جاسکے، نہ کسی قیمت پر تمہیں خرید جاسکے نہ قریب سے تم کو پھسلا جاسکے نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے اور نہ دین کے معاملہ میں کسی دین کا سودا تم سے چکایا جاسکے یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلامِ بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ ”یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں“ اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثنایت ہوئے جیسا اللہ تعالیٰ اپنے آخری نبی کو بھاری بھرم دکھانا چاہتا تھا۔ آپ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی اس نے اسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیت عظمیٰ نے وہ انقلاب برپا کر کے دکھا دیا جسے روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی طاقت اور وسائل صرف کر دیئے اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے

وَإِنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝۲۱۷ الشعراء

اقربا کو اولین دعوت ”اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ“

یعنی خدا کے اس بے لاگ دین میں جس طرح نبی کی ذات کے لئے کوئی رعایت نہیں اسی طرح نبی کے خاندان اور اس کے قریب ترین رشتہ داروں عزیزوں کے لئے بھی کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (MERITS) کے لحاظ سے ہے کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا مگر ابی و بد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لئے یکساں ہے ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں اس لئے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف متنبہ کر دو، اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آ سکے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کے پکار پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا نبی عبدالمطلب یا عباس یا صفیہ عمتہ رسول اللہ یا فاطمہ بنت محمد انقذوا انفسکم من النار فانی لا املك لکم من اللہ شیئاً سلو فی

من مالی ما شتمہ۔ اے بنی عبدالمطلب، اے عباسؓ، اے صدیق رسول اللہؐ کی پھوپھی اے
 ناظمہ محمدؐ کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو
 نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے جو چاہو مانگ سکتے ہو۔ پھر آپ نے صبح سویرے صفا
 کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا یا صبا حاہ (ہائے صبح کا خطرہ)
 اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لوی، اے بنی مرہ، اے آل قصی، اے بنی
 عبدمناف، اے بنی عبدشمس، اے بنی ہاشم، اے آل عبدالمطلب اسی طرح قریش کے
 ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا
 کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا وہ
 اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے
 چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکا اس
 نے اپنی طرف سے کھاکو خبر لانے کے لئے بھیج دیا جب سب لوگ جمع ہو گئے تو
 آپ نے فرمایا، ”لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اسی پہاڑ کے دوسری طرف ایک
 مہادی لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟“
 سب نے کہا ہاں ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو آپ
 نے فرمایا ”اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں، اپنی
 جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی
 کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے، ایسا نہ ہو کہ دوسرے
 لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پہاٹھائے ہوئے آؤ۔ اس
 وقت تم پکارو گے یا محمدؐ، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں، البتہ
 دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی
 کروں گا۔“ اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور
 تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عید بن عباسؓ، حضرت
 زبیر بن عمو اور حضرت قبیصہ بن مخارق سے مروی ہیں۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں آنذر عشتیوتک الا فریبین۔
 کا حکم آیا اور حضور نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے یس اس کی تعمیل کر دی دراصل
 اس میں جو اصول واضح کیا گیا تھا کہ دین میں بنی اور اس کے خاندان کے لئے
 کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں جو پیر زہر قاتل ہے
 وہ سب ہی کے لئے قاتل ہے بنی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود
 بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے پھر ہر خاص و عام کو قہنہ کر دے
 کہ جو بھی اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے
 لئے نافع ہے بنی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور
 عزیزوں کو اس کی تلقین کرے تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں
 ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ بنی اپنی دعوت میں مخلص ہے اسی طریقے پر بنی صلی
 اللہ علیہ وسلم زندگی بھر عامل رہے فتح مکہ کے روز جب آپ شہر میں داخل ہوئے
 تو آپ نے اعلان کیا کہ کل رہا فی الجاہلیۃ موضوع تخت قدمی ہائین داوّل ما
 اضعہ رب العباس زمانہ جاہلیت کا ہر سودو جو لوگوں کے ذمہ تھا میرے ان
 قدموں کے تلے روند ڈالا گیا اور سب سے پہلے جس سودو میں ساقط کرتا ہوں
 وہ میرے چچا عباس کا ہے (واضح رہے کہ سودو کی حرمت کا حکم آنے سے
 پہلے حضرت عباسؓ سود پر روپیہ چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سود اس وقت
 لوگوں کے ذمہ وصول طلب تھا) ایک مرتبہ چوری کے برہم میں قریش کی ایک
 عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپ نے حکم دیا حضرت اسامہ بن زید نے اس
 کے حق میں سفارش کی اس پر آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری
 کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

”اے بنی! تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ
مداہنت سے پرہیز تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا نون) سنا دو
 کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے (اور اگر تم کسی کی خاطر اس

میں رد و بدل کرو گئے تو اس سے بچ کر بھاگنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہ پاد گئے اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کر دیا۔ جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صیغہ و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیر دیکھا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

”جائے پناہ نہ پاد گئے“ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے کی خاطر قرآن میں کچھ رد و بدل کر دینے اور سردارانِ قریش سے کچھ کم و بیش پر مصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے منع فرما رہا تھا بلکہ دراصل اس میں روئے سخن کفار کے کی طرف ہے اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حکام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اسے بے کم و کاست پہنچا دیں۔ تمہیں ماننا ہے تو اس پرورے دین کو جو ان کا توں مانو جو خداوند عالم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو مگر یہ امید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمہیں راضی کرنے کے لئے اس دین میں تمہاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو یہ جواب ہے اس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمہاری پوری بات مان لیں، آخر کچھ تو ہمارے آبائی دین کے عقائد اور رسم و رواج کی رعایت ملحوظ رکھو کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمہاری مان لیں۔ اس پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے اور برادری چھوٹ سے بچ سکتی ہے قرآن میں

ان سے اس مطالبے کا متعدد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا گیا ہے
مثال کے طور پر سورہ یونس کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو۔ وَادْأْتَنَّا بِكُمُ الْبَحْرَ مَلْجَأً
قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا رَبِّ يَوْمَئِذٍ غَيْرُ هَذَا اَوْ بَدِّلْهُ لے محبوب ہماری
آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو کبھی ہمارے سامنے حاضر
ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لا دیا اس
میں کچھ ترمیم کرو۔

”کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو“ یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ
جھکو اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو، یہاں ”اطاعت“ کا لفظ
اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

”اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے“ یہاں پہنچ کر
صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت
سے ارشاد فرمائے ہیں۔ اصحاب کہف کے جو واقعات بیان ہوئے تھے ان میں
یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے کس طرح اٹھ کر دو ٹوک بات
کہہ دی کہ ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے“ اور پھر کس طرح
وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوتے بلکہ انہوں نے پورے عزم کے
ساتھ کہا کہ ہم اس کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکارتے گے“ اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے حیائی
کریں گے“ اور کس طرح انہوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی
سہارے اور بغیر کسی سرو سامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا۔ مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق
سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب
بھی انہیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدا نخواستہ ہماری قوم ہم کو اپنی ملت کی طرف
پھیر لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ ان واقعات کا ذکر

کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ اور سنانا دراصل
مخالفین اسلام کو مقصود ہے۔ کہ ان مشرکین اور منکرین حق سے مصالحت قطعاً خارج
از بحث ہے جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے اسے بے کم و کاست ان کے سامنے
پیش کر دو، مانتے ہیں تو اور نہیں مانتے تو خود برا انجام دیکھیں گے جنہوں نے مان لیا ہے۔
خواہ وہ کم سن نوجوان ہوں، یا بے مال و زرقعیر یا غلام اور مزدور، بہر حال وہی قسم
ہیں انہی کو یہاں عزت دیکھا جائے گا اور ان کو چھوڑ کر ان بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں
کی کچھ پروا نہ کی جائے گی۔ جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں مگر میں خدا سے
غافل اور اپنے نفس کے بند سے بچھڑنا چاہتا ہوں:

اے محمد! تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی
طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم ہو جو جیہ کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے
اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے
ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنور نہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی دلی اور
میر پرست نہ بچاؤں گا جو تمہیں بچائے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی (۱۱۲-۱۱۳-ہود آ)
اے محمد! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھائیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال
کر اس وحی سے پھر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف
سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر
ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے لیکن اگر تم ایسا کرتے تو
ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب
کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے (۳، ۴، ۵، بنی اسرائیل آ)
اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے
ایک یہ کہ اگر حق جان لینے کے بعد باطل سے تم سمجھو نہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی۔

ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر بھڑک اٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں دوسری سزا دی جاتی دوسرے یہ کہ انسان خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جھکے رہے اور کوئی سیلاب بلا آپ کو بال پر لبر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا

بے جھجک اور بے خوف دعوت حق کا اعلان | اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے

اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور مشرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کی خیر لینے کے لئے کافی ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا (۹۵-۹۶ الحج)

لوگوں کی خواہشات کے اتباع سے پرہیز | تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا

حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں لہذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے "اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ اس کی پکڑ سے تم کو کوئی بچا سکتا ہے۔

آیت اول ۳۷ میں ایک سوال کا جواب ہے اور آیت ۳۷ میں اپنی دعوت پر بلا لومنت لائتم عمل کرنے کی تاکید ہے۔

پہلی آیت میں ایک خاص بات کا جواب ہے جو اس وقت مخالفین کی طرف

سے کہی جا رہی تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر یہ صاحب واقعی وہی تعلیم لے کر آئے ہیں جو پچھلے انبیاء لائے تھے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو آخر کیا بات ہے کہ یہود و نصاریٰ جو پچھلے انبیاء کے پیرو ہیں، آگے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کرتے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان میں بعض لوگ اس پر خوش ہیں اور بعض ناراض مگر اے نبی! خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو خدا کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور میں بہر حال اسی کی پیروی کروں گا۔

رتب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے
جاہلی قوانین کی پیروی سے اجتناب | پہلے ان کی خیریتوں کی تلاشی یعنی
 شروع کی پھر اپنے بھائی کی خوجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی اس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے تباہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑنا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے (۵۱ یوسف)۔
 یعنی یہ بات حضرت یوسفؑ کی شان پیغمبری کے شایان شان نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ذاتی معاملہ میں شاہ کے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو رد کر رکھنے کیلئے انہوں نے خود جو تدبیر کی تھی اس میں یہ دخل رہ گیا تھا کہ بھائی کو روکا تو ضرور جا سکتا تھا مگر شاہ کے قانون تغزیرات سے کام لینا پڑتا اور یہ اس پیغمبر کی شان کے مطابق نہ تھا جس نے اختیارات حکومت غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی شریعت نافذ کرتے کے لئے اپنے ماتھے میں لئے تھے اگر اللہ چاہتا تو اپنے نبیؐ کو اس بدنام غلطی میں مبتلا ہو جانے دیتا۔ مگر اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ یہ دھبہ اس کے دامن پر رہ جائے۔ اس لئے اس نے براہ راست اپنی تدبیر سے یہ راہ نکال دی کہ اتفاقاً برادران یوسفؑ سے چور کی سزا پوچھ لی گئی اور انہوں نے اس کے لئے شریعت ابراہیمی کا قانون بیان کر دیا۔ یہ چیز اس لحاظ سے بالکل بر محل تھی کہ برادران یوسفؑ مصری رعایا نہ تھے۔

ایک آزاد علاقے سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ لہذا اگر وہ خود اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے آدمی کو اس شخص کی غلامی میں دینے کے لئے تیار تھے جس کا مال اس نے چرایا تھا تو پھر مصری قانونِ تعزیرات سے اس معاملہ میں مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، یہی وہ چیز ہے جس کو بعد کی دوایتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان اور اپنی علمی برتری سے تعبیر فرمایا ہے ایک بندے کے لئے اس سے بڑھ کر بلندی درجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کبھی بشری کمزوری کی بنا پر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ عجیب سے اس کو بچانے کا انتظام فرما دے۔ البتہ بلند مرتبہ صرف انہی لوگوں کو ملا کرتا ہے جو اپنی سعی و عمل سے بڑی بڑی آزمائشوں میں اپنا "محسن" ہونا ثابت کر چکے ہوتے ہیں اور اگرچہ حضرت یوسف صاحبِ علم تھے خود بہت دانشمندی کے ساتھ کام کرتے تھے مگر پھر بھی اس موقع پر ان کے علم میں ایک کسر رہ گئی اور اسے اس مہنتی نے پورا کیا جو ہر صاحبِ علم سے بالاتر ہے۔

رہی یہ بات کہ جب ملک میں "دین الملک" جاری تھا، ہی تو آخر حضرت یوسف کی انہی ذات کے لئے اس پر عمل کرنا کیوں شایانِ شان نہ تھا، تو یہ سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر غور کرنے سے بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلامی جاری نہ ہوئے تھے لوگ پرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے مگر کیا حضورؐ نے بھی پی؟ لوگ سود دیتے دیتے تھے مگر کیا آپؐ نے بھی سودی بین دین کیا؟ لوگ متعہ کرتے رہے اور جمع بین الاختین کرتے رہے مگر کیا حضورؐ نے بھی البتہ کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اسلام کا عملی مجبوریوں کی بنا پر احکام اسلامی کے اجرا میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی رخصتیں دوسروں کے لئے ہیں۔ داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

دنیا پر سنوں کی شان و شوکت سے بے نیاز | "نہم اس مناع دینا کی

طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو۔ جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو۔ (۸۸- الحجہ)

”اور دل کو ان لوگوں

کی معیت پر مطمئن کرو

قدر و قیمت کے مستحق صرف طالبین حق

جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ (۲۸- الکہف)

ابن عباس کی روایت کے مطابق قریش کے سردار بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ، عمارؓ، خطابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے عزیز لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں ان سے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے انہیں ہٹا دو تو ہم تمہاری مجلس میں آ سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو لوگ رضا الہی کی خاطر تمہارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب و روز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی معیت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم ان مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ دنیوی ٹھاٹھ یا ٹھکے رکھنے والے لوگ تمہارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بطور خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر سنانا دراصل سرداران قریش کو مقصود ہے کہ تمہاری یہ دکھاوے کی شان و شوکت، جس پر تم مہول رہے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی تم سے وہ عزیز لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے تھیک یہی معاملہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا وہ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے (ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو ذلیل لوگ ہیں وہ

بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں) اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا۔ اور جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انہیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے“ (ہود آیت ۲۴، ۲۹، ۳۱ نیز سورہ النعم آیت ۵۲ اور سورہ الحجہ آیت ۸۸)

انہوں نے جواب دیا ”کیا ہم

معائنہ کرتی مرتبہ نہیں بلکہ قبول حق کا جذبہ

تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی ردِ ذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟“ نوحؑ نے کہا ”میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، کاش تم کچھ شعور سے کام لو (۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵) تمہاری پیروی ردِ ذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے“ یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوحؑ کو دعوت حق کا یہ جواب دیا ان کی قوم کے سردار، شیوخ اور اشراف تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے۔

اس کی قوم کے کا فر سرداروں نے کہا کہ ”ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان جو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے ہو جیسے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو“ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی رہے اپنے طبقہ کے با اثر اور خوشحال لوگ تو وہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگاتے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اس سلسلے میں جو دلائل دہ حضرت نوحؑ کے خلاف پیش کرتے تھے ان میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ اگر نوحؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء، علماء، مذہبی پیشوا، معززین اور سچے دار لوگ اسے قبول کرتے لیکن ان میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے اس کے سمجھے لگے ہیں ادنیٰ طبعوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شکوکین لوگوں کے دوسرے میں شامل ہوجائیں؟

بعینہ یہی بات قریش کے کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرو یا تو غلام اور غریب لڑکے ہیں یا چند نادان بڑے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابوسفیان نے ہتل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا۔ کہ تبعنا من الضعفاء وَالْمَسَاكِينِ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے۔ (گویا ان لوگوں کا طرز فکر یہ تھا۔ کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ وہ بے عقل اور ضعیف المراتب ہیں، اس لئے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رو کر دینا سائنس کے طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزا بات ہے۔ بلکہ کفار مکہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے۔ کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا۔ وَتَالْوَالِدَيْنِ إِذَا نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْفَرِیْقَیْنِ عَظِیْمِۃ الزخرف۔ آیت ۳۱) ”وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہرؤں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔“

”کاش تم کچھ شعور سے کام لیتے“ یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے جیسا کہ اوپر ہوا ہے۔ ان کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی۔ کہ جو لوگ غریب، محنت پرست اور اپنے درجے کے لوگوں کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے نہ ان

کہ ایمان کسی نکر و بعیرت پر مبنی، نہ ان کا اعتقاد لائق اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن حضرت نوحؑ اس کے برابر میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جہانے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لائے۔ اور ایک عقیدہ قبول کرے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے۔ اس فعل کی سہ میں کیا حرکات کام کر رہے ہیں۔ اور وہ کتنی کچھ قدر قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا سب لگانا تو خدا کا کام ہے۔ میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔

وَمَا آتَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ إِنَّ آتَا لَآلَٰئِذٍ مُّبِينٌ ۝ ۱۱۳، ۱۱۵، الشعراء

”میرا یہ کام نہیں کہ جو ایمان لائیں۔ ان کو میں دھتکار دوں، میں تو بس ایک صاف صاف متنبیہ کر دینے والا ہوں۔“

یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی۔ کہ ایمان لانے والوں کا جو گردہ حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہو رہا ہے۔ یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے۔ اس لئے اپنے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا یہ کہہ رہے تھے۔ کہ اسے نوحؑ، کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو انازل اور سفہار میں شمار کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں؟ حضرت نوحؑ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں انزویہ غیر معقول طرز عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں۔ کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں۔ انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے۔ جس نے علیٰ الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے۔ کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے۔ اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے۔ اور جس طریقے کی طرف میں

رہائی کہ رہا ہوں۔ اس میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے۔ میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے۔ اور جس کا جی چاہے۔ آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ پر چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لئے میرے پاس آئیں۔ ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پر چھوڑ دو اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں ”کمین“ ہوں، تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ ”مشریف“ حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنچ فرماتے ہیں۔

ٹھیک ہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان چل رہا تھا۔ اور اسی کونگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بالآخر عمار اہل بیت جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف اور ہر کار رخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دو ٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیئے جا سکتے۔ اَمَّا مَنْ اسْتَعْنَىٰ ۖ فَانْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۚ وَمَا عَلَيْكَ اَلْاِتْرَافُ ۚ وَ اَمَّا مَنْ جَاوَزَ ۚ فَسَعَىٰ ۚ اَلْوَيْحُشَىٰ ۚ فَانْتَ عَنْهُ نَلْهُىٰ ۚ كُلًّا ۚ اِنَّمَا تَذَكَّرُ ۚ ۚ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ ۚ

آیات ۵ تا ۱۲ اے محمد! جس نے بے نیازی برقی تم اس کے پیچھے پڑتے ہو؟

۱۰ تفہیم القرآن

حالانکہ اگر وہ نہ مدد فرمے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے۔ اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے۔ تم اس سے بے رحمی برتتے ہو؟ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے۔ جس کا جی چاہے اسے قبول کرے وَلَا تَنْظُرُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْعَدَاوَةِ وَالْعَنِيَّةِ يَدْعُونَ دَجَّهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ قَدْ لَرَدَّ هُمْ فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَذَا لَنَا مِنْ اللَّهِ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ۔

(الانعام - آیت ۵۲) ۱۰

دنہ دور بھیجکوں ان لوگوں کو جو شرب رزق اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ بعض اُس کی خوشنودی کی خاطر، ان کا کوئی حساب تمہارے ذمہ نہیں اور تمہارا کوئی حساب اُن کے ذمہ نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور بھیجکوں گے۔ تو ظالموں میں شمار ہو گے ہم نے تو اس طرح اُن لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تاکہ وہ کہیں ”کیا ہمارے درمیان پس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا؟“ یاں کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا۔“

وَاخْضِصْ جَنَّاتٍ لِمَنْ أَتَبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ عَصَوْا فَقُلْ أَغْنَىٰ
بِرِّي قَوْمًا تَعْمَلُونَ ۝

— ۲۱۵ - ۲۱۶ - الشعراء ۱۰

اور ایمان لائے والوں میں سے جو تمہاری پیروی اختیار کریں۔ اُن کے ساتھ تو اُن سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے رشتہ داروں سے جو لوگ ایمان لا کر تمہاری پیروی کریں۔ ان کے ساتھ نرمی اور ملائمت اور تواضع کا رویہ اختیار کرو، اور جو تمہاری بات نہ مانیں ان سے اعلان بد اُت کر دو دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف ان رشتہ داروں سے متعلق نہ ہو۔ جنہیں متنبہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بلکہ سب کے لئے عام ہو۔ یعنی جو بھی ایمان لا کر تمہارا اتباع کرے۔ اس کے ساتھ تواضع برتو اور جو بھی تمہاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کر دو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت قریش اور اُس پاس کے اہل عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے عملاً آپ کی پیروی اختیار نہ کی تھی۔ بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مل جل کر اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ملنے والوں کو ان اہل ایمان سے الگ قرار دیا۔ جنہوں نے حضورؐ کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپ کا اتباع بھی اختیار کر لیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اسی مؤخر الذکر گروہ کے لئے تھا۔ باقی رہے۔ وہ لوگ جو حضورؐ کی فرماں برداری سے منہ موڑے ہوئے تھے۔ جن میں آپ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے۔ اور آپ کا انکار کر دینے والے بھی۔ ان کے متعلق کو ہدایت کی گئی۔ کہ اُن کے ساتھ بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود ہی بھگتو گے۔ تمہیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمہارے کسی فعل کی ذمہ داری نہیں ہے۔

مخالفت سے بے خوف ہو
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ
مَّا خُلِفَ فِيهِ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ ط (۱۱۰) اِنْعَاد
لَهُ لَقِيمِ الْقُرْآنِ ۱۱۰

موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا جس طرح اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔ جو تمہیں دی گئی ہے، اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یہ آخری فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لئے فرمایا گیا ہے۔ کہ تم اس بات کے لئے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلافات کر رہے ہیں۔ ان کا فیصلہ جلدی سے چکا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے۔ کہ فیصلہ وقت مقررہ سے پہلے نہ کیا جائے گا۔ اور یہ کہ دنیا کے لوگ فیصلہ چاہتے ہیں۔ جو جلد بازی کرتے ہیں، اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

مخالفین کی بے ہودگیوں کا مقابلہ

فَاَصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَقُ الْعَلِيمُ ۝ (الحجرات ۸۵-۸۶)

پس اے محمد! تم ان لوگوں کی بے ہودگیوں پر (شریفاً) درگزر سے کام لو یقیناً تمہارا رب خالق ہے۔ اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے۔ کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے۔ جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے۔ اور جن ہتکندوں سے یہ تمہاری ساری اصلاح ناکام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا بھی اسے علم ہے۔ ہذا تمہیں گہرا نے اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

یعنی جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں۔ اس سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے بدی کو شکست دو، اور کم نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے۔ جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی۔ جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں علانیہ و خفیہ اصلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے

مخالفین کے بارے میں روئے

”اور اے نبی! جس برے انجام کی دھمکی۔ ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھالیں۔ بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوتِ حق کو جھٹلایا ہے۔ اُن کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اور کب وہ ظہور میں آتا ہے۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے۔ اسے پوری کیسوی کے ساتھ کئے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو، یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات اُن مخالفین کو سنائی مقصود ہے۔ جو جیلنج کے انداز میں بار بار حضورؐ سے کہتے تھے۔ کہ ہماری جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ آئیں

نہیں جاتی

وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّكُمْ لَيُضِيقُ صَدْرُكُمْ
بِمَا يَقُولُونَ ۚ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۚ

داعی حق کی قوت کے ذرائع

مَنْ مِنَ الْمُجِدِّينَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۚ (الحج: ۹۴-۹۸-۹۹)

یعنی تبلیغ حق اور دعوت اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے فرمایا گیا:

”اے نبی! تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو یقیناً نماز بخش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑی چیز ہے اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔“

تلاوت قرآن نماز قائم کرو خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مگر دراصل مخاطب تمام اہل ایمان ہیں، ان پر جو ظلم و ستم اس وقت توڑے جا رہے تھے اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آ رہا تھا۔

اقامت صلوٰۃ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے سورہ العنکبوت کے کچھ جہاں رکوعوں میں صبر و ثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انہیں عملی تدبیر یہ بتائی جا رہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کر لیتی ہیں جن سے وہ باطل کی بڑی سے بڑی طغیانوں اور مخالفت کے سخت سے سخت طوفانوں کے سامنے نہ صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان کا منہ بھیجہ سکتا ہے لیکن تلاوت قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہو

سکتی ہے جبکہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو
 ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی روح میں جذب کرنا چاہتا ہے اور اس کی نماز صرف حرکات
 بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اخلاق و کردار کی
 قوت محرکہ بن جائے، نماز کے وصف مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں ذرا
 خود بیان کر رہا ہے۔ رہی تلاوت تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو
 تلاوت آدمی کے حلق سے نچاؤ کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی وہ اسے کفر کی
 طغیانوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں
 بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ یَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَلَا
 یَسْجُدُ حُنَّاجِرْهُمْ یَمْرُقُونَ مِنَ الدِّینِ مَرُوقِ السَّهْمِ —
 الرمیۃ لہ وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے
 گا وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے۔ جیسے تیرکمان سے نکل جاتا ہے (بخاری،
 مسلم، ترمذی) درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن و فکر اور اخلاق و کردار میں
 کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے، جس سے قرآن منع
 کرتا ہے وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں، اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ وسلم
 صاف فرماتے ہیں کہ مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنْ اسْتَعْلَ بِعَارِضِهِ "قرآن پر
 ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا" (ترمذی
 بروایت صہیب رومی رضی اللہ علیہ) ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے
 اور اس کی روح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلہ میں زیادہ
 ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیاء بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کبر و
 نام کی کوئی چیز بانی نہیں رہنے دیتی، کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ
 کر معلوم بھی کرتا ہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں۔ اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی
 کرتا چلا جائے اس کا معاملہ تو اس جرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب
 واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس پوزیشن کو مہکار رسالت مآب صلی

اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے کہ القرآن
 جملہ لك ادعيت، قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف ”(مسلم) یعنی اگر تو
 قرآن کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجت ہے دینا سے آخرت
 تک جہاں بھی تجھ سے باز پرس ہو تو اپنی صفائی میں قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے
 جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہوا تو نہ دنیا
 میں کوئی قاضی اسلام تجھے سزا دے سکے گا اور نہ آخرت میں داؤدِ محشر ہی کے ہاں اس
 پر تیری پکڑ ہوگی، لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو اور تو نے اسے پڑھ کر یہ معلوم کر
 لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے
 منع کرتا ہے اور پھر تو اس کے خلاف رو بہ اختیار کرے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجت
 ہے یہ تیرے خدا کی عدالت میں تیرے خلاف فوجداری کا مقدمہ اور زیادہ مضبوط کر دے
 گی، اس کے بعد نادافیت کا عذر پیش کر کے بچ جانا ہلکی سزا پانا تیرے لئے ممکن نہ رہیگا
 ”برے کاموں سے روکتی ہے، یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک اہم وصف
 ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے، مکہ کے اس ماحول
 میں جن شدید فرائضوں سے مسلمانوں کو سابقہ درپیش تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں
 مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی، اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور
 اس کے نشوونما کے لئے پہلے دو تدبیروں کی نشاندہی کی گئی، ایک تلاوت قرآن،
 دوسرے اقامت صلوٰۃ، اس کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامت صلوٰۃ وہ ذریعہ
 ہے جس سے تم لوگ ان برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے
 سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمہارے گرد و پیش اہل عرب کی اور عرب سے
 باہر کی جاہلی سوسائٹی اس وقت مبتلا ہے۔

عذر کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے
 اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اخلاقی برائیوں سے پاک
 ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں رکھتا کہ یہ بجائے خود ان لوگوں کے

لئے دینا و آخرت میں نافع ہے۔ جنہیں یہ پاکیزگی حاصل ہو۔ بلکہ اس کا لازمی
 فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کو ان سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل
 ہو جاتی ہے۔ جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیت کے اس ناپاک نظام کو جو ان برائیوں
 کی پرورش کرتا ہے برقرار رکھنے کیلئے ان پاکیزہ انسانوں کے مقابلہ میں ایڑی چوڑی چل کر زبردست گارہے
 ہوں۔ فحشا اور منکر کا اطلاق جن برائیوں پر ہوتا ہے۔ انہیں انسان کی فطرت
 بُرا جانتی ہے اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے
 ہی بگڑے ہوئے ہوں۔ اصولاً ان کو برا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ انزل قرآن کے وقت
 عرب کا معاشرہ بھی اس عام پھلے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی
 اخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے۔ بدی کے مقابلے میں نیکی
 کی قدر پہنچاتے تھے اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو برائی کو بھلائی
 سمجھنا ہو یا بھلائی کو بری نگاہ سے دیکھنا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے
 معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی مہرت و کردار میں اپنے ہم
 عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کے بغیر نہ رہ
 سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی
 اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اخلاقی وزن محسوس
 نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصبات کے کھوکھلے لغووں کی
 نیا پر ان لوگوں کا ساتھ دیتے چلے جاتے۔ جو خود اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے
 اور جاہلیت کے اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے لڑ رہے تھے، جو ان برائیوں
 کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں
 کو مادی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی
 تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جو لوگوں کے
 دل جمیت لے اور تیر و تفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دیدے

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اپنا اس کا وصف لازم ہے، یعنی یہ کہ وہ فحشا اور منکر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصف مطلوب ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا ذاتی فحشا اور منکر سے رک جائے۔ جہاں تک روکنے کا تعلق ہے۔ نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا۔ وہ تسلیم کرے گا۔ کہ برائیوں سے روکنے کے لئے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہو سکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لئے بلایا جائے۔ اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے۔ کہ تو اس دنیا میں آزاد خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے۔ جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے حتیٰ کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے۔ اور ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے۔ جب تجھے اُس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ پھر اس کی یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لئے اٹھنے کے وقت سے لے کر نماز ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرتے پڑتے ہیں۔ جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے۔ یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سراگے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام درکوع کرتے ہوئے اذکار نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ستر لیس پڑھتا رہے تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اسی کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے بے کر نماز کے امکان اور اذکار تک قانون خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ

وقت نماز ادا کرتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعہ سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے۔ اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے۔ اور اس کو عملاً اس بات کی مشق لازمی جا رہی ہے۔ کہ وہ خود اپنے جذبہ اطاعت کے زیر اثر خفیہ اور اعلانیہ ہر حال میں اس قانون کی پابندی کرے۔ جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ خواہ خارج میں اس سے پابندی رانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس طراز سے دیکھا جائے تو یہ منہ کے سوا چارہ نہیں ہے۔ کہ نماز صرف یہی نہیں آدمی کو فحشا و منکر سے روکتی ہے۔ بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریق تربیت ایسا نہیں ہے۔ جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملہ میں اس درجہ موثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رکنا ہے، یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے۔ جو اصلاح نفس کی یہ تربیت سے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی نیت رکھتا ہو۔ اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مرتب ہوں گے۔ ورنہ ظاہر ہے۔ کہ دنیا کی کوئی تدبیر اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہ ہو یا جان بوجھ کر اس کے اثر کو دفع کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشوونما ہے۔ لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ آدمی اسے جزو بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً قے کر کے ساری غذا باہر نکالنا چلا جائے۔ تو اس طرح کا کھانا اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لا کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ غذا موجب تغذیہ بدن نہیں ہے۔ کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہے اسی طرح بد عمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے۔ کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھتے کے باوجود بد عمل ہے۔ ایسے نماز کی متعلق تدریہ کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا۔ جیسے کھانا کھا کر تھے کر دینے والے کے

متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

ٹھیک یہی بات ہے۔ جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکا بر صحابہ و تابعین سے مروی ہے۔ عمران ابن حصین کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مَنْ كَرِهَ نَفْسَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ذَلَا صَلَاةَ لَهُ۔ (ابن ابی حاتم)۔ جسے اس کی نماز نے فحشا اور برے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز نہیں ہے۔ ابن عباس حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں مَنْ لَمْ تَنْهَمْ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ لَمْ يَزِدْ بِهِ مِنْ اللَّهِ إِلَّا لَعْنًا، ”جس کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے

نہ روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دور کر دیا۔“ (ابن ابی حاتم۔ طبرانی) یہی مضمون جناب جن بعریؒ نے بھی حضورؐ سے مُرسلاً روایت کیا ہے (ابن جریر۔ سیحفی) ابن مسعودؓ سے حضورؐ کا یہ ارشاد مروی ہے۔ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَا يَطِيعُ الصَّلَاةَ وَطَاعَةَ الصَّلَاةِ أَنْ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، ”اس شخص کی

کوئی نماز نہیں ہے جس نے منکر کیا۔ نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحشا و منکر سے رک جائے۔“ (ابن جریر، ابن ابی حاتم) اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، حسن بعریؒ، قتادہ اور عائشہ وغیرہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں۔ اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشا اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رک گیا ہے۔ تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (روح المعانی)

”اللہ کا ذکر اس سے بڑھیا چیز ہے۔“ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اس سے بزرگ تر ہے اس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے۔ کہ برائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھکر وہ نیکیوں پر ابھارنے والی اور سبقت لے لی انخراط پر آمادہ کرنے والی چیز بھی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجا ئے خود بہت بڑی چیز ہے خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے۔

کہ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے اُس کو یاد کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **فَاذْكُرْ دَیْنَ اُذْكُرْکُمْ** (البقرہ آیت ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا۔ تو لامحالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے۔ جسے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے۔ یا زکوٰۃ دیتا ہے۔ یا کوئی نیک کام کرتا ہے۔ تو یہ اعمال اللہ کو یاد ہی کرتا ہے۔ تبھی تو اس سے وہ عمل نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی برائی کے موافق سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے۔ تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے یاد الہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

عبادت ذریعہ قوت

وَلَا تَطْعُ مِنْهُمْ آثِمًا اُذْ كَفَرُوا رَاہ وَاذْكُرْ اَسْمَ رَبِّكَ بِكُرَّةٍ قَاصِدًا
وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ وَسَبِّحْہٗ لَیْلًا طَوِيلًا (۲۴-۲۵-۲۶ اللہ)

”اور ان میں سے کسی بد عمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز رہو، اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔“

منکر حق کی بات نہ مانو۔ یعنی ان میں سے کسی سے دُعا کہ دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور نہ کسی بد عمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تغیر کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے بر ملا حرام

اباثر کہو۔ خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے۔ کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی بہت
 لو۔ اور جو عقاید باطل ہیں۔ انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں علانیہ حق کہو۔ چاہے کفار
 تمہارا منہ بند کرنے، یا اس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کیلئے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔ تسبیح
 کرتے رہو۔ یہ ہے علاج اس شدید دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے قرآن مجید کا قاعدہ یہ ہے
 کہ جہاں بھی کفار کے مقابلہ میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے۔ وہاں اس کے معالجب اللہ
 کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ دین حق کی
 راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے۔
 وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا
 بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقاتِ تعین پر ہو تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔
قُرْآنِ کَافِرِیۃ۔ ذِکْرُ اللّٰہِ
کَثِیْرًا ۝ دَسَّحُوْهُ مَکْرَہًا ۝

(۴۱-۴۲۔ الاحزاب) ۱۰

اَصْبَلًا -

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح
 کرتے رہو۔“

اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے۔ کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے
 رسول پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔ اور دین حق کو زک پہنچانے کے لئے ذاتِ رسول کو
 ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو۔ ایسی حالت میں اہل ایمان کا کام نہ تو یہ ہے
 کہ ان بیوقوفوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں۔ اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے
 ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں۔ اور نہ یہ کہ ان کے جواب میں گالم گولنج کرنے لگیں
 بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کو اور
 زیادہ یاد کریں۔ ”اللہ کو کثرت سے یاد کرنے،“ کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت

زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیقیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کہ نہ رہ گیا ہو انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لا شعور تک میں جب یہ خیال گہرا تر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا۔ اس میں خدا کا نام مزور آئے گا۔ کھانے کا تو لیم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہو گا۔ تو الحمد للہ کہے گا۔ سوٹے کا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا، تو اللہ ہی کا نام لینے ہوئے بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، انشاء اللہ اور ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ نعمت ملے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہو گا۔ ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا۔ ہر برائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور و سرزد ہو جلت پر اس معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ عرض اٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرنے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہو گا۔ یہ چیز دراصل اسلامی زندگی کی جان ہے دوسری جتنی بھی عبادات ہیں۔ ان کے لئے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انہیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے۔ جو ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اور یہ انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادت اور تمام دینی کاموں میں بھی جان انسی چیز سے پڑتی ہے۔ کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان واطمی اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہر تو اس کی زندگی میں عبادت اور دینی کام ٹھیک اسی طرح پروان چڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اسی دائمی ذکر خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اس پودے کی سی ہے۔ جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگا یا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اسی بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث

میں یوں رائج فراتے ہیں۔

عن معاذ بن انس الجهنی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلاً سألہ ای العبادین اعظم اجدا یا رسول اللہ؟ قال اکثرہم لله تعالیٰ ذکراً، قال ای الصائین اکثرًا جراً۔ قال اکثرہم ذکرًا ثم ذکر الصلوة والزکوۃ والحج، والصدقہ کل ذالک ليقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثرہم ذکرًا سلمہ معاذ بن انس جھنسی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو ان میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سے سب سے زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو ان میں اللہ کو یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سے سب سے زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو ان میں اللہ کو یاد کرنے والا ہے۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضور نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ ”جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو“ (بخاری و مسلم)

داعی حق کا جہاد کبیر

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (القرآن ۵۲)

”اے نبی، کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کرے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کر۔“ جہاد کبیر کے تین معنی ہیں، ایک انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جانفشانی کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھے۔ دوسرے بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لاکر ڈال دے۔ تیسرے جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی ہاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیمت کی طاقتیں کام کر رہی ہوں۔ اس پر اپنی طاقت بھروسہ

دے اور جس جس پہلے سے محسن حق کی سر بلندی کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے۔ اور جان و مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی

قُلْ لَا أَشْكُم عَلَيْهٖ اجْرًا
دنیوی مفاد سے بے نیازی :- اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ

لِلْعٰلَمِیْنَ ۙ ۹۰ - الانعام ۵۰

”اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) نام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت تمام دنیا والوں کے لئے“

اتَّبِعْ مَا اُدْحِی الْیَلْتَ

منصب دعوت کی ذمہ داریاں :- مِنْ رَّيْتِ لَا اِلَهَ

اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا

اَشْرَكُوْا وَاَمَّا جَعَلْنَا عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ وَاَمَّا اَنْتَ عَلَیْهِمْ لَوْ كِیْلٌ ۙ ۹۱ - الانعام ۵۱

”اے محمد! اُس وحی کی پیروی کئے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی۔ کیونکہ اُس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ چلو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ خود ایسا بند و بست کر سکتا تھا کہ یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے۔ اور نہ تم ان پر حائل رہو“

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے۔ کو تو ای نہیں بنایا گیا تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھانے رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا۔ تو نہ تمہیں اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقہ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہذا اس نکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح مینا بنایا جائے۔ اور

جو انکھیں کھول کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الہی کا تقاضا یہی ہو کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی کریم اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود میرے سے یہ ہے ہی نہیں، مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پھر تمہارے لئے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے۔ اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر دو چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت حق کو قبول کریں۔ انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں اور جو اسے قبول نہ کریں۔ ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں۔ اور جانے پر مصر ہیں اس کی طرف جانے کے لئے انہیں چھوڑ دو۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ
مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ

اللہ کی پناہ کی دعا

النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ

وہ کہو میں پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی اس دوسرے ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، دوسرے ڈالنے والوں کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ یعنی اس شر سے کہ وہ کہیں اس کے اپنے دل میں کوئی دوسرے نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں

دوسرے ڈالنا پھرے اس کے شر سے داعی حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی حق کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ کہ اُس کی ذات کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں دوسرے ڈالے جا رہے ہوں ان سب تک خود پہنچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اُس کے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر دوسرے اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور ان کے الزامات کی جواب دہی کرے میں لگ جائے۔ اُس کے مقام سے یہ بات بھی فرد تر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اترے ہوئے ہیں۔ اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دعوت حق دینے والے کو ہدایت، نرائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے۔ اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا۔ اس کے بعد اُن سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ رب الناس، ملک الناس اور لا اناس کا کام ہے۔

تہیداً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسرے عمل شر کا نقطہ آغاز کا نقطہ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ تو پہلے اُس میں برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر مزید دوسرے انداز کی اُس بُری خواہش کو بُری نیت اور بُرے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب دوسرے کی تاثیر بڑھتی ہے۔ تو ارادہ عزم بن جاتا ہے۔ اور آخری قدم بھر مل شر ہے۔ اس لئے دوسرے انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے۔ تو دوسرے اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے۔ کہ پہلے وہ کھلے کھلے کفر و شرک، دھرمیت، یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دین اللہ میں داخل ہی ہو جائے تو وہ کسی نہ کسی بدعت کی راہ سمجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی ناکامی ہو تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ

پھوٹے پھوٹے گناہ کرنے میں تو کوئی ممانعت نہیں، تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بار عظیم انسان پر لگ جائے۔ اس سے بھی اگر آدمی بچ سکے تو بدرجہ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دین حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے اسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے لیکن اگر کوئی شخص ان تمام چالوں کو ناکام کر دے تو شیاطین جن و انس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پل پڑتی ہے۔ اس کے خلاف لوگوں کو اس کی اور بھڑکاتی ہے۔ اس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کرتی ہے۔ اسے ہر طرح بدنام اور برا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اس مرد مؤمن کو اگر غصہ دلاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے۔ اٹھ اور ان حملہ آوروں سے بھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوت حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعی حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی اگر داعی حق بچ سکے تو شیطان اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ **وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ** اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی اکھاڑٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ ہے۔ **فَقُلْ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ**

لہذا میرے پروردگار میں شیاطین کی اکھاڑٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۱۳۔ المؤمنون
اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا ۚ وَاِذَا هُمْ مُبْصُرُوْنَ
 ”جو لوگ پرہیزگار ہیں۔ ان کا حال تو یہ ہوتا ہے۔ کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انہیں چھو جائے تو وہ فوراً چونک جاتے اور پھر انہیں صحیح راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔“ (الاعراف - ۳۱) اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان سے ڈرتے ہیں اس آخری حربے سے بچ سکیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَمَا يَجْعَلُهَا**
اَلَّذُوْ حِفْظٍ عَظِيْمٍ ”یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی“
(حکم السجدہ ۱۳۵) ۱۷

اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝

وَالْيَوْمَ الْمَوْعُودَ وَشَاهِدٌ

[illegible]

اُس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی۔ کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو بڑبڑت
اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔“

ان آیات کے نزول کا مقصد کفار کو اُس ظلم و ستم کے بڑے انجام سے ک
خبردار کرنا ہے۔ جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے۔ اور اہل ایمان کو یہ تسلی دینا
ہے کہ ان کے صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اصحاب الاخدود کا قصہ سنایا گیا ہے۔ جنہوں
نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرنے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلا دیا تھا۔
اور اس قصے کے پیرائے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی
ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اصحاب الاخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے
اُسی طرح سردارانِ مکہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے والوں
کو چاہیے کہ ہر سختی سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے
یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہل ایمان اصرار کرتے ہیں۔ وہ سب پر
غالب ہے۔ زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے۔ اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے
اور دونوں گروہوں کے حال دیکھ رہا ہے۔ اس لئے یہ امر یقینی ہے۔ کہ کافروں کو نہ صرف
ان کے کفر کی سزا جہنم کی صورت میں ملے گی۔ بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی
اُن کو آگ کے چر کے دینے کی شکل میں بھی بھگتنی پڑے گی اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے
کہ ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے جنت میں جائیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

قَتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ - ”مارے گئے گڑھے والے۔“

گڑھے والوں سے مراد یہ۔ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ
بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو ان میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے
جھلنے کا تماشا دیکھا تھا۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اُن پر خدا کی لعنت پڑی
اور وہ عذابِ الہی کے مستحق ہو گئے۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔
ایک برجن والے آسمان کی۔ دوسرے روز قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے

قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو ان مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو تادریس مطلق ہستی کا ثبات کے عظیم الشان ستاروں اور سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس کی گرفت سے یہ حقیر ذلیل انسان کہاں بچ کر جاسکتا ہے۔ دوسری چیز کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں اُن لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا۔ مگر وہ دن بہر حال آنے والا ہے۔ جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اس میں ہر مظلوم کی داد دے دی اور ظالم کی پکڑ ہوگی۔ تیسری چیز کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے اُن بے بس اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا۔ اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ ان کی خبر کس طرح لی جاتی ہے گردھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدد واقعات و روایات میں بیان ہوئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم کئے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راسب سے بھی (جو غالباً پیر وان مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملتے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا۔ حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحب کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے۔ تو اس نے پہلے تو راسب کو قتل کیا پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا۔ مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے۔ تو مجمع عام میں چاہئے کہ آپ انصدام (اس لڑکے کے رب کے نام پر کہہ کر مجھے تیر مار میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ ہکا بکا اٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اُس سے

کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا۔ جس سے آپ پہنچا جاتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے میں بھر گیا اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھود دیئے۔ ان میں آگ بھڑالی۔ اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا۔ اس کو آگ میں پھکوا دیا (احمد، مسلم، نسائی، ترمذی ابن جریر، عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حمید)

دوسرا واقعہ حضرت علیؑ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہو گئے بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص پھکواتا چلا گیا۔ جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ اسی وقت سے مجوسیوں میں فحشیت سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابن جریر)

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا۔ جو اس سے انکار کرتے تھے (ابن جریر، عبد اللہ بن حمید)

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے۔ جسے ابن ہشام، طبری، ابن خلدون اور صاحب معجم البلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حمیر (مین) کا بادشاہ تہان السعد الکرب ایک سر تنہ یثرب گیا۔ جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دین یہود قبول کر لیا اور بنی قریظہ کے دو یہودی عاملوں کو اپنے ساتھ مین لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذولواس اس کا جانشین ہوا۔ اور اس نے نجران پر جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا

گڑھ تھا۔ حمد کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابن ہشام کہتا ہے۔ کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے اصل دین پر قائم تھے) نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دین یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہل نجران میں سے ایک شخص دوس ڈولڈا جسے بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رو سے اس نے قیصر روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رو سے حبش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہر حال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج آریاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذونواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

دعوت حق میں کامیابی فرما نہیں شکر کا مقام :-

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۚ
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (النصر)
”جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبی) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔“

حضرت ابن عباسؓ دیگر حضرات کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے۔ اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لئے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں۔ کہ اُس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے اور اُس سے دعا کریں کہ اس خدمتِ دین کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرمادے۔ اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک امام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلاب عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لئے وہ کام کرتے اٹھا ہو تو اس کے لئے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار

عادات، اخلاق، تمدن، تہذیب، معاشرت، میشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈال اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اٹھا کر اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوام عالم کی امام بن جائے۔ مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جتن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ پورے ماجری کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سبحانک اللہم وبحمدک استغفرک والوجوب الیٰک — (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں۔ سبحان اللہ وبحمدہ استغفر اللہ والوجوب الیٰک کثرت سے پڑھتے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیے کلمات ہیں۔ جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیئے ہیں؟ فرمایا میرے لئے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے۔ کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہے۔ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردودہ) اسی سے ملتی جلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے۔ کہ آپ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے سبحانک اللہم وبحمدک اللہم اغفر لی یہ قرآن (یعنی سورہ نعر) کی تاویل تھی جو آپ نے فرمائی تھی۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر)

تَسْبِيحٌ بِحَمْدِ رَبِّكَ — تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثناء کرنا بھی ہے۔ اور اس کا شکر ادا کرنا بھی۔ اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں بھی اس خیال کا کوئی شائبہ

نہ نہ اے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس کو سر اسرار اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اس امر کا اعتراف کرو کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اس سے پاک اور منزہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمہاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس تمہارا دل اس یقین سے لبریز رہے کہ تمہاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید و نصرت پر منحصر تھی۔ وہ اپنے جس بندے سے چاہتا۔ اپنا کام لے سکتا تھا۔ اور یہ اُس کا احسان ہے۔ کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمہارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کر لیا۔ اس کے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے جب کوئی غیر العقول واقعہ پیش آتا ہے۔ تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اس سے صادر ہو سکتا۔

وَاسْتَغْفِرُ ط اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو۔ یعنی اپنے رب سے دعا مانگو۔ کہ جو خدمت اُس نے تمہارے سپرد کی تھی۔ اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو۔ اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے یہ ہے۔ وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو۔ اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں۔ اور اس کی عبادت و بندگی بجا لانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا۔ وہ میں نے پورے کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا۔ وہ میں نہیں کر سکا۔ اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہئے کہ اس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو۔ اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول

فرماتے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو سکھایا گیا۔ جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کیا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس پر کمال غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اس پر تھا۔ وہ اس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اس سے بہت بالا و برتر ہے۔ کہ کوئی مخلوق اسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے یہ سبق دیتا ہے۔ کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمت دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان اللہ کی راہ میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں۔ کہ ”حق تو یہ ہے۔ کہ حق ادا نہ ہوا“ اس طرح جب کبھی انہیں کوئی فتح نصیب ہو، اسے اپنے کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں۔ اور اس پر فخر و عز و در میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔